قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

نومبر 2025 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ زبان شناسی

میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27،شمارہ:11،نومبر 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : شاداب شمیم،فیضان الحق،یونس انصاری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم،محکمۂ اعلیٰ تعلیم،حکومت ہند

مطبع:

سالاسار امیجنگ سسٹمس

A-97،سیکٹر 58،نوئیڈا۔201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آر کے پورم،نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور،ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی،حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

تعلیم اور ٹیکنالوجی

- مغربی گھاٹوں میں بھارت کی عظیم کہانی کا جنم — دھرمیندر پردھان 7

ادب زاویے اور جہات

- سہل ممتنع: تعریف و تفہیم — محمد نہال افروز 9
- تہذیب، ثقافت اور تمدن ایک جائزہ — محمد ذاکر 13
- زبانی قصہ گوئی کی روایت — غلام غوث 15
- تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ کا تجزیہ — محمد شاہنواز خان 17
- فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات — عبداللہ 21
- امیر خسرو کی پہیلیاں لسانی حسن اور فکری رنگ — انور ہادی جنیدی 24

شخصیات

- شکیل الرحمٰن کا تنقیدی موقف — ابرار احمد اجراوی 27
- شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے ہند ایرانی تہذیب کا بیانیہ — محمد ارشد 29

- وہاب اشرفی کی تنقیدی بصیرت — اسلم رحمانی 33

کلاسیکی شعر و ادب

- مومن خاں مومن شخصیت اور شاعری — عبدالباری 35

زبان و تعلیم

- بنیادی تعلیم — ڈی ایس گورڈن، مترجم: خلیل الرحمٰن سیفی پریمی 38
- گروکل کا تعلیمی نظام اور جدید تعلیم — آفتاب عالم 43

صحافت

- 1857 سے قبل کے فارسی اخبارات اور ان کے غیر مسلم مدیران — عامر فہد 46
- ماہنامہ نیا دور کا ادبی اور صحافتی سفر — رفیق احمد 51

تراجم اور ترجمہ نگاری

- دلت ادب اور پریم چند — مصنف: نامور سنگھ، مترجم: شیو پرکاش 54
- انور جلالپوری کے منظوم اردو تراجم ایک مطالعہ — محمد سہیل 58

سائنس

- سائنس کی لائبریری — ڈی این شرما، آر سی شرما، مترجم: غلام دستگیر 62

خصوصی گفتگو

- عرفان صدیقی کے انتقال کے بعد اردو غزل ہندوستان سے ختم ہوگئی: خالد علوی — غلام قادر 66

فلم

- شیام بینیگل اور ہندوستان کا متوازی سنیما — منتظر قائمی 69

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ 73

خبرنامہ

- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

طویل تر انسانی تاریخ کے تمام تر مراحل میں فرد اور معاشرے کی سرخروئی، ترقی اور خوشحالی کا اہم ترین وسیلہ علم رہا ہے۔ جن قوموں نے خود کو سیکھنے کا پابند بنایا اور اپنے لوگوں میں حصولِ علم کی لگن پیدا کی انھوں نے کامیابی و کامرانی کی بے شمار منزلیں سرکیں اور جن قوموں نے خود کو جہالت و نادانی کی تنگنائیوں میں محصور رکھا، وہ بہت جلد قصۂ پارینہ بن گئیں۔ آج بھی عالمی نقشے پر ہمیں جو قومیں اور ممالک نمایاں نظر آتے ہیں، ان کے نظام میں علم اور تعلیم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھ کر جدید تر علوم کے حصول کے لیے آمادہ و مستعد نظر آتے ہیں، اسی وجہ سے کامیابیاں ان کے قدم چومتی ہیں اور وہ ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہیں۔

ہندوستان جو اپنی ہزاروں سال پر مشتمل قابلِ فخر سماجی و ثقافتی خصوصیات رکھتا ہے، طویل عرصے تک علمی حوالوں سے بھی ممتاز رہا ہے اور ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب دنیا کے مختلف خطوں سے تشنگانِ علوم یہاں آکر اپنی علمی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ مگر پھر حالات دگرگوں ہوتے گئے اور بالآخر برطانوی تسلط کے طویل عرصے میں جہاں ہندوستان کو سیاسی غلامی کا سامنا رہا اور انگریزوں نے ہندوستانی وسائل کی لوٹ سے اپنے خزانے بھرے وہیں ہندوستان کی شرحِ خواندگی اور اس کی علمی ترقی بھی محدود سے محدود تر ہوتی گئی۔ جس کا نتیجہ تھا کہ 1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس وقت ہماری قومی شرحِ خواندگی محض 12 فیصد تھی اور معمارانِ ملک کے لیے جہاں ملک کے سماجی و معاشی ڈھانچے کو سنبھالنا ایک بڑا چیلنج تھا وہیں اس سے بھی بڑا چیلنج ان کے لیے اس ملک کی مسلسل گرتی ہوئی خواندگی کی شرح کو بہتر کرنے کا تھا۔ چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد (11 نومبر 1888 – 22 فروری 1958) کی شخصیت غیر معمولی علمی، ادبی و ثقافتی امتیازات کی حامل تھی اور وہ نہ صرف مشرقی علوم پر دسترس رکھتے تھے بلکہ اپنے زمانے کے جدید تر علمی رجحانات و ترقیات سے بھی واقف تھے۔ اسی وجہ سے انھیں آزاد ہندوستان کا پہلا وزیرِ تعلیم بنایا گیا اور انھوں نے اپنے دورِ وزارت میں ہندوستان کی شرحِ خواندگی کو بڑھانے کے ساتھ درجنوں نئے قومی تعلیمی، تکنیکی و ثقافتی ادارے قائم کیے جو آج بھی اپنی زریں خدمات کے ذریعے ہمارے ملک کا وقار بڑھا رہے ہیں۔

مولانا کو اس حقیقت کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ مستقبل میں سائنسی و تکنیکی علوم کی غیر معمولی اہمیت ہوگی اس لیے انھوں نے سائنسی و تکنیکی تعلیم کے رواج پر خاص توجہ دی۔ 1951 میں آئی آئی ٹی کھڑگپور کا افتتاح ان کی اسی فکرمندی کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن کے 1954 کے سالانہ اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے تکنیکی تعلیم کو قومی ترقی کی اساس قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ شعبہ نہ صرف ہندوستان کی معاشی حالت کو بہتر کرسکتا ہے بلکہ عالمی سطح پر ہندوستان کو ایک باوقار مقام عطا کرسکتا ہے۔ ان کا خواب یہ بھی تھا کہ ہندوستان کو علم اور سائنس کے شعبے میں اس قدر ترقی یافتہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک بار پھر دنیا بھر کے تشنگانِ علوم کی امیدگاہ اور ایجادات و اختراعات کا منبع بن جائے۔ آج بڑی حد تک ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ ہندوستان بے پناہ امکانات سے لیس ہے اور ہمارے نوجوان علوم و فنون کے تمام شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں، چنانچہ عالمی سطح کی کئی آئی ٹی کمپنیوں مثلاً مائیکروسافٹ، گوگل، یوٹیوب، ایڈوب، نیٹ فلیکس، کوگنیزینٹ وغیرہ کی سربراہی ہندوستانی نژاد ماہرین کر رہے ہیں اور دوسرے انسانی و ثقافتی شعبوں میں بھی ہمارے نوجوان اعلیٰ کارکردگی دکھا رہے ہیں۔ اسی طرح قومی سائنسی و تکنیکی ہنرمندی کے مظاہرے میٹروپولیٹن شہروں کے ساتھ دور دراز کے چھوٹے شہروں اور قصبات میں بھی ہو رہے ہیں۔ اس حوالے سے 'اردو دنیا' کے زیرِ نظر شمارے میں شامل ہمارے وزیرِ تعلیم شری دھرمیندر پردھان کا مضمون نہایت دلچسپ، حوصلہ بخش اور سبق آموز ہے جس میں تمل ناڈو کے ایک چھوٹے سے شہر 'تینکاسی' اور اس کے گرد و نواح میں سائنسی و تکنیکی تعلیم و اختراع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بلاشبہ ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر میں یہی عوامل نمایاں کردار ادا کریں گے۔

شمس اقبال

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

'اردو دنیا' کا اکتوبر 2025 کا شمارہ حسبِ معمول وقت پر موصول ہوا۔ اس بار کا شمارہ بھی نہایت معیاری، جامع اور دلچسپ مضامین سے مزین ہے۔ سرورق پر پٹنہ میں منعقدہ سہ روزہ سمینار کے افتتاح کی خوب صورت تصویر دیکھی تو دل خوش ہوگیا۔

اندرونی صفحات میں شامل تصویری جھلکیاں سمینار کی کامیابی، اس کے شاندار انتظام اور علمی فضا کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح بصیرت افروز، معلوماتی اور فکر انگیز ہے۔ اس میں 'وکست بھارت 2047@' کے حوالے سے جو گفتگو کی گئی ہے وہ نہ صرف گہری علمی بصیرت رکھتی ہے بلکہ ملک کے تعلیمی و سماجی مستقبل کی سمت بھی متعین کرتی ہے۔ مدیرِ محترم نے جس گہرائی اور توازن کے ساتھ موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے، وہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ محمد مرجان علی کی پیش کردہ پٹنہ سمینار کی رپورٹ مجموعی طور پر معلوماتی ہے، تاہم اگر اس میں کچھ اور محنت کی جاتی تو یہ رپورٹ اور بہترین ہوسکتی تھی۔ ندیم احمد کا مضمون 'گاندھی جی کا تعلیمی وژن' اچھا مضمون ہے۔ مضمون نگار نے گاندھی جی کی تعلیمی فکر، کردار سازی اور عملی تربیت کے اصولوں کو نہایت واضح اور دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔ مضمون پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی تعلیمات آج کے دور میں بھی اتنی ہی رہنمائی فراہم کرتی ہیں جتنی ان کے زمانے میں مؤثر تھیں۔ غزالہ شیرین کا مضمون 'بنیادی تعلیم سے ڈیجیٹل عہد تک' موجودہ تعلیمی منظرنامے کا ایک جامع و متوازن جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس میں تعلیم کے ارتقائی سفر، نصاب میں تبدیلیوں اور ڈیجیٹل انقلاب کے اثرات پر نہایت سلیقے سے روشنی ڈالی ہے۔ نوشاد حسین کا مضمون 'مصنوعی ذہانت کے دور میں بچوں کی پرورش' عصرِ حاضر کے حساس موضوع پر مبنی ہے۔ انھوں نے مصنوعی ذہانت کے مثبت و منفی اثرات کا معروضی تجزیہ کیا ہے، جو والدین، اساتذہ اور طلبہ تینوں کے لیے مفید ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم کا مضمون 'دورِ حاضر میں پریم چند مطالعہ کی نئی جہتیں' تحقیقی اور فکری گہرائی کا آئینہ دار ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم کا شمار ماہر پریم چند میں ہوتا ہے انھوں نے پریم چند کے فن و فکر کے نئے پہلوؤں کو نہایت خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے۔ اشرف لون کا مضمون 'جموں و کشمیر میں اردو ڈراما' بھی قابلِ ذکر ہے، جس میں کشمیر میں اردو ڈرامے کی تاریخ، اس کے رجحانات اور نمایاں ڈرامہ نگاروں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ محمد شہباز کا مضمون 'داراشکوہ کی فارسی شاعری' عمدہ ہے لیکن مختصر ہے، اس پر مزید گفتگو ہوسکتی تھی، ایسا لگتا ہے کہ جلد بازی میں اسے تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس گلاب سنگھ کا مضمون 'عباس حسینی' نہایت محنت، خلوص اور سنجیدگی سے لکھا گیا ہے۔ محمد وسیم رضا اور محمد عبدالقادر کے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی اچھے اور معلوماتی ہیں۔ مجموعی طور پر 'اردو دنیا' کا یہ شمارہ معیاری، متوازن اور فکری اعتبار سے بھرپور ہے۔ مدیرِ محترم اور مجلسِ ادارت یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ہر ماہ قارئین کو ایک وقیع اور دل چسپ ادبی تحفہ پیش کرتے ہیں۔

عبدالاعلیٰ: نور چک، بسفی، مدھوبنی، بہار

ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر 2025 کا شمارہ اس نوعیت سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں کشمیر چنار بک فیسٹیول کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ مزید مذکورہ فیسٹیول کی تفصیلی روداد چودہ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر شاداب شمیم کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ اردو قارئین کے لیے یہ شمارہ نہایت اہم اور معلومات افزا ہے۔ اس شمارے کی ترتیب و پیش کش مرحلہ وار منطقی ربط سے مزین ہے۔ چنار فیسٹیول کے بعد جلی حروف میں 'وکست بھارت' کے تحت 'وکست بھارت: وژن اور مشن' تحریر ہے جس کی لکھنے والی عارفہ بشریٰ ہیں اس مضمون کے ذیلی عنوانات غریبی کا خاتمہ، کسانوں کی فلاح و بہبود، خواتین کو بااختیار بنانا، تعلیم اور تعلیمی نظام، صحت عامہ اور اقتصادی تحفظ ہیں۔

مذکورہ عنوانات کے تحت عارفہ بشریٰ نے 'قومی تعلیمی نظام 2020 (NEP 2020)

پر روشنی ڈالی ہے جس کا مقصد ملک کے سبھی طبقوں تک سرکاری مراعات پہنچانا ہے۔ خاص کر قوم کی بچیوں کے لیے وزیر اعظم کا نعرہ 'بیٹی پڑھاؤ بیٹی بچاؤ' پر زور دینا ہے۔ اس تحریر کے اختتام پر 'زبان و تعلیم' کے زمرے میں دو مضامین ہیں۔ پہلے نمبر پر 'زبان کی اقسام' جسے معین الدین نے لکھا ہے۔ آئین ہند کے ذریعے فراہم کردہ شہری حقوق سے واقفیت و رسائی کے لیے تعلیم زبان کا پہلا زینہ ہے۔ قوانین کے پیچ و خم کی تفہیم کے لے لسانی نکات پر خاطر خواہ عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ معین الدین نے فہم زبان کے لیے سات سرخیاں قائم کی ہیں جن کی مدد سے عقدہ ہائے زبان کو سمجھانے کی سعی حاصل کی ہے۔ انھوں نے معاشرے میں رائج ان تمام زبانوں پر روشنی ڈالی ہے جس سے کسی نہ کسی سطح پر افہام و تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

تیسرے نمبر پر آفاق ندیم خان کا مضمون ہے جو بعنوان 'زبان اور خواندگی کی تدریس سے متعلق قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 کے اہم نکات' کی روشنی میں سرکاری ہدایات کو واضح کرتا ہے۔ جس پر این سی ای آر ٹی کی نگرانی میں وقتاً فوقتاً ورکشاپ کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے اور ہر عمر کے طلبہ کے لیے اہم نکات اخذ کیے جاتے ہیں۔ آفاق ندیم نے اس ضمن میں 23 ذیلی عنوانات کی مدد سے قومی درسیات کے خاکہ سے حاصل کردہ نکات پر روشنی ڈالی ہے جو ان ہدایات کو منور کرتی ہے جس سے زبان کی تدریس و تحصیل میں مدد ملتی ہے۔

زبان اور نکتہ ہائے زبان کی تفہیم کے بعد ادب و تہذیب کا مرحلہ آتا ہے جس سے معاشرے میں وقار و تمکنت اور تہذیب و شائستگی پیدا ہوتی ہے، معاشرے کو مہذب و شائستہ بنانے میں ہمارے ادبا و شعرا کا اہم کردار رہا ہے۔ اس ضمن میں عملہ اردو دنیا نے بعنوان 'غالب اور فریاد کی لے' مضمون ترتیب دیا ہے جسے محمد ذاکر نے تحریر کیا ہے۔ دنیا جب تک قائم ہے حاکم و محکوم کا نظام چلتا رہے گا۔ یہ نظام حکمرانوں کے مزاج کے مطابق اپنے رنگ و روش بدلتا رہے گا۔ رعایا اس کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالتی رہے گی کیونکہ کسی نہ کسی مقام پر رعایا مجبور و بے بس ہوتی ہے۔ کہیں نظام ظلم کرتا ہے تو کہیں عوام استبداد کرتے ہیں۔ جہاں نظام انصاف پسند ہوتا ہے وہاں عوام ان کے سامنے فریادی ہوتے ہیں اور انھیں انصاف ملتا ہے اور معاشرے میں امن و آشتی کا ماحول رہتا ہے۔ غالب ذی شعور و حساس شاعر گزرے ہیں جنھیں قدم قدم پر احساس کے مرحلے سے گزرنا پڑا ہے جس کو انھوں نے نہایت پر اثر اسلوب و الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ذاکر حسین نے غالب کے چند اشعار کی روشنی میں ان کی دلی کیفیات کو ظاہر کیا ہے، جن سے غالب دو چار ہوتے رہے ہیں۔

اگلا مضمون فکشن سے متعلق ہے جسے محمد محمود عالم نے بعنوان 'اردو افسانے کے بدلتے رجحانات' تحریر کیا ہے۔ محمود عالم نے افسانے کے بدلتے مزاج و منہاج کو مرحلہ وار تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور جگہ جگہ حوالے بھی درج کیے ہیں۔ اس کے بعد عرفان علی بشر 'کلاسیکی اور جدید غزل میں اقدار کی معنوی تبدیلی' مضمون سے روبرو کراتے ہیں جس میں انھوں نے جدید و قدیم غزل میں در آئی تبدیلیِ اقدار پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ عرفان علی بشر نے میر و غالب، خلیل الرحمٰن اعظمی، فراق و ناصر کاظمی نیز بعد کی ساجدہ زیدی کے اشعار سے استفادہ کیا ہے۔ ناقدین ادب کی آرا بھی نقل کی ہیں۔ ساجد ذکی کا مضمون 'امراؤ جان ادا اور مشترکہ تہذیبی عناصر' بھی ایک خاص تہذیب سے واقف کراتا ہے۔ طبقۂ اولی ملوک فارس' تہذیب غیر سے آشنائی کے لیے اچھا ترجمہ ہے جس کے مترجم و مرتب، احمد حسین عثمانی / محمد صہیب ہیں۔ اسعد فیصل فاروقی نے 'سفر سو برس کا' کے عنوان سے ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ انیس رفیع پر بالترتیب دو مضامین ہیں 'اور اس کے بعد کا اجالا' ظہیر انور نے لکھا ہے۔ دوسرا 'آہ انیس رفیع' محمد حامد علی خاں کا تحریر کردہ ہے۔ دونوں مضمون نگاروں نے انیس رفیع کی زندگی اور ان کی فکشن خدمات پر گفتگو کی ہے، سلیم انصاری نے 'راشد طراز کی شعری کائنات' پر تحریر پیش کیا ہے۔ 'محمد انصار اللہ کی ادبی خدمات' کے عنوان سے صبا نسیم نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ محمد زبیر نے بعنوان 'پروفیسر انور ظہیر انصاری کا ادبی سفر' مضمون لکھ کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بقیہ تحریر میں 'لسانیات کے فوائد' از مصنف ڈیوڈ کرسٹل / مترجم نصیر احمد خان معلومات افزا ہے۔ حکیم فخر عالم کا مضمون 'قدیم تہذیبوں میں طبی اخلاقیات کا تصور' عہد عتیق میں علاج و معالجات سے متعلق ہے۔ تصویری صحافت پر عبدالرزاق کا مضمون چشم کشا ہے۔ بعد ازاں تبصرہ و تعارف اور قومی اردو کونسل کی خبریں مع تصاویر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی: ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر 2025 کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ واحد رسالہ ہے جو وقت پر ہر ماہ کی 31-30 یا پہلی تاریخ کو بذریعہ پوسٹ مل جاتا ہے۔ پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس کے ہر شمارے میں مضامین صرف مختلف نوعیت کے ہی نہیں ہوتے بلکہ ان میں جدت ندرت، تنوع اور جدید پن پایا جاتا ہے۔

زیر نظر شمارہ کے سرورق پر چنار بک فیسٹیول کے پروگرام کی تصویر شائع کی ہے۔ مدیر شمس اقبال نے ہماری بات اداریے میں وادی کشمیر کی تاریخ، تہذیب و ثقافت ادبی و علمی ماحول کی موثر عکاسی کی ہے اور چنار کتاب میلہ کی غرض و غایت بیان کی ہے۔ چنار بک فیسٹیول کی رپورٹ شاداب شمیم نے تفصیل سے لکھی ہے یعنی 2 تا 10 اگست 2025 کی دن بہ دن ادبی علمی، تخلیقی سرگرمیوں پر پروگرام، حالات و واقعات، مشغولیات کا عمدہ احاطہ کیا ہے۔ پڑھنے والوں کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بھی اس فیسٹیول میں شریک ہیں۔ 14 صفحات پر 11 دن کے پروگرام ادبی سرگرمیوں کو بالتفصیل سلسلے وار پیش کیا ہے۔ ایسی رپورٹ ایک تاریخی دستاویز کہلائے گی۔ عارفہ بشریٰ نے 'وکست بھارت وژن اور مشن' ذیلی عنوانات کے تحت اہم موضوعات جیسے غریبی کا خاتمہ، کسانوں کی فلاح و بہبود، خواتین کو بااختیار بنانا، تعلیم اور تعلیمی نظام، صحت عامہ، اقتصادی تحفظ وغیرہ پر اچھا تبصرہ و تجزیہ کیا ہے۔ آفاق ندیم خان نے 'زبان اور خواندگی کی تدریس سے متعلق قومی درسیات کا خاکہ کے بنیادی 2022 کے اہم نکات' پر عملی مشق اور تدریس کی حکمت عملی، فنی جدید تقاضوں پر روشنی ڈالی ہے۔ محمد ذاکر حسین نے 'غالب اور فریاد کی لے' میں غالب کی شاعری میں جہاں فریاد کا ذکر آیا ہے ان اشعار کو بنیاد بنا کر اس کی تشریح و تعبیر کی ہے۔ عرفان علی بشر، ساجد ذکی فہمی، محمد صہیب کے مضامین بھی عمدہ ہیں۔ اسعد فیصل فاروقی نے ایجوکیشنل بک ہاؤس سفر 100 برس کا میں اس اشاعتی ادارے کے کردار کو مفصل پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ و اکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل: 9603018825

دھرمیندر پردھان
وزیر تعلیم، حکومت ہند

مغربی گھاٹوں میں بھارت کی عظیم کہانی کا جنم

دنیا کی تاریخ میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب مسلمات بھی دھندلا کر کمزور مفروضوں میں بدل جاتے ہیں۔ پیہم اتار چڑھاؤ حقیقت ووضاحت تک رسائی کو مشکل بنادیتا ہے اور ابہام و تذبذب کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ ایسے حوصلہ شکن اور ہمت کو پست کرنے والے حالات میں عموماً لوگ حیران وسرگرداں رہ جاتے ہیں؛ لیکن تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ انسانی محنت و اختراع پسندی نے ہمیشہ ایسے چیلنجوں کا بخوبی مقابلہ کیا ہے اوران پر قابو پایا ہے۔

چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انسانی تاریخ کے کسی بھی دوسرے عہد کے مقابلے میں زیادہ لوگ غربت اور بدحالی سے باہر نکلے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی سنگین حالات میں بھی رجائیت پسندی کے اسباب وعوامل موجود ہوتے ہیں؛ لیکن اس کے لیے ایک ایسے مقصد اور نصب العین کے تئیں پختہ وابستگی اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے جو ذاتی مفاد پرستی کے محدود دائرے سے بالاتر ہو۔

جب جامع خوشحالی کو دنیا میں ذاتی عروج کی راہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے، تو نئے راستے کھلتے ہیں، بھلے روایتی راستے بند کیوں نہ کردیے جائیں؛ کیونکہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ روایت وتقلید کی پر امن راہوں کے بجائے دشوار گزار اور غیر روایتی راستوں پر چلنا پسند کرتے ہیں۔

تینکاسی (Tenkasi)، ایک ایسا چھوٹا سا شہر ہے جو خاموشی کے ساتھ توقعات سے بھی بڑھ کر ترقی کی منزلوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ایک حالیہ دورے کے دوران میں قدیم وراثت اور جدیدیت کے درمیان ہم آہنگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ تینکاسی، تمل ناڈو میں مغربی گھاٹوں کے دامن میں واقع ایک خوبصورت شہر ہے، جس کا کاشی سے گہرا ثقافتی وروحانی تعلق ہے۔

اس کا نام، جس کا مطلب ہے 'جنوبی کاشی'، اس تعلق کی عکاسی کرتا ہے، اسی طرح اس کے قلب میں کاشی وشوناتھ کا بڑا سا مندر ہے، جہاں کاشی جیسی شکل کی ہی شیو کی مورتی ہے، جس کی مقامی لوگ پوجا کرتے ہیں۔

لیکن میری دلچسپی کی وجہ تینکاسی کا مذہبی ورثہ نہیں تھا؛ بلکہ اس شہر سے تعلق رکھنے والے سریدھر ویمبو (Sridhar Vembu) اور ان کی کمپنی 'زوہو' (Zoho) سے میں متاثر ہوا، جنھوں نے شہری ہندوستان سے ٹیکنالوجی کا ارتکاز ختم کرنے کے جرات مندانہ وژن کے حصے کے طور پر یہاں کے گاؤں متھالمپارائی (Mathalamparai) میں ایک بیس قائم کیا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ تینکاسی ایک کاروباری مرکز سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے۔ یہ قدیم وجدید کا ایک متوازن سنگم ہے۔ یہ غیر متوقع امتزاج جدید زندگی کے روایتی تصورات کو چیلنج کرتا ہے اور ہمیں بڑے شہروں کی حدود سے بالاتر ہوکر مقصدیت وترقی کے نئے تصور کی دعوت دیتا ہے۔

تینکاسی کے مضافاتی علاقے تھروائی (Tharuvai) میں 'زوہو' کا نیا کیمپس اسمارٹ ٹیکنالوجی کا حل پیش کرنے والے مرکز سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس میں 'زوہو' لرننگ اسکولز بھی ہیں، جو ہنر مندی اور باتنخواہ انٹرنشپ

کے ماڈل پر عمل کرتے ہیں، جہاں آس پاس کے دیہی علاقوں کے نوجوان طلبہ و طالبات ٹیکنالوجی کی تربیت حاصل کرتے ہیں اور سیکھنے کے ساتھ ساتھ پیسہ بھی کماتے ہیں۔

ایک اور اختراع گووندا پیری (Govindaperi) گاؤں میں 'کالیوانی کالوی مَیم اسکول' ہے، جو ویمبو کا موجودہ پتہ بھی ہے۔ یہ ایک عدیم النظیر اسکول ہے۔ یہاں قرب و جوار کے گاؤں کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں؛ لیکن جو چیز واقعی متاثر کن ہے، وہ ان کی نگرانی و تربیت کا وہ نظام ہے جس میں یہ امور شامل ہیں: مائیں وہیں رہ کر باغات کی دیکھ بھال کرتی ہیں، صحت بخش کھانا پکاتی ہیں اور اپنے بچوں کو کھلاتی ہیں، وہاں وہ تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور اچھی نشوونما بھی پاتے ہیں۔ انھیں کوئی فیس نہیں دینی پڑتی، کوئی ٹیپ ٹاپ نہیں، صرف شرافت، وقار اور بے پناہ محبت کا ماحول ہوتا ہے۔ کارووی (Karuvi) کے میکاٹرونکس اسٹارٹ اپ میں نوجوان انجینئر صنعتی برقی آلات بناتے ہیں، جو دیہی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ صرف مینوفیکچرنگ کا معاملہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ مقامی نوجوانوں کو ہنر، خود اعتمادی اور حقیقی زندگی جینے کا گر سکھاتا ہے اور ہر آلے کو غربت اور مہاجرت سے دور لے جانے والے ایک قدم میں تبدیل کرتا ہے۔

پدم شری سے نوازے جانے والے ویمبو نے بنگلورو یا سان فرانسسکو کے چمچماتے ٹاورز سے بہت دور تینکاسی میں سادہ طریقۂ کار کے ساتھ اپنے اس وژن کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دیہی ہندوستان میں بھی عالمی سطح کی اختراعات پھول پھول سکتی ہیں۔

جو چیز اسے الگ کرتی ہے وہ ٹائر II اور ٹائر III کے شہروں میں غیر استعمال شدہ ٹیلنٹ کی شناخت کرنے کی صلاحیت ہے؛ کیونکہ ان علاقوں کے نوجوانوں کو اکثر مرکزی دھارے کی آئی ٹی انڈسٹری نظر انداز کر دیتی ہے، حالانکہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں اور امکانات کے حامل ہوتے ہیں۔

ویمبو کا مشن وزیر اعظم کے 'آتم نربھر' (خودکفیل) اور 'وکست بھارت' کے وژن سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے، ایک ایسے خودکفیل، ترقی یافتہ ہندوستان کا وژن جو سودیسی اختراعات اور غیر مرتکز ترقیات سے لیس ہو۔ دیہی علاقوں میں ٹیلنٹ کو پروان چڑھا کر اور شہری مراکز سے باہر نالج ہب بنا کر ویمبو اس وژن کو حقیقت میں بدل رہے ہیں، دیہاتوں کو ان کے روشن دماغوں سے خالی کرنے کی بجائے ان میں نشاط و انتعاش پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی آرزوؤں کی حد تعمیر قوم سے بھی آگے ہے، ان کا مقصد عالمی آئی ٹی کمپنیوں کو چیلنج کرنا اور 'زوہو' کو حقیقی معنوں میں ایک ایسی مقامی ملٹی نیشنل کمپنی میں تبدیل کرنا ہے، جس کی جڑیں ہندوستانی سرزمین میں پیوست ہوں۔

غیر معمولی بازاری قدر و قیمت کی حامل کمپنیوں کے معیارات کے پیچھے روایتی انداز میں بھاگنے کی بجائے 'زوہو' ایک نایاب ہدف کو پانے کے لیے کوشاں ہے، یعنی مستحکم اور آمدنی پر مبنی ترقی جو لاکھوں لوگوں کو افلاس کے پنجے سے چھٹکارا دلائے۔ یہ نظریہ ظاہری چکا چوند کو مسترد کرنے کے جرأت مندانہ قدم اور پائیدار قومی تعمیر کے تئیں عہد بستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ تینکاسی میں قیام کے دوران تمل شاعر سبرامنیا بھارتی (Subramania Bharathiyar) کی یاد آتی ہے، جنھوں نے اپنی تخلیقات میں ایک ایسے خودکفیل بھارت کا تصور پیش کیا ہے، جہاں گاؤں بھی اپنے لوگوں کے علم و عمل کی بدولت صنعت اور سماجی وقار دونوں سطحوں پر پھل پھول رہے ہوں۔ 'زوہو' کا دیہی انقلاب اس خواب کو تعبیر بخش رہا ہے اور ٹیکنالوجی گاؤں کی ترقی کا ذریعہ بن رہی ہے، ان کی تباہی کا نہیں۔ یہاں، مغربی گھاٹوں کے سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں، سبرامنیا بھارتی کا وژن مودی کے وژن 'آتم نربھر بھارت' سے ہم آغوش ہو رہا ہے اور اس خطے میں بہ تدریج بھارت کی ایک عظیم کہانی جنم لے رہی ہے۔

(بہ شکریہ 'ٹائمز آف انڈیا'، 30 ستمبر 2025)

ترجمہ: نایاب حسن

محمد نہال افروز

سہل ممتنع: تعریف و تفہیم

سہل ممتنع ایک شعری اصطلاح ہے۔اس کے لیے انگریزی میں 'Deceptive Simplicity' کا لفظ استعمال ہوتا ہے،جس کا مطلب ہے ایسی سادگی جس کے اندر فریب چھپا ہو،یعنی ادبی اصطلاح میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی سادگی جس میں کوئی گہری بات (فلسفہ) پوشیدہ ہو۔سہل ممتنع عربی زبان کے دو الفاظ'سہل' اور 'ممتنع' کا مرکب ہے۔ 'سہل' کے معنی ''آسان،سادہ'' اور 'ممتنع' کے معنی ''جس سے روکا جائے، جو ممنوع ہو،جس کا وجود ناممکن ہو،محال، دشوار'' کے ہیں۔اس طرح دونوں الفاظ کے معنی پر غور کریں تو ایسے اشعار سہل ممتنع کہلائیں گے، جو آسان، سادہ اور سلیس ہوں،لیکن ان اشعار کو کہنا ہر کس و ناکس کے لیے ناممکن،محال اور دشوار ہو۔لہٰذا سہل ممتنع اشعار کہنے کے لیے کہنہ مشق شاعر ہونا ضروری ہے، جو آسان سے آسان تر الفاظ کا استعمال کر کے سادہ اور سلیس زبان میں عمدہ اور معنی خیز اشعار کہہ جائے۔ پروفیسر انور جمال سہل ممتنع کی تعریف بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب'ادبی اصطلاحات' میں لکھتے ہیں:

''ایسا شعر جو اس قدر آسان لفظوں میں ادا ہو جائے کہ اس کے آگے مزید سلاست کی گنجائش نہ ہو'سہل ممتنع' کہلاتا ہے... سہل ممتنع کی خاصیت رکھنے والی شاعری تاثیر کی قوت اور تادیر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سہل ممتنع شعری اظہار کا سادہ ترین پیرایہ ہے۔''1

پروفیسر انور جمال کی یہ تعریف بہت حد تک درست ہے،لیکن اسے سہل ممتنع کی مکمل یا بہترین تعریف نہیں کہا جا سکتا۔انھوں نے اس میں سہل ممتنع کی ایک خوبی تو بتائی ہے کہ شعر آسان لفظوں میں ادا کیا جائے،لیکن دوسری اور اہم خوبی کا ذکر نہیں کیا ہے کہ اس میں گہری معنویت اور فلسفیانہ موضوع کو بھی بیان کیا گیا ہو۔یہ صحیح ہے کہ سہل ممتنع کے اشعار میں تاثیر کی قوت ہوتی ہے اور ان میں تادیر زندہ رہنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے،لیکن یہ خصوصیات آسان الفاظ اور سادہ بیانی کی وجہ ہی سے نہیں بلکہ مضمون آفرینی اور خیال کی گہرائی و گیرائی اور فلسفیانہ کلام کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔واضح رہے کہ آسان الفاظ اور سلیس اسلوب میں کہا گیا ہر شعر سہل ممتنع کے زمرے میں آئے، یہ ضروری نہیں ہے۔ نیر مسعود اپنے ایک مضمون 'اردو شعریات کی چند اصطلاحیں' میں سہل ممتنع کی مختلف جہتوں سے تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(i) ہر سہل کام سہل ممتنع نہیں

(ii) آسان زبان یا نثری ترتیب وغیرہ جزئی طور پر سہل ممتنع ہیں،لیکن ان شرطوں کے ساتھ کہے ہوئے شعر سہل ممتنع کے برخلاف دقیق، پیچیدہ اور مشکل بھی ہو سکتے ہیں،یعنی

(iii) سہل ممتنع کا انحصار صرف استعمال الفاظ پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق شعر کے معنی مفہوم سے بھی ہوتا ہے۔''2

نیر مسعود نے اس اقتباس میں جن امور پر استدلالی بحث کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر سہل کام یا شعر کو سہل ممتنع کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ان کا ماننا ہے کہ آسان الفاظ اور سلیس زبان میں کہے گئے اشعار جزوی طور پر سہل ممتنع ہو سکتے ہیں،لیکن کلی طور پر سہل ممتنع وہی ہوگا جس میں ان شرائط کے ساتھ کوئی دقیق یا پیچیدہ مسئلہ بیان کیا گیا ہو یا پھر کوئی فلسفیانہ موضوع پیش کیا گیا ہو۔سہل ممتنع کا تعلق صرف الفاظ کے استعمال ہی سے نہیں ہوتا بلکہ شعر کے معنی و مفہوم سے بھی ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ولی دکنی کا یہ شعر ملاحظہ ہو

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

ولی دکنی کا یہ شعر بلاشبہ آسان الفاظ اور سلیس زبان میں ہے،لیکن اس میں کوئی گہری بات نہیں کہی گئی ہے یا کوئی فلسفہ بیان نہیں ہوا ہے۔یہ شعر دیکھنے میں جتنا آسان نظر آ رہا ہے،اس کا معنی اور مطلب بھی اتنا ہی آسان ہے۔ولی نے اس شعر میں یہ کہا ہے کہ خوب رو یعنی خوب صورت لوگ یہ کمال کرتے ہیں کہ اپنے عاشق کو ایک ہی نظر میں اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔اس کے علاوہ اس شعر میں کوئی اور خاص بات یا کوئی فلسفہ پوشیدہ نہیں ہے بلکہ بالکل سامنے کی بات ہے۔

اسی طرح امیر مینائی کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو

شعر جو انتخاب ہوتے ہیں
وہی رہ جاتے ہیں زبانوں پر

امیر مینائی کے اس شعر میں بھی کوئی گہری بات یا فلسفیانہ پہلو نہیں ہے،جس کی بنیاد پر اس شعر کو سہل ممتنع کے زمرے میں رکھا جا سکے۔اس شعر میں صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ ہمارے اپنے ہزاروں اشعار میں سے وہی شعر زبان پر رہ جاتے ہیں،جس کا ہم انتخاب کر لیتے ہیں، باقی سب معدوم ہو جاتے ہیں یا پھر بھول جاتے ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس شعر میں سادگی اپنی انتہا پر ہے اور اس شعر میں جن الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بے حد آسان ہیں۔محض اس وجہ سے اس شعر کو سہل ممتنع کا شعر نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں سادگی ہے۔سہل ممتنع کے لیے یہ ضروری ہے کہ بظاہر سادہ دکھنے والا شعر حقیقت میں اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہو،جس کی تشریح کی جائے تو اس کی معنوی پرتیں کھلتی جائیں یعنی معانی کے کئی جہان کھل جائیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ

ایسا عمدہ شعر کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ حسرت موہانی اس تعلق سے اپنی کتاب 'محاسن سخن' میں رقم طراز ہیں:

''سہل ممتنع سادگی وحسن بیان کی اس صنف کا نام ہے، جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لیے آسان ہے، مگر جب خود کوشش کر کے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔''3

حسرت موہانی کی یہ تعریف سہل ممتنع کے لیے بالکل مناسب اور واضح ہے۔ حسرت موہانی کا یہ کہنا کہ ''ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لیے آسان ہے، مگر جب خود کوشش کر کے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔'' یہی اس فن کی اصل تعریف ہے، جو اس کو فلسفے کے قریب لے جاتا ہے اور یہی سہل ممتنع کی فلاسفی بھی ہے۔

حسرت موہانی کے اس تعریف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سہل ممتنع کا شعر ایسا ہونا چاہیے، جس میں سادے الفاظ استعمال ہوئے ہوں، شعر کہنے کا انداز آسان ہو، شعر پڑھ کر قاری ایسا محسوس کرے کہ وہ ایک شعر نہیں بلکہ ایک بات ہے، جو سیدھے دل میں اتر گئی، لیکن اس کے مضمون یا خیال میں اتنی وسعت وبلندی اور اتنی گہرائی وگیرائی ہونی چاہیے کہ وہ کسی فلسفے سے کم نہ ہو، جس شعر میں یہ تمام خصوصیات موجود ہوں گی، وہی سہل ممتنع کا اچھا شعر ہوگا۔ احمد رضا خان بریلوی کا یہ سادہ، سلیس، خوبصورت، عمدہ اور معنی خیز شعر ملاحظہ ہو، جو سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

سب سے اولیٰ و اعلیٰ ہمارا نبی   اپنے مولا کا پیارا ہمارا نبی

اس شعر میں احمد رضا خان بریلوی نے اس کائنات کی سب سے برگزیدہ شخصیت حضرت محمدؐ کی شان اقدس کو نہایت ہی آسان اور سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے، جب کہ آپؐ کی شخصیت وسیرت کو بیان کرنے اور ان کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے ایک دو ورق نہیں بلکہ پوری ایک سفینہ بھی کم پڑ جائے گی، لیکن احمد رضا خان بریلوی نے اس شعر میں آپؐ کی شان مبارک کو بہت ہی خوبصورتی اور عمدگی سے بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہ شعر سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

صنعت سہل ممتنع کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس کے اشعار بظاہر اتنے سادہ اور آسان ہوتے ہیں کہ اس کو اگر ہم نثر میں تبدیل کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں، یعنی سہل ممتنع کے اشعار نثر کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ سہل ممتنع کے لیے ایک اور بات کہی جاتی ہے کہ ایسے اشعار چھوٹی بحر میں ہی کہے جا سکتے ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ سہل ممتنع کے لیے بحر کی کوئی قید نہیں ہے، یہ کسی بھی بحر میں کہے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اشعار میں سہل ممتنع کی دوسری تمام خصوصیات موجود ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ چھوٹی بحر میں کہے گئے سہل ممتنع کے اشعار زیادہ مشہور ومقبول ہیں، لیکن اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ بڑی بحر میں سہل ممتنع کے اشعار نہیں کہے جا سکتے۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اسی طرح مرزا غالب کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

سہل ممتنع ایک مشکل فن ہے۔ اس میں مشکل سے مشکل ترین بات کو آسان ترین زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں ابتدائی دور ہی سے اس کی مثالیں ملنے لگتی ہیں۔ اس میں کلاسیکی اور نو کلاسیکی شعرا سے لے کر ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے عہد کے شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس فن میں ولی دکنی، میر تقی میر، خواجہ میر درد، مرزا غالب، اکبر الہ آبادی، غلام ہمدانی مصحفی، امام بخش ناسخ، مولانا حالی، داغ دہلوی، مومن خاں مومن، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، ناصر کاظمی، شہریار، عرفان صدیقی، جون ایلیا، پروین شاکر وغیرہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے باجود اردو شاعری میں سہل ممتنع کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے، اس کی وجہ اس کی مشکل پسندی ہے۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر یہاں پر صرف اہم کلاسیکی اور نو کلاسیکی شعرا کے کلام سے سہل ممتنع کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

ولی دکنی کا شمار اردو شاعری کے ابتدائی دور کے شعرا میں ہوتا ہے بلکہ انھیں اردو شاعری کا بابا آدم بھی کہا جاتا ہے۔ ولی نے اردو غزل کو ایک نئی پہچان اور بلندی عطا کی ہے۔ ان کی غزلوں میں خیال کی ندرت اور بیان کی لطافت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق ومحبت کے ساتھ ساتھ تصوف اور معرفت کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں انسانی زندگی کے حقائق پر مبنی اشعار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سہل ممتنع میں کہے گئے ان کے اشعار کسی فلسفے سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ولی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جس میں وہ بہت آسان الفاظ اور سلیس زبان میں بہت ہی گہری باتیں کہہ گئے ہیں۔

1. مفلسی سب بہار کھوتی ہے   مرد کا اعتبار کھوتی ہے
2. شغل بہتر ہے عشق بازی کا   کیا حقیقی و کیا مجازی کا
3. جسے عشق کا تیر کاری لگے   اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

مذکورہ بالا اشعار الفاظ اور اسلوب کی سطح پر بالکل آسان لگ رہے ہیں، لیکن یہ اشعار اتنے آسان ہیں نہیں، جتنے کہ بظاہر نظر آرہے ہیں۔ ان میں زندگی کے بڑے بڑے فلسفے پوشیدہ ہیں۔

پہلے شعر میں ولی نے مفلسی اور تنگ دستی کو انسانی زندگی کے لیے عذاب تصور کیا ہے۔ مفلسی اور ناداری انسانی زندگی کی خوبصورتی اور خوشیوں کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔ مفلس اور غریب انسان کی زندگی اس کی غربت کی وجہ سے ہر طرح کی خوشی اور بہار سے محروم ہو جاتی ہے۔ مفلسی ایسی چیز ہے، جس کی وجہ سے ایک مرد سماج ہی میں نہیں بلکہ اپنی بیوی بچوں کے درمیان بھی اپنا اعتبار کھو دیتا ہے۔ اس شعر میں مرد کا اعتبار کھونے سے شاعر کی مراد ہے کہ مفلسی یا غریبی ایک ایسی بری چیز ہے، جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ بھی نہیں کرتے۔ یہ انسانی زندگی کی ناقابل یقین حقیقت ہے۔

دوسرا شعر عشق حقیقی پر مبنی ہے۔ اس میں صوفیانہ خیالات کا اظہار ہے۔ شغل یعنی کہ کام۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کے نزدیک عشق ومحبت کا کام دراصل سب سے اچھا کام ہے، چاہے وہ حقیقی عشق یعنی اللہ سے محبت ہو یا پھر عشق مجازی یعنی اللہ کے بندوں سے ہو، دونوں ہی اللہ تک پہنچنے کے راستے ہیں۔ اس لیے انسان کو صرف اور صرف محبت کرنا چاہیے، نفرت نہیں۔

تیسرے شعر کا موضوع بھی عشق ومحبت ہی ہے۔ اس شعر میں شاعر نے بالکل واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ انسان کی کامیابی کا راز عشق میں پوشیدہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کسی

کو بھی عشق کا کام مشکل یا بھاری لگتا ہے اسے زندگی بھی بھاری لگے گی۔ عشق کا فلسفہ یہ ہے کہ جسے عشق کرنا مشکل لگتا ہے اسے زندگی گزارنا بھی دشوار لگے گا۔ کیوں کہ جسے ایک بار عشق ہو جاتا ہے پھر وہ مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا بہت آسانی سے کر لیتا ہے۔

میر تقی میر کو اردو غزل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو ایک نئی بلندی عطا کی ہے۔ میر کی غزلوں میں ہمیں فکر کی گہرائی ملتی ہے، ہمہ گیریت اور سوز و گداز بھی ملتا ہے۔ میر تقی میر جیسے استاد سخن شاعر نے سہل ممتنع کی شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور انتہائی شاندار اشعار کہے ہیں۔ میر کی سہل ممتنع کی شاعری میں کئی معنوی پرتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان کے اشعار کی تشریح کرنے پر معانی کی کئی جہتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اس حوالے سے میر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

1. نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
2. ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
3. آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک، انتہا ہے یہ

مذکورہ بالا پہلے شعر میں میر تقی میر نے تشبیہ سے کام لیا ہے۔ بظاہر بالکل آسان سا دکھنے والا یہ شعر اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے محبوب کے ہونٹ کی تعریف کی ہے، جس میں شاعر نے اپنے محبوب کے ہونٹ کی تشبیہ گلاب کی ایک پنکھڑی سے دی ہے۔ چونکہ ہونٹ کا رنگ گلابی ہوتا ہے، نرم ہوتا ہے، نازک ہوتا ہے، اس کی بناوٹ چاند کے مانند ہوتی ہے، یہ تمام خوبیاں گلاب کی ایک پنکھڑی میں بھی ہوتی ہیں، اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کے ہونٹ اتنے خوبصورت ہیں کہ ان کا بیان مشکل ہے۔ ان کی خوبیاں گنانے سے بہتر ہے کہ انھیں گلاب کی پنکھڑی سے مشابہت دے دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

دوسرے شعر میں شاعر نے عشق و محبت کی بات کی ہے۔ عشق کا راستہ بڑا پر خطر ہوتا ہے۔ اس پر چلنے والے کو قدم قدم پر صبر آزما امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی بھی ملتی ہے اور کبھی کبھی جان سے ہاتھ بھی دھونے پڑتے ہیں۔ جان دینے کے لیے بڑی ہمت ہونی چاہیے۔ لہٰذا جو کوئی اس میدان میں قدم رکھے اس کے دل میں خوف اور ڈر بالکل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا حوصلہ بلند ہونا چاہیے۔ عشق کی ابتدا ہی میں اگر عاشق انجام سے ڈر جائے تو عشق کی انتہا تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس طرح میر کہتے ہیں کہ یہ تو ابھی عشق کی ابتدا ہے ابھی سے کیوں روتا ہے، آگے تو بڑھ، تب پتہ چلے گا کہ تجھے کامیابی ملے گی یا پھر تو رسوا ہوگا۔

مرزا غالب نے بھی سہل ممتنع میں انتہائی باکمال شاعری کی ہے۔ ان کے اشعار میں سادگی کے پردے میں پیچیدگی اور گہرائی چھپی ہوئی ہے۔ وہ ایسے عام فہم الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں جو ہر قاری کو فوری طور پر سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی معنوی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو فکر و نظر کی نئی جہات کھلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے سہل ممتنع اشعار ایک طرف زبان کی سلاست اور روانی کا مظہر ہیں اور دوسری طرف فکر و خیال کی بلندی اور معنویت کی گہرائی کو بھی آشکار کرتے ہیں۔

تیسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ عشق کی ابتدا میں ہم آگ کی مانند تھے۔ مطلب یہ کہ ہمارے اندر ایک جوش تھا، ولولہ تھا یعنی ہم بہت خوش تھے، لیکن جب عشق کا بھوت سر سے اترا تو پتہ چلا کہ یہ خوشی نہیں بلکہ فریب تھا، دھوکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ عشق کی انتہا خاک پر ہوتی ہے، لہٰذا اب میں خاک کے مانند ہوں یعنی عشق میں تباہ و برباد ہو چکا ہوں۔

میر تقی میر کے اس طرح کے بہت سے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں، جو دیکھنے میں بہت آسان معلوم پڑتے ہیں، لیکن ان کے اندر بہت ہی باریک اور گہری باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، جن کی تشریح کرنے پر معانی کے کئی جہاں کھلتے چلے جاتے ہیں۔

میر درد کا شمار صوفی شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری دونوں تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں دنیاوی (عارضی) زندگی سے زیادہ ابدی اور دائمی زندگی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ ان کے اشعار میں سلاست اور غضب کی روانی ہوتی ہے، جو ان کے کلام کو نہایت ہی پر اثر بناتا ہے۔ میر درد اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی نہایت ہی سہل، شستہ اور عام فہم زبان میں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے اشعار سہل ممتنع کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ وہ دقیق سے دقیق بات کو بہت ہی آسان الفاظ اور سلیس زبان میں کہہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

1. زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے! — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
2. جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
3. دشمنی نے سنا نہ ہووے گا — جو ہمیں دوستی نے دکھلایا

میر درد کے یہ اشعار بظاہر تو آسان معلوم پڑ رہے ہیں، لیکن ان میں بہت باریک اور گہری باتیں پوشیدہ ہیں۔ ان اشعار میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کا رنگ اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ان میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ ان اشعار کے مطالعے کے بعد قاری کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ حقیقی محبوب کے لیے کہے گئے اشعار ہیں یا پھر مجازی محبوب کے لیے۔ چونکہ میر درد کا محبوب معبودِ الٰہی ہے اس لیے کائنات کے ہر ذرے میں انھیں اللہ تعالیٰ ہی نظر آتا ہے۔ گویا دنیا کا ہر ذرہ ان کے نزدیک دیتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ''جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا، تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا۔''

مرزا غالب نے بھی سہل ممتنع میں انتہائی باکمال شاعری کی ہے۔ ان کے اشعار میں سادگی کے پردے میں پیچیدگی اور گہرائی چھپی ہوئی ہے۔ وہ ایسے عام فہم الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں جو ہر قاری کو فوری طور پر سمجھ میں آ جاتے ہیں، لیکن جب ان کی معنوی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو فکر و نظر کی نئی جہات کھلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے سہل ممتنع اشعار ایک طرف زبان کی سلاست اور روانی کا مظہر ہیں اور دوسری طرف فکر و خیال کی بلندی اور معنویت کی گہرائی کو بھی آشکار کرتے ہیں۔

مرزا غالب سہل ممتنع کی تعریف بیان کرتے ہوئے خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں:

''پیر و مرشد۔ سہل ممتنع میں کسرۂ توصیفی ہے۔ سہل موصوف اور ممتنع صفت۔ اگرچہ بحسب ضرورت وزن کسرۂ لام مشبع ہو سکتا ہے، لیکن مخل فصاحت ہے۔ اور لام موقوف تو خود سراسر قباحت ہے۔ سہل ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع کمال حسن ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے... سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر

میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔"4

غالب کی اس تعریف کی روشنی میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

1. موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
2. آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
3. ہم کو ان سے وفا کی ہے امید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
4. جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سہل ممتنع ایک مشکل فن ضرور ہے، لیکن ہر عہد اور مزاج کے شعرا نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلاسیکی شعرا کے بعد نو کلاسیکی شعرا کے یہاں بھی سہل ممتنع کے اشعار بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ اس عہد میں امام بخش ناسخ، اکبرالہ آبادی، داغ دہلوی، امیر مینائی، مومن خاں مومن وغیرہ کے یہاں اس فن میں باکمال اشعار دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان شعرا کے سہل ممتنع میں کہے گئے چند اشعار ملاحظہ کریں، جو کسی نہ کسی فلسفے پر مبنی ہیں۔

1. زندگی زندہ دلی کا ہے نام   مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں
2. وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں   ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں
3. بھولتا ہی نہیں وہ دل سے اسے   ہم نے اسے سو سو طرح بھلا دیکھا

(امام بخش ناسخ)

1. آئی ہو گی کسی کو ہجر میں موت   مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی
2. آہ جو دل سے نکالی جائے گی   کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
3. عشق نازک مزاج ہے بے حد   عقل کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا

(اکبرالہ آبادی)

1. گر مرض ہو دوا کرے کوئی   مرنے والے کا کیا کرے کوئی
2. اس نہیں کا کوئی علاج نہیں   روز کہتے ہیں آپ آج نہیں
3. وہ زمانہ نظر نہیں آتا   کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا

(داغ دہلوی)

1. تم کو آتا ہے پیار پر غصہ   مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے
2. ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے   زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
3. ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا   میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے

(امیر مینائی)

صنعت سہلِ ممتنع میں امام بخش ناسخ، اکبرالہ آبادی، داغ دہلوی، امیر مینائی، مومن خاں مومن وغیرہ نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق گرانقدر کارنامے انجام دیے، لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت مومن کو حاصل ہے۔ مومن کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے سہل ممتنع کو محض سادہ اور رواں بیان تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے جذباتِ عشق، نازک خیالی اور لطیف احساسات کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کیا کہ ان کے اشعار پڑھنے والے کے دل میں براہِ راست اتر جاتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ صرف سادگی اور روانی ہے بلکہ شوخی، نزاکت اور دلکشی بھی ہے جو سہل ممتنع کو ایک نیا حسن عطا کرتی ہے۔

مومن کے کلام میں زبان کی سلاست اور محاوروں کی روانی اس طرح جلوہ گر ہوتی ہے کہ ہر مصرع عام بول چال کا سا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کے اندر چھپی معنوی گہرائی اور جذباتی شدت قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار آج بھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں اور سہل ممتنع کے اعلیٰ نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ مومن نے سہل ممتنع کو محض ایک فنی صنعت کے طور پر نہیں برتا بلکہ اسے اردو غزل کے جذبہ آفریں اور دلنشیں اسلوب میں ڈھال کر اپنی شاعری کا نمایاں حوالہ بنا دیا۔ مثال کے طور پر مومن کے چند اشعار دیکھیے۔

1. تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
2. تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے   ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
3. نہ کرو اب نباہ کی باتیں   تم کو اے مہربان دیکھ لیا

مولانا حالی کے یہاں بھی سہل ممتنع کے اشعار بڑی تعداد میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ زندگی کے مسائل اور عشق کے فلسفے کو نہایت ہی سادگی اور عام فہم انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یعنی کہ حالی انتہائی سنجیدہ اور پیچیدہ مسائل کو بھی سہل ممتنع بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حالی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

1. رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ   زندگی موت ہے حیات نہیں
2. وہ امید کیا جس کی ہو انتہا   وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سہلِ ممتنع اردو شاعری کی ایک اہم اور نازک صنعت ہے جس میں شاعر اپنی بات نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ ہر قاری کو بالکل آسان اور روزمرّہ کی زبان لگے، لیکن حقیقت میں وہی سادگی گہری سوچ، وسیع معنویت اور بلند فنی کمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس اسلوب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ شعر پڑھنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ ایسا کہنا تو بہت سہل ہے، مگر جب کہنے کی کوشش کرے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل نہایت دشوار مرحلہ ہے، اسی لیے اسے 'آسان مگر مشکل' کہا گیا ہے۔ سہلِ ممتنع کی نمایاں خصوصیات میں سادہ الفاظ کا استعمال، قدرتی روانی، تصنع اور بناوٹ سے پاک اسلوب اور معانی کی تہہ داری شامل ہے۔ اردو کے بڑے شعرا خصوصاً ولی دکنی، میر تقی میر، میر درد، مرزا غالب، ناسخ، مومن، اکبرالہ آبادی، امیر مینائی، مولانا حالی وغیرہ نے اس شعری صنعت کو کمال تک پہنچایا اور ایسے اشعار تخلیق کیے، جو بظاہر بالکل سہل ہیں مگر معنوی طور پر نہایت دقیق اور گہرے ہیں۔ اس طرح سہلِ ممتنع اردو شاعری کا وہ انداز ہے، جس میں سادگی اور عظمتِ فن ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جمالیاتی اثر پیدا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1. پرفیسر انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2012، ص 121-122
2. بحوالہ: نیر مسعود، اصطلاحات نقد و ادب، ڈاکٹر عمر فاروق، بھارت آفسیٹ، دہلی، 2004، ص 172
3. حسرت موہانی، محاسن سخن، رئیس المطابع، کانپور، 1934، ص 61
4. مرزا محمد عسکری (مرتب)، ادبی خطوط غالب، نظامی پریس، لکھنؤ، 1929، ص 58-59

■

Dr. Md Nehal Afroz
Assistant Professor (Urdu)
Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad, India- Pin : 500032
Mob : 9032815440
Email: nehalmd6788@gmail.com

محمد ذاکر

تہذیب، ثقافت اور تمدن: ایک جائزہ

تہذیب، ثقافت اور تمدن: بظاہر یہ تین الفاظ ہیں لیکن بباطن ہر لفظ ایک جہان معنی اور وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ ان الفاظ کی آفاقیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ابتدائے آفرینش سے تاریخ انسانی کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ صرف تین الفاظ نہیں بلکہ تین ایسی اصطلاحات ہیں جن کا تعلق ارتقائے ذہن اور ارتفاع سماج سے ہے۔

اس تمہید کے بعد ثقافت، تہذیب اور تمدن کے لغوی اور اصطلاحی معنی کے حوالے سے بات ہوگی۔ ان کے تعبیری وتوضیحی واضح کیے جائیں گے۔

تہذیب، ثقافت اور تمدن تینوں عربی الاصل الفاظ ہیں، اپنی لفظی ساخت کے فرق کے باوجود کئی طرح کے جزوی اشتراک سے مملو اور باہم مترادف بھی ہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ تہذیب کو ثقافت اور تمدن کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ معروف عربی لغت نگار ابن منظور لکھتے ہیں:

"التهذيب: هذب الشيء يهذبه أي نقاه وأخلصه وقيل أصلحه، وأصل التهذيب تنقية الحنظل من شحمه و معالجة حبه حتى تذهب مرارته ويطيب لأكله۔"

(ابن منظور، جمال الدین محمد مکرم، لسان العرب، دار صادر بیروت، ص63)

''تہذیب کے معنی ہیں کسی چیز کو صاف کرنا، خالص کرنا اور اصلاح کرنا اور اصلاً اس کے معنی ہیں حنظل (اندراین) کا گودا صاف کرنا اور اس میں ایسی تدبیر اختیار کرنا کہ اس کی ترشی دور ہوجائے اور وہ کھانے لائق ہوجائے۔''

قاموس المحیط میں بھی ملتے جلتے معنی ہیں:

"هذب يهذب تهذيباً قطعه، نقاه وأخلصه وقيل أصلحه۔" (مجدالدین فیروزآبادی، القاموس المحیط)

''تہذیب کے معنی کسی چیز میں تراش خراش کرنا، صاف کرنا، خالص کرنا اور اصلاح کرنا ہیں۔''

ان تعریفات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب کے اصل معنی کسی چیز کو صاف کرنا، سنوارنا، شائستگی و آراستگی کے ہیں۔ جب کہ اصطلاح میں یہ وہ معاشرتی طرز عمل ہے، جس کی پشت پر شعوری یا لاشعوری طور پر کوئی مذہبی عقیدہ کارفرما ہو۔

فارسی لغت میں اس کے معنی ''پاکیزہ کردن، خالص کردن، اصلاح کردن، شعر نثر از عیب و نقص، پاک کردن اخلاق'' کے رقم ہیں۔

فیروز اللغات اردو میں اس کے لغوی معنی شائستگی وخوش اخلاقی کے دیے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔

علوم وآداب، فنون لطیفہ، اطوار ومعاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست تہذیب کے نتائج اور مظہر ہیں۔ جب کہ اس کے عناصر ترکیبی میں دنیوی زندگی کا تصور، زندگی کا نصب العین، عقائد وافکار، تربیت افراد کے اصول اور نظام اجتماع کے اصول وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کسی قوم کی زندگی کے خدوخال، رسم و رواج، اصول و ضوابط اور طرز بود وباش کو بھی تہذیب کہا جاتا ہے۔

جہاں تک تہذیب کے انگریزی مترادف کا مسئلہ ہے تو پہلے اس لفظ کے لیے Civilization کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اب کلچر استعمال ہوتا ہے۔

گویا تہذیب معاشرتی، معاشی اور سیاسی اداروں کا مجموعہ ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس کی کئی صورتیں ہیں۔ اس کی گوناگوں خصوصیات مختلف معاشرتی سطحوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً تعمیر، تحریر وغیرہ۔

اردو زبان میں لفظ تہذیب کا استعمال بالعموم علم اخلاق سے جڑا ہوا ہے۔ جب کہ انگریزی میں اس کے معنی سماجیات سے قائم کیے گئے ہیں۔ انگریزی حوالے سے یہ لفظ اردو میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے استعمال کیا۔ سبط حسن کے مطابق سرسید احمد خان غالباً پہلے دانشور ہیں جنھوں نے تہذیب کا وہ مفہوم پیش کیا جو انیسویں صدی میں مغرب میں رائج تھا۔ اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے اجرا کے اغراض ومقاصد کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

''اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلائزیشن (Civilization) یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے (سویلائزڈ) مہذب قو میں ان کو دیکھتی ہیں۔ وہ دفع ہووے اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلائیں... سویلائزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے۔''

(سبط حسن پاکستان میں تہذیب کا ارتقاص، 15)

تہذیب کے تین اہم عناصر یا عوامل ہیں۔ ایک عنصر کو مذہب/عقیدہ/نظریہ کہیے۔ دوسرے کو جغرافیہ اور ماحول قرار دیجیے جس میں آب وہوا، نسل، ملک، سیاست اور پیداواری نظام سب شامل ہیں اور تیسرے کو تاریخ، روایت، حافظہ، زمانہ سمجھئے۔ بقول پروفیسر عتیق اللہ:

''تہذیب نام ہے اس اجتماعی معاشرت کا جس میں باہمی ذہنی اور مادی شمولیتیں اور شرکتیں انسانی احتیاجات اور ضروریات کی تشکیل وتکمیل کرتی نیز انسانی اقداری ماحول کی پرورش کرتی ہیں۔ اشتراک عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والے وہ سارے داخلی اور خارجی ممتاز اسالیب ایک دوسرے کو مربوط کرنے والے اور ایک دوسرے کی فلاح اور آسودگی کے لیے متلازم وبنیادی اصول اور رویے جن سے نہ صرف یہ کہ آئندہ نسلیں اخذ وکسب کرتی ہیں بلکہ کبھی سہولت کبھی ضرورت کبھی شائستگی کی خاطر ان میں ترمیم وتوسیع بھی کرتی ہیں۔ تہذیب ان کے اجتماعی اور تخصیصی افکار وتصورات، اقدار و ترجیحات، عقائد ورسومات کی عکس ریزی ہوتی ہے۔''

(اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب وثقافت، پروفیسر عتیق اللہ، ص59)

ثقافت: یہ لفظ سننے میں بہت آسان اور عام فہم لگتا ہے، لیکن جب ہم اس لفظ کی معنوی جہات وا کرتے ہیں تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس لفظ کی حیات انسانی میں کیا اہمیت وافادیت ہے۔ یہ لفظ لغوی معنی میں بھی استعمال ہوتا اور اصطلاحی میں بھی۔

بنیادی طور پر ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ث، ق، ف ہے۔ عربی لغت میں اس کے معنی نیزہ

کوسیدھا کرنا، مہذب بنانا اور تربیت دینا ہیں۔

فارسی لغت میں ثقافت کے معنی زیرک و چست و چالاک شدن، استاد شدن، زیرکی، چالاکی، استادی، حذاقت، بہرہ وری از علم و ادب و تربیت کے ہیں۔

جب کہ اردو لغت کے مطابق 'ثقافت' کسی قوم یا گروہ انسانی کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر ہیں جو اس کے مذہب، نظام اخلاق، علم و ادب اور فنون میں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ اردو زبان میں عقلمند، نیک، تہذیب یافتہ یا کلچرڈ ہونے کے پس منظر میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہندی یا سنسکرت میں ثقافت کے لیے 'سنسکرتی' کا لفظ مستعمل ہے۔ جس کے معنی اصلاح شدہ یا صاف کیا ہوا ہیں۔ سنسکرتی کا تعلق سنسکار (عادات و اطوار) سے ہے۔ جس کے معنی اصلاح کرنا، بہتر بنانا اور تزکیہ کرنا وغیرہ کے ہیں۔

انگریزی زبان میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کلچر یا Cultivation زراعت یا زمین کی قدرتی حیثیت کو بہتر بنانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا زمین ہی کی مانند انسان کے رجحان اور فطری صلاحیتوں اور قوتوں کو بہتر بنانے کا دوسرا نام کلچر ہے یا پھر انسان کے فطری رجحان اور مزاج کی اصلاح کو ہم ثقافت کہہ سکتے ہیں۔

عصر حاضر میں ثقافت کی اصطلاح ترک کر کے کلچر پر اتفاق کر لیا گیا ہے۔ ثقافت دل و دماغ اور ذوق و فکر کی تربیت و تہذیب کا نام ہے۔ اب اس لفظ کا اطلاق تعلیم یافتہ آدمی کے عملی اکتساب و تحصیل پر ہونے لگا ہے۔ شائستہ اخلاق، خوش ذوقی، فنی استعداد اور کسب علوم جو تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں کلچر کہلائیں گے۔ زمانہ قدیم میں یہ لفظ یعنی کلچر کبھی سویلائزیشن کا ہم معنی ہوا کبھی الگ۔ پہلے یہ فرد کی داخلی تہذیب تک محدود تھا، لیکن پھر اس کا اطلاق مادی ضرورتوں اور اشیا پر بھی ہونے لگا۔ اب اس میں کسی قوم یا سماج کی ساری مجلسی زندگی شامل ہے، جس میں رسم و رواج، فنون لطیفہ و مفیدہ حالت امن و جنگ میں نجی اور مجلسی زندگی، مذہب، علوم اور آرٹ وغیرہ سبھی شامل ہوں۔ اس لفظ کی ایک عام تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ کلچر عبارت ہے انفرادی و مجلسی رویے سے جس میں افکار، علم عقائد اور اصولی اقدار وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلچر ایک طرح کا رویہ ہے جو خارجی بھی ہے اور داخلی بھی۔ اس رویے کے مظاہر کلچر کہلاتے ہیں۔ یہ سمٹ کر محض ذوقی مجلسی رویے ہو سکتے ہیں اور پھیل کر کسی قوم کی پوری تہذیبی تمدنی زندگی پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ مادی اور غیر مادی۔ مادی ثقافت میں اوزار، ہتھیار، آلات، مصنوعات، فرنیچر اور بے شمار دوسری ایجادات کو بھی اس میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب ٹیکنالوجی بھی اس میں آجاتی ہے۔

یعنی کلچر ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کسی سماج کی مشترکہ مساعی و تعاون سے ابھرتا ہے۔ انسان زندہ رہنے کے لیے بنیادی ضرورتوں کھانا، کپڑا، مکان، اور حفاظت جسمانی وغیرہ کے لیے کوشش کرتا ہے۔ اسی کوشش کے نتیجے میں پیشے، نظام تعلیم، نظام قانون اور نظام اخلاق وجود میں آتے ہیں جن میں مذہب بھی شامل ہے۔ اس سے ترقی کر کے اداروں کی تشکیل ہوئی ہے۔

ان تمام تشریحات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ثقافت یا کلچر عصر حاضر میں ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ اس میں اخلاق، عادات، معاشرت، سیاست، مصنوعات، قانون قاعدے، ملبوسات، خوراک، فنون لطیفہ، فلسفہ، مذہب اور سائنس سب شامل ہیں۔ یہ وقت کے ساتھ اپنی صورت اور معیار بدلتا ہے اور ہر تبدیلی کو اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

'تمدن' بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ م، د، ن ہے۔ اس کے معنی عربی لغت میں اقامت کرنا، آباد کرنا، شائستہ و مہذب ہونا اور آسودہ حال ہونا ہیں اور فارسی لغت کے مطابق اس کے معنی ''شہر نشین شدن، خوی شہری گزیدن و با خلاق مردم شہر آشنا شدن، زندگانی اجتماعی، ہم کاری مردم با یکدیگر در امور زندگانی و فراہم ساختن اسباب ترقی و آسائش خود'' کے ہیں۔ اردو لغت میں اس کے معنی شہری بود و باش۔ (کسی ایک جگہ) مل جل کر رہنا، سماجی زندگی، شائستگی، تہذیب، رہنے سہنے کے خاص طریقے، طرز معاشرت وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔

تمدن درحقیقت ضروریات زندگی کی پیداوار ہے۔ انسان کی زندگی کی ضروریات اور اعلیٰ تصور حیات تمدن کو جنم دیتے ہیں۔ تہذیب کا تعلق نظریات سے ہے اور تمدن کا اعمال سے۔ بقول سبط حسن:

''ہر تہذیب اپنے تمدن کی پیش رو ہوتی ہے۔ تہذیب کے لیے شہر، دیہات صحرا اور کوہستان کی کوئی قید نہیں کیونکہ تہذیب معاشرے کی اجتماعی تخلیقات اور اقدار کا نچوڑ ہوتی ہے۔ اسی لیے تہذیب کے آثار ہر معاشرے میں ملتے ہیں، لیکن تمدن کی بنیادی شرط شہری زندگی ہے۔ تمدن اسی وقت وجود میں آتا ہے جب شہر آباد ہوتے ہیں۔ دراصل تمدن نام ہی ان رشتوں کی تنظیم کا ہے جو شہری زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے۔''

(تہذیب کا ارتقا: سبط حسن، ص13)

'تہذیب' سے مراد وہ نظریات و تصورات ہیں، جن کے مطابق کوئی جماعت یا قوم زندگی گزارے اور اس کو اپنا مقصد بنائے۔ یہ نظریات اتنے واضح ہوتے ہیں کہ ہر قوم دوسری قوم سے مختلف و منفرد نظر آتی ہے چنانچہ تہذیب کسی بھی قوم کی پہچان اور شناخت ہوتی ہے۔ ہمارا ہر عمل اور فعل کسی نظریے اور عقیدے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلے ہم کسی کام کے بارے میں سوچتے ہیں اور پھر اس سوچ کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس طرح 'تہذیب' خیالات، تصورات اور افکار و عقائد کا نام ہے اور ان تصورات و افکار کے تحت جو افعال و اعمال ظاہر ہوتے ہیں اور جو سیرت و کردار تشکیل پاتے ہیں، انھیں 'تمدن' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب و تمدن لازم و ملزوم ہیں۔ تمدن اصل میں کسی خاص تہذیب کی عملی صورت کا نام ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب اصل ہے اور تمدن اس سے پھوٹنے والی شاخ ہے۔

تمدن ان مادی اشیا کے مجموعے کو بھی کہتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ یا تو بہتر ہوتی رہتی ہیں یا مکمل طور پر حالات کے تقاضوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ جیسا کہ مواصلات اور دیگر مادی سہولیات۔ لہٰذا زندگی گزارنے کے مختلف نظریے رکھنے کے باوجود دو مختلف تہذیب کے لوگوں میں تمدنی حوالے سے یکسانیت ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگرچہ ذات، ملکیت، مذہب اور رائے کی آزادی کے نظریے پر کھڑی سرمایہ دارانہ تہذیب اور زندگی کے تمام معاملات میں خالص مذہبی بنیادوں پر استوار تہذیب کے درمیان تصادم جاری ہے۔ لیکن تمدن کے معاملے میں بہت سے چیزیں دونوں میں مشترک بھی ہیں جیسا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ، کیونکہ یہ اشیا کسی بھی لحاظ سے ایک مخصوص تہذیب سے وابستہ نہیں ہوتیں اور نہ ہی کسی طرح سے عقائد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

■

Dr. Mohd Zakir
Dept. of Urdu
Kashmir University
Kashmir- 190006 (J&K)
Mob.:8825021138
drmohdzakir88@gmail.com

غلام غوث

زبانی قصہ گوئی کی روایت

قصہ گوئی کو انگریزی میں Story Telling کہتے ہیں جب کہ قصہ عربی زبان کا لفظ ہے،اور اس کے لغت میں متعدد معانی ملتے ہیں۔ جیسے کہانی، داستان، بیان، تذکرہ، سرگزشت وغیرہ۔عربی قاعدے کے مطابق یہ لفظ واحد ہے،اس کی جمع قصص ہے،قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو'احسن القصص' کہا گیا ہے۔

قصہ سننا اور سنانا انسانوں کی جبلت میں داخل ہے۔ بنی نوع انسان کی محبوب اور مرغوب عادتوں میں قصہ گوئی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔قصہ کہانی بنی آدم کی ہمیشہ سے خاص دلچسپیوں کا سامان رہی ہے۔قدیم زمانے سے حیرت انگیز واقعات اور طلسماتی بیانات سننے سنانے کا سماج میں رواج رہا ہے۔اس حوالے سے پروفیسر گیان چندجین نے لکھا ہے کہ:

''حکمائے یونان کے بقول قصہ گوئی شاعری اور موسیقی کی دیویوں سے بھی قدیم تر ہے۔ابتدائی نقوش موجود نہیں ہیں۔کون جانے ہماری بعض لوک کہانیاں دس پانچ ہزار سال پیشتر وجود میں آچکی ہوں۔''

(گیان چند جین،اردو کی نثری داستانیں،اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ،1987،ص23)

درج بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ قصہ گوئی کی روایت بڑی قدیم اور پرانی ہے،انسانی سماج کو اس صنف سے ہمیشہ واسطہ رہا ہے۔قصہ کہانی کی وادی میں سیر کرنا پہلے سے انسانوں کی سرشت میں شامل تھا۔پتھروں کے زمانے سے لے کر دور جدید تک کہانیاں الگ الگ شکلوں میں تبدیل ہوکر آج بھی زندہ ہیں۔

انسانی حیات کے ابتدائی ایام میں بچوں کی ذہنی ترقی کے لیے گھر کی دادی، نانی قصے سنا سنا کر اپنی اولاد میں انسانی تہذیب وثقافت کی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد فراہم کیا کرتی تھیں۔

بچوں کی جسمانی ترقی اور بالیدگی میں غذا اور خوراک کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں،ان کی اچھی صحت اچھی غذا پہ موقوف ہوتی ہے،جسمانی نشو ونما میں اچھے کھان پان کا بڑا دخل ہے،لیکن بچوں کے ذہنی ارتقا اور ان کی دماغی ترقی میں کہانیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ قصے کہانیاں بچے کی ذہنی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ بچہ جب نئے واقعے اور حیرت انگیز قصے سنتا ہے تو اس میں تجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے،اس کا ذہن کہانیوں کے دامن سے گہرائی کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے، قصے، کہانیاں،اور حکایات کے سننے سے بچے کا دماغ ترقی اور تربیت پاتا ہے،بچوں کی دماغی ترقی اور تربیت میں کہانیوں کا اہم حصہ ہوتا ہے۔

اردو کے مشہور نقاد کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

''بچہ کی جسمانی نشو ونما کے ساتھ اس کے دماغ کی بھی ترقی اور تربیت ہوتی ہے۔اور اس ترقی اور تربیت میں کہانیاں ایک اہم حصہ لیتی ہیں۔انسان کی دماغی ترقی کا ایک بڑا سبب تجسس کا مادہ ہے جو مختلف صورتوں میں کارفرما ہے۔جو ہمیں نئی نئی چیزوں کی تلاش وجستجو پر آمادہ کرتا ہے،جو ہمیں ہر شے کی ماہیت اور اس کے اسباب پر سے پردہ اٹھانے پر مجبور کرتا ہے اور جو ہمیں دماغی کاہلی سے بچاتا ہے اور کسی چیز کو بھی بغیر جانچ پڑتال کے قبول کرنے نہیں دیتا۔بچپن میں بھی اس مادہ کی ترقی نہایت اہم ہے اور یہ ترقی کہانیوں کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔''

(کلیم الدین احمد،اردو زبان اور فن داستان گوئی،(ناشر) دائرہ ادب، بانکی پور، پٹنہ،ص 2)

قصہ کہانی کا تعلق دنیا کی ہر زبان سے ہے، کہانیوں کا رواج ہر عہد میں ہونے کے سبب بھی زبانوں میں اس کا چلن ہے،دنیا کہانیوں سے بھری ہوئی ہے اور تقریباً سبھی کہانیوں میں جزئی طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے۔زبانیں الگ الگ ضرور ہیں۔تاہم قصوں کے موضوعات اور کرداروں میں کافی حد تک مماثلت ہوتی ہے۔

اردو زبان وادب کی سبھی اصناف میں داستان گوئی کو تقدم اور اولیت حاصل ہے۔داستان میں کہانی ہوتی ہے،حیرت انگیز واقعات کا بیان ہوتا ہے، دیو، جن پری کے علاوہ، بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں، امیروں، وزیروں اور رعایا کا تذکرہ ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان کے اہم ترین کارناموں میں داستان گوئی کا بھی شمار ہوتا ہے۔داستان کا موضوع بہت وسیع اور کشادہ ہوتا ہے، اسی لیے اس میں مکمل آزادی اور کشادہ قلبی سے دلچسپ قصے بیان کیے جاتے ہیں۔

داستانوں میں ایک ہی عہد کی سرگرمیاں نہیں ہوتیں بلکہ زمانے بھر کی ہلچل، تحرک، عمل پیہم، مہم جوئی کا سلسلہ ملتا ہے۔ایک ہی فرد یا چند افراد کے بجائے اس میں پورے سماج کے لوگ اور ان کے کارنامے دکھائی دیتے ہیں۔

اردو ادب میں داستان نویسی کی روایت کا آغاز دکن کے ملا وجہی کی داستان 'سب رس' سے ہوتا ہے۔ ملا وجہی نے اس داستان کو 1635 میں لکھا،انھوں نے اس کتاب کو قطب شاہی سلطنت کے فرماں رواں عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر تصنیف کیا تھا۔ان کی تصنیف کو

نثری داستانوں میں اولیت حاصل ہے۔وجہی کی یہ مایہ ناز تصنیف دکنی ادب میں نہ صرف مقبولیت اور شہرت کے بام عروج پہ فائز ہے بلکہ اسے اردو ادب میں انفراد وامتیاز کا رتبہ حاصل ہے۔

شمالی ہند کی داستانوں میں نو طرز مرصع، کربل کتھا، عجائب القصص، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، باغ و بہار،فسانہ عجائب،سروش سخن وغیرہ معروف و مشہور ہیں۔فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابوں میں جو شہرت میر امن دہلوی کی کتاب 'باغ و بہار' کو نصیب ہوئی، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔باغ و بہار کی سادگی اور سلاست نے اسے مقبول عام وخاص بنادیا۔اس میں بیان کیے گئے قصے دلچسپ اور متاثر کن ہیں۔ باغ و بہار میں دہلوی تہذیب وثقافت کی عکاسی ہے۔ایک زمانے میں اس میں بیان کیے گئے قصے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو زبانی سنایا کرتے تھے۔زبانی قصہ گوئی کی روایت اس طرح مستحکم ہوتی گئی۔

داستان گو دہلی، اودھ، رامپور، بنارس اور حیدر آباد کے درباروں سے وابستہ ہوا کرتے اور درباروں میں قصہ سنا کر داد و تحسین وصول کرتے تھے۔اس کے علاوہ شہروں کی مجلسوں میں قصہ گو قصے سناتے تھے۔ قصے کتاب دیکھ کر بھی سنائے جاتے تھے اور زبانی سنانے کے طریقے بھی رائج تھے۔ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہونے سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں زبانی قصہ گوئی کی روایت کا پتہ چلتا ہے۔

سید وقار عظیم کہتے ہیں کہ:

"اردو کے اکثر اچھے داستان گو غدر سے پہلے اور غدر کے بعد تک دہلی،اودھ،رامپور،بنارس،اور حیدر آباد کے درباروں اور امیروں سے وابستہ رہے ہیں اور اس تعلق اور وابستگی کے علاوہ شہروں میں داستان گوئی کی مجلسوں کا عام دستور رہا ہے جس میں داستان گو کبھی لکھ کر اور کبھی زبانی داستانیں سنا کر سننے والوں کو مسرور کرتے اور ان سے ہدیۂ تحسین وخراج عقیدت ومحبت وصول کرتے رہے ہیں۔دلی اور لکھنؤ نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانے میں بھی اپنی مجلسوں کو اس شمع سے روشن رکھا ہے۔"

(سید وقار عظیم،ہماری داستانیں،ادارۂ فروغ اردو،لاہور،ص 18-17)

قصے،کہانیاں اور داستانوں کے سننے وسنانے کا اہتمام ادبی اور علمی گھرانوں میں ہمیشہ رہا ہے،ادبی شخصیات اس حوالے سے اپنے بچوں کی تربیت بھی

داستان گو دهلی، اوده، رامپور، بنارس اور حیدر آباد کے درباروں سے وابسته هواکرتے اور درباروں میں قصه سناکر داد و تحسین وصول کرتے تھے۔اس کے علاوہ شہروں کی مجلسوں میں قصه گو قصے سناتے تھے۔ قصے کتاب دیکھ کر بھی سنائے جاتے تھے اور زبانی سنانے کے طریقے بھی رائج تھے۔ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہونے سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں زبانی قصه گوئی کی روایت کا پته چلتا ہے۔

کرتی تھیں۔گھر کے ادبی ماحول میں جب بچے قصے کہانیاں سنتے ہیں تو ان کے اندر علمی اور فکری بلندیاں پیدا ہونے لگتی ہیں،بچپن میں ہی بچے لکھنے، پڑھنے کے شوقین ہوجاتے ہیں اور تہذیب وتمدن کے وارث بن جاتے ہیں۔عصر حاضر کے ممتاز اردو فکشن نگار مشرف عالم ذوقی اپنے گھر کا ماحول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گرمیوں کے موسم میں چھت پر چار پائیاں بچھی ہوتی تھیں۔آسمان پر تاروں کی بارات .....ٹھنڈی ٹھنڈی بہتی ہوئی ہوا۔ہم بھائی بہن چھت پر ابا کے آنے کا انتظار کرتے۔ابا کے آتے ہی ہم انھیں گھیر کر بیٹھ جاتے۔ ابا پھر داستانوں کو لے کر بیٹھ جاتے۔ داستان امیر حمزہ،طلسم ہوشربا .....عمرو عیار کی ٹوپی۔ یہاں تک کہ سراج انور کے ناول بھی ابا سے ہی سننے کا موقع ملا۔مطالعہ میں نے بعد میں کیا۔ابا کے سنانے کا مخصوص انداز تھا۔وہ ڈرامائی انداز میں ان کہانیوں کو بیان کیا کرتے تھے۔آج محفلوں میں کہانیاں سناتے ہوئے میں کسی حد تک اس انداز کو اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر وہ ہنر کہاں سے لاؤں جو ابا مرحوم کے پاس تھا"

(مشرف عالم ذوقی،سلسلۂ روز وشب،2013،ص 77-176)

'قصہ گوئی کا فن بنیادی طور پر سننے سنانے کا ہی فن ہے،عہد ماضی میں سنانے کا اہتمام ہوتا تھا اور لوگ حلقہ بنا کر قصوں سے لطف اندوز ہوا کرتے۔

بہت بعد میں انھیں تحریری جامہ پہنایا گیا۔ موجودہ عہد میں قصہ گوئی کا سلسلہ کمزور ہوتا جارہا ہے،بلکہ مفقود ہورہا ہے۔داستانوں کا حسین سرمایہ صرف تحریری شکل میں ملتا ہے۔زبانی قصہ بیان کرنے کا رواج تقریباً ختم ہوچکا ہے۔جب سے جدید ٹیکنالوجی کا دور آیا ہے،اس نے سماجی،سیاسی اور تہذیبی حیات وروایات میں بڑی تبدیلیاں پیدا کردی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی نے قصہ گوئی کے چلن کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ایک دور تھا جب گھروں میں نانی،دادی بچوں کی تربیت کی خاطر اخلاقی اور تربیتی کہانیاں سنایا کرتی تھیں اور ان کہانیوں میں سچائی، بہادری، نیک نیتی اور خوش اخلاقی کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہوتے اور بچے ان کہانیوں کے ذریعے اپنی زندگیوں میں تبدیلیاں لانے میں کوشاں رہتے تھے۔لیکن اب حالات یکسر بدل چکے ہیں،موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعہ لوگوں کے گھر کا ماحول بھی مکمل طور پر بدل چکا ہے۔ لوگوں کی مصروفیات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ کسی کو فرصت ہی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو کہانیاں سنائیں۔

حالانکہ زبانی کہانیاں سنانے کی سماج ومعاشرہ میں بڑی اہمیت ہے۔بگڑے ہوئے معاشرے کے سدھار میں اخلاقی اور ادبی قصے،کہانیاں آج بھی اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔

کہانیاں آج بھی ہمارے بچوں پر مثبت اور موثر اثر ڈال سکتی ہیں،ان کی سماجی اہمیت سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا،قصوں سے ہم اپنی زبان سے متعلق بھی سیکھ سکتے ہیں۔اچھے اخلاق،بہترین افکار،مثبت نظریات اور ہمدرد انسان بننے کی راہیں اچھی کہانیوں اور قصوں سے ہموار ہوسکتی ہیں۔

بچوں میں مطالعہ کا شوق دلانے کی خاطر بھی انھیں ترغیبی کہانیاں سنانی چاہئیں۔کیونکہ بچپن میں بچوں کے کان جس طرح کی باتیں سنتے ہیں ان سے وہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔اخلاقی کہانی بچوں کے اخلاق پہ مثبت اثر ڈالتی ہے اور اس طرح کی کہانی سن کر بچہ ایک اچھا شہری بننے کا خواب بچپن میں ہی دیکھنے لگتا ہے اور اس کے اندر برائیوں سے لڑنے کی قوت ہوتی ہے۔ اس لیے زبانی قصہ گوئی اور کہانی سنانے کی عوامی اولیت کا احیا کیا جانا ضروری ہے۔

■

Gulam Gaus
Research Scholar , Department of Urdu
Indira Gandhi National Open University
New Delhi - 110068
Mob.: 7289849371
ggbarabanki@gmail.com

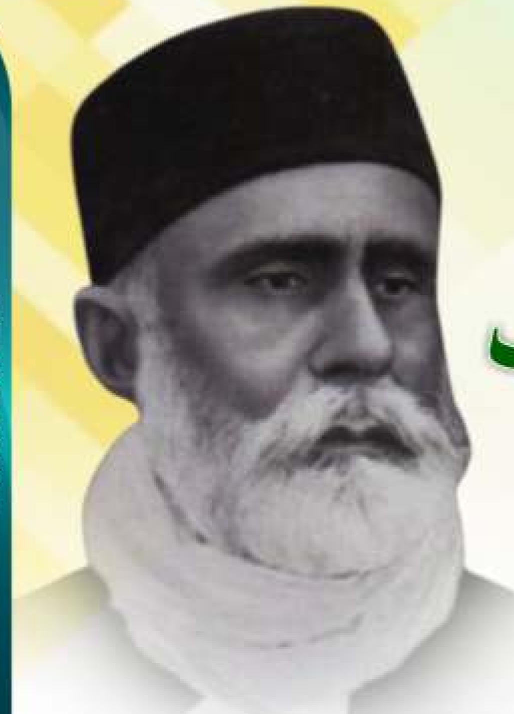

محمد شاہنواز خان

تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ کا تجزیہ

('مقدمہ شعرو شاعری' کی روشنی میں)

الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'مقدمہ شعرو شاعری' میں پہلی بار تنقیدی نظریات پر باضابطہ اور بالتفصیل گفتگو کی، جس میں انھوں نے شعر کی ضرورت، ماہیت، تاثیر، عظمت، شرائط، خوبیوں اور شعر کے دیگر امور پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی۔ میرے اس مضمون میں تنقید کے تین اہم اور لازمی شرائط تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالی کے نزدیک یہ تینوں شرطیں شاعر کو غیر شاعر سے ممتاز کرتی ہیں۔

تخیل

حالی نے تخیل کو شاعری کی سب سے اہم اور بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ تخیل کا ملکہ وہبی اور عطائی ہے، اسے مشق سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ملکہ جس قدر اعلی درجے کا ہوگا، شاعری بھی اسی مرتبے کی ہوگی۔ یہ ملکہ اگر کسی شخص میں نہ ہو، تو وہ حقیقی شاعر نہیں بن سکتا۔ حالی کے نزدیک تخیل ایسی طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی و استقبال کو زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ نیز تخیل کے زور پر شاعر جنت، دوزخ اور حشرونشر کو ایسے اسلوب میں بیان کرتا ہے، گویا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یا فرضی اور معدوم چیزوں کو جیسے جن، پری، عنقا اور آب حیواں کو ایسے صفات سے متصف کر کے بیان کرتا ہے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

حالی تخیل کی ماہیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربے یا مشاہدے کے ذریعے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے، یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایے میں جلوہ گر کرتی ہے، جو معمولی پیرایے سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔[1]

حالی نے تخیل کی جو تشریح کی ہے، وہ کولرج کے خیالات سے ماخوذ ہے، لیکن حالی کی تشریح میں 'تخیل' اور 'فینسی' آپس میں گڈ مڈ ہوگئے۔ حالی سے تخیل کی تشریح میں سہو، دراصل کولرج کے نظریات سے براہ راست واقفیت نہ ہونے کے سبب ہوا ہے۔ فینسی ''وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے'' اور تخیل ''وہ قوت ہے جو معلومات کے ذخیرے کو مکرر ترتیب دے کر اسے ایک نئی صورت بخشتی ہے'' حالی دونوں کے مابین فرق کو واضح نہ کر سکے، یا جن انگریزی دانوں نے انھیں کولرج کے نظریات سے متعارف کرایا تھا۔ وہ خود سمجھ نہ سکے، یا حالی کو سمجھا نہ سکے۔

> **تخیل کا ملکہ وہبی اور عطائی ہے، اسے مشق سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ملکہ جس قدر اعلی درجے کا ہوگا، شاعری بھی اسی مرتبے کی ہوگی۔ یہ ملکہ اگرکسی شخص میں نہ ہو، تو وہ حقیقی شاعر نہیں بن سکتا۔ حالی کے نزدیک تخیل ایسی طاقت ہے جوشاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی و استقبال کو زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے۔**

فینسی اور تخیل کے حوالے سے ممتاز حسین لکھتے ہیں:

اس میں شبہ نہیں کہ فینسی بڑے بڑے کرتب دکھاتی ہے۔ حشر ونشر کا نقشہ کھینچ دیتی ہے۔ قبر کی کہانی سناتی ہے۔ طرح طرح کے غل غپاڑے کرتی ہے۔ لفظوں کے رشتے سے شعر کہتی ہے۔ لب و لہجے کی نقل اتارتی ہے۔ ضلع جگت پھبتی کستی ہے۔ لیکن جس حد تک کہ وہ قوتِ ارادہ اور شعور سے متعین نہیں ہوتی ہے، وہ قوتِ ارادہ اور شعور پر اثر انداز بھی نہیں ہوسکتی ہے۔ فینسی کی شاعری تفریح طبع کا بہت سا سامان مہیا کرتی ہے۔ لیکن اخلاق کو بدلنے یا مذاقِ سخن کے بدلنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی ہے۔ یہ کام تخیلی شاعری انجام دیتی ہے، جو شعور اور ارادے سے متعین ہوکر شعور اور ارادے پر اثر انداز ہوتی ہے۔[2]

فینسی اور تخیل کے مابین فرق کو نہ سمجھنے کے سبب ہی حالی سے تخیل کی تشریح میں تضاد ہوا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ تخیل ایسی قوت ہے جو جن، پری، عنقا اور آب حیوان جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو بھی ایسے طریقے سے پیش کر دیتی ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ تخیل وہ قوت ہے جو تجربے اور مشاہدے کے ذریعے ذہن

میں پہلے سے موجود چیزوں کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے۔ جب کہ جن، پری، عنقا اور آب حیواں اور انسانی تجربہ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ پھر کیسے دونوں ایک ہی چیز کی تعریف پر صادق آئیں گی؟ اسی طرح حالی تخیل کی تعریف میں ایک دوسرے جزو کا اضافہ کرتے ہیں۔ تخیل ایسی قوت ہے جو تجربے اور مشاہدے کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے، جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ اس سے حالی نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ تخیل کی کارفرمائی خیال اور لفظ دونوں میں ہوتی ہے۔ یہاں پر حالی تخیل کے تحت فینسی کے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ فینسی جہاں خیالات میں تصرف کرتی ہے، وہیں الفاظ میں بھی تصرف کرتی ہے۔ جس سے بیان میں ایک قسم کا نرالا اور انوکھا پن پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ نرالا پن لفظوں کے لغوی اور استعاراتی معنوں میں الٹ پھیر سے ہوتا ہے۔

حالی نے تخیل کے ذیل میں جن مثالوں کو پیش کیا ہے۔ اس کے پیش نظر ان کے نقادوں کا ماننا ہے کہ حالی سے تخیل اور فینسی میں جس طرح فرق نہ کرنے کے باعث سہو ہوا ہے اسی طرح ان سے حقیقی اور جھوٹی وٹ (Wit) کے مابین تفریق نہ کرنے کے باعث ایسا خلط مبحث ہوا ہے، جس سے شعر کے صحیح مذاق کی ترسیل نہیں ہو سکی ہے:

''حالی اگر ایک طرف تخیل اور فینسی کے فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے اور تخیل کا نام لے کر فینسی کی تعرف کرتے رہے، اسی طرح وہ سچی وٹ اور جھوٹی وٹ کے فرق کو بھی نہ سمجھ سکے۔ اور جھوٹی وٹ کے شعری طریق استدراک کی تشریح علمی طریقہ استدراک کے انداز میں کی۔ اس سے ایسا خلط مبحث ان کے مقالے میں پیدا ہوا کہ اس کی وجہ سے صحیح مذاق شعر کی رہنمائی نہ ہو سکی۔[3]

جھوٹی وٹ اور حقیقی وٹ کی بحث ایڈیسن (Addison) کے یہاں ملتی ہے۔ جس کے نظریات و خیالات سے سرسید اور ان کے رفقائے کار متاثر تھے۔ اس نے جھوٹی وٹ اور حقیقی وٹ کی تشریح اپنی تحریروں میں کی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جھوٹی وٹ الفاظ کے صوری اور شکلی مشابہت سے کام لینے کو کہتے ہیں، جب کہ حقیقی اور سچی وٹ خیالات کی مشابہت اور قوت ممیزہ کی صوابدید سے ایسے دو خیالات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے، جو آپس میں کم مشابہت رکھتے ہوں۔

جیسے غالب کا وہ شعر جسے حالی نے تخیل کی مثال میں پیش کیا ہے۔

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

مقدمہ شعر و شاعری میں دوسرا مصرع اس طرح ہے۔

جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے[4]

جس شخص میں تخیل کا ملکہ فطری ہوگا، اس کی فطرت خود بخود نسخۂ فطرت انسانی اور نسخۂ کائنات کے مشاہدے سے اپنی ضرورت کی چیزوں کو اخذ کرتی رہے گی۔ اور جو جذبات و خیالات اس کے دل و دماغ میں آتے ہیں، وہ اس کے ذہن پر نقش ہوتے رہتے ہیں، جیسے وہ نئی نئی ترکیب و ترتیب سے نئے نئے نقوش بناتا رہتا ہے، وہ ایک اخباری رپورٹر کی طرح کاغذ پر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو لکھتا نہیں پھرا کرتا۔

لیکن یہ مصرع دیوان غالب میں 'ساغر جم سے مرا' درج ہے۔[5] اس شعر میں جام سفال کو جو نہایت کم قیمت اور ارزاں ہے ساغر جم سے بہتر قرار دیا گیا ہے، جو انمول اور بے بدل ہے۔ اور یہ حسن تعلیل کی بہترین مثال ہے۔ اور بقول حالی اس سے زبان متلذذ، کان محظوظ اور دل متاثر ہوتا ہے۔ اور یہ شعر باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور تعجب انگیز ہے۔ واضح ہو کہ مذکورہ بالا خاصیت کا شعر میں ہونا جھوٹی وٹ کا مظہر ہے، نہ کہ تخیل کا۔ نیز اس شعر میں جس طرح جام سفال کو ساغر جم سے بہتر قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، وہ بھی قابل غور ہے، اس لیے کہ کسی چیز کے بہ آسانی حصول سے اس کی قدر نہیں بڑھتی، بلکہ ضرورت مند کے لیے اس کا حصول آسان ہوتا جاتا ہے، لیکن جو چیز صرف نادر و نایاب نہیں، بلکہ انمول اور بے بدل ہو، تب بھی اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہوگی۔ البتہ دل کو خوش رکھنے کے لیے یہ خیال اچھا ہے۔ اس شعر سے اگرچہ حسن تعلیل کی وجہ سے تلذذ اور انبساط حاصل ہوا ہے، لیکن کوئی ایسی نئی صورت خلق نہیں ہوئی، جو حقیقی علم عطا کرے یا شعور کو متاثر کرے، جو کہ تخیل کا کارنامہ ہے۔

مطالعۂ کائنات

شاعری کی دوسری شرط 'مطالعہ کائنات' ہے۔ بقول حالی اگرچہ تخیل اپنے محدود اور تنگ دائرے میں رہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ نتیجہ نکال سکتا ہے۔ لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے نسخۂ کائنات اور خاص کر نسخۂ فطرت انسانی کا مطالعہ ضروری ہے۔ حالی کی اس تشریح سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مطالعۂ کائنات شاعری کی شرط نہ ہو کر تخیل کی پختگی اور اس کے کمال کی شرط ہے۔ اس لیے کہ مطالعۂ کائنات اگر شاعری کی شرط ہے، تو اس کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ حالی نے سر والٹر اسکاٹ کے حوالے سے مطالعۂ کائنات کی اہمیت و افادیت کی مثال دی ہے کہ وہ کس طرح چھوٹے چھوٹے خودرو پھول، پتے اور میوے کے نام نوٹ کر رہا تھا، جو وہاں اُگ رہے تھے، تاکہ تخیل کی پرواز کو بلند کر سکے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطالعۂ کائنات تخیل کی بلندی کے لیے ضروری ہے، نہ کہ شاعری کے لیے شرط ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ جس شخص میں تخیل کا ملکہ فطری ہوگا، اس کی فطرت خود بخود نسخۂ فطرت انسانی اور نسخۂ کائنات کے مشاہدے سے اپنی ضرورت کی چیزوں کو اخذ کرتی رہے گی۔ اور جو جذبات و خیالات اس کے دل و دماغ میں آتے ہیں، وہ اس کے ذہن پر نقش ہوتے رہتے ہیں، جیسے وہ نئی نئی ترکیب و ترتیب سے نئے نئے نقوش بناتا رہتا ہے، وہ ایک اخباری رپورٹر کی طرح کاغذ پر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو لکھتا نہیں پھرا کرتا۔ جب کہ حالی کو خود اس کا اعتراف ہے کہ ''جتنے بڑے بڑے شاعر دنیا میں گزرے ہیں، وہ کائنات اور فطرت انسانی کے مطالعے میں ضرور مستغرق رہے ہیں۔ جب رفتہ رفتہ اس مطالعے کی عادت ہو جاتی ہے، تو ہر

ایک چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ ہو جاتا ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینۂ خیال میں خود بخود جمع ہونے لگتے ہیں''۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حالی سر والٹر اسکاٹ کے حوالے سے اپنی کہی ہوئی بات کی تردید کر رہے ہیں۔ شاید ایک یوروپین کے حوالے سے اپنے نظریے کو موثر بنانا چاہ رہے ہیں، لیکن اس سے تو انھیں کے قول کی نفی ہو رہی ہے۔

حالی نے سر والٹر اسکاٹ کی شاعری کے حوالے سے دو باتوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ ایک اصلیت سے تجاوز نہ کرنا، دوسرے ایک ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ اسی طرح حالی نے ایک جگہ گولڈ اسمتھ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ممتاز حسین دونوں کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

حالی نے سر والٹر اسکاٹ کی شاعری کے حوالے سے دو باتوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ ایک اصلیت سے تجاوز نہ کرنا، دوسرے ایک ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ اسی طرح حالی نے ایک جگہ گولڈ اسمتھ کا بھی حوالہ دیا ہے۔

گولڈ اسمتھ اور اسکاٹ دونوں آگسٹن (Augustan) دور (یہ دور یورپ میں سترہویں صدی کے اواخر سے اٹھارہویں صدی کے ربع ثانی تک مانا جاتا ہے) کے شاعر تھے۔ اس دور میں کلاسیکی ماڈل کی نقالی کو اہمیت دی جاتی اور شاعری میں تعقل اور اخلاقی تعلیم کو اصول شاعری کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا۔ چنانچہ اس کے اثرات ان دونوں کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ زمانہ رومانیت کی آمد آمد کا تھا اور یہ بات روز بروز ابھر رہی تھی کہ اولاً شعری مضمون کے پیچھے کوئی ٹھوس حقیقت ہونی چاہیے یعنی اس کی بنیاد صرف واہمے پر نہ ہو، دوسرے یہ کہ پُر آرائش اسلوب کے بجائے سادہ، فطری اسلوب ہونا چاہیے۔6

سر والٹر اسکاٹ اور گولڈ اسمتھ دونوں دوئم درجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اور خیالات کو کوئی خاص اہمیت یوروپین شاعری میں نہیں دی گئی، جتنا کہ چوسر، اسپنسر اور شیکسپیئر کے کلام کو دی گئی۔ لیکن سر والٹر اسکاٹ اور گولڈ اسمتھ کے خیالات، اصلاحی اور مقصدی نظریات کے عین مطابق تھے، جنھیں حالی کے مشیروں نے شاید حالی تک پہنچا دیا اور حالی نے ان کے نظریات کو اردو ادب میں اصلاح کے مدنظر پیش کر دیا۔

حالی نے مطالعۂ کائنات کی تشریح کرتے ہوئے اس کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا ہے، تخیل اور حافظہ دونوں اس کے دائرۂ کار میں آ گئے ہیں۔ حالی کا یہ کہنا ''اس سرمایے کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے'' حافظے کا کام ہے اور ان کا یہ کہنا ''فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے'' یہ تخیل کا خاصہ ہے۔ لیکن تخیل کی بحث میں حالی نے اس قوت کو وہبی کہا ہے، جب کہ مطالعۂ کائنات میں اسی قوت کو کسبی قرار دیا ہے۔ حالی نے تخیل کی بحث میں جس خاصیت کا ذکر کیا تھا مطالعۂ کائنات کے تحت اسی خاصیت کا اعادہ کیا ہے، بس فرق یہ ہے کہ تخیل میں 'نئی صورت' کا اضافہ ہے، اور مطالعۂ کائنات میں نہیں ہے۔

تفحص الفاظ

شاعری کی تیسری شرط 'تفحص الفاظ' ہے۔ حالی کے نزدیک تفحص الفاظ کے ذریعے ہی تخلیق کار کسی خیال کو مناسب اور موزوں ترین الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، جس سے اس خیال کی تصویر ہو بہ ہو آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یعنی تفحص الفاظ کے ذریعے ہی شاعر اپنے خیال کو ہو بہ ہو مخاطب کے روبہ رو پیش کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ تفحص الفاظ سے ہی شعر میں ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو مخاطب کو مسخر کر لیتی ہے۔ اگر کوئی شاعر ایسا کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا شعر کہنے سے نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

اگر چہ شاعر کے مخیلہ کو الفاظ کی ترتیب میں بھی ویسا ہی دخل ہے، جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں، لیکن شاعر اگر زبان کے ضروری حصے پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر واستقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آ سکتی۔7

حالی کے اس بیان سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ و خیالات دو الگ شے ہیں، جو بیک وقت ذہن انسانی میں نہیں آتے۔ یعنی خیالات والفاظ الگ الگ وقت میں انسانی ذہن میں آتے ہیں۔ اسی لیے کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

کیا آپ خیالات کا نقشہ ذہن ہی میں سہی، لفظوں کی مدد کے بغیر کھینچ سکتے ہیں؟ خیالات اور الفاظ بیک وقت اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ خیالات اور الفاظ کا انتخاب، خیالات اور الفاظ کی جانچ، خیالات اور الفاظ کی ترتیب یہ سب چیزیں ساتھ ساتھ عمل میں آتی ہیں۔8

کلیم الدین احمد کا یہ اعتراض بجا ہے، کہ خیالات اور الفاظ دونوں ذہن میں ایک ساتھ آتے ہیں، لیکن بظاہر حالی کا مقصد خیالات اور الفاظ کی علیحدگی کا نہیں، بلکہ خیالات جن الفاظ کے ساتھ ذہن میں آئے تھے، وہ الفاظ ان خیالات کے لیے مناسب اور موزوں بھی ہیں، یا نہیں۔ حالی نے اسی لیے شاعر کو غور وفکر کی ضرورت پر ابھارا ہے۔ ان کا مقصد الفاظ اور خیالات میں تفاوت بیان کرنا نہیں۔ دنیائے ادب میں استادی اور شاگردی کی جو مضبوط روایت رہی ہے اس کا مقصد ہی شاگردوں کے اشعار پر اصلاح دینا ہوتا تھا۔ بسا اوقات اساتذہ کے ایک دو لفظ کے حذف و اضافے یا ردو بدل سے شعر کی معنویت اور تاثیر میں جو اضافہ ہوتا تھا، وہ آج ادب سے آگہی رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور اساتذہ کی اصلاحوں سے شعر کی معنویت اور تاثیر میں اضافہ اس لیے ہوتا تھا کہ شاگرد یا نو آموز شاعروں سے خیال کو الفاظ کا جامہ پہناتے وقت جو کمیاں اور خامیاں در آتی تھیں، اساتذہ ان کمیوں اور خامیوں کو مناسب اور موزوں ترین الفاظ سے رفع کرتے تھے۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرے 'نکات الشعرا' میں مصطفیٰ خان یک رنگ کے ایک شعر پر اپنی صلاح کچھ یوں دی ہے۔

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

باعتقاد فقیر بجائے 'سچ' حرف 'حق' اولی است9

میر نے شعر کے پہلے لفظ 'سچ' کو 'حق' سے بدلنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور اپنے خیال میں سچ کی بہ نسبت حق کو بہتر اور اولیٰ قرار دیا ہے۔ لفظ ''سچ کی جگہ لفظ 'حق' رکھنے

سے شعر میں تلمیح، مناسبت اور معنویت کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی لیے حالی نے خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنانے کا مشورہ دیا ہے۔ حالی الفاظ کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نظمِ الفاظ میں اگر بال برابر بھی کمی رہ جاتی ہے تو وہ (ماہرینِ فن) فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے شعر میں کون سی بات کی کسر ہے۔[10]

حالی خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنانے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ 'الفاظ کو ایسی صورت سے منتظم کرنا چاہیے کہ وہ صورۃً نثر سے متمیز ہو، لیکن معنی اسی قدر پورے ادا کرے جیسے نثر میں ہوتے ہیں'۔ حالی اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ شعر نثر سے صورۃً کس طرح علیحدہ ہو۔ کیونکہ حالی نے پہلے ہی وزن کو شعر سے خارج کردیا ہے اور کسی دوسرے معیار یا پیمانے کا ذکر بھی نہیں کیا ہے، جو شعر کو صورۃً نثر سے علیحدہ کردے۔ حالی نے صورۃً متمیز ہونے کی بات کہی ہے، معلوم نہیں وزن کے علاوہ وہ کون سی صورت ہوگی، جو شعر کو صورۃً نثر سے متمیز کرے گی۔ حالی شعر سے اس بات کا بھی تقاضا کرتے ہیں کہ وہ نثر کی طرح ہی معنی دے۔ بظاہر نثر کی طرح معنی دینے سے حالی کی مراد یہی ہوسکتی ہے کہ جس طرح نثر میں ابلاغ و ترسیل بالکل واضح اور دو ٹوک ہوتی ہے، اس طرح شعر میں بھی ہونا چاہیے، یعنی شعر کے معانی اور مفاہیم میں کوئی پیچیدگی نہ ہو اور مقصدِ شعر واضح ہو۔ لیکن اگر حالی کا مقصد نثر کی طرح معنی دینے سے یہ ہے کہ جس طرح نثر میں وضاحت اور قطعیت ہوتی ہے اور نثر اجمال و ابہام کی حامل نہیں ہوتی۔ شعر کو بھی اسی طرح کا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے شعر سے ان باتوں کا تقاضا کرنا، شعر کو شعریت سے خارج کرنا ہے۔ اس موضوع سے متعلق مزید آگہی کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون 'شعر، غیر شعر اور نثر' کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔

حالی کی تربیت مشرقی طرز پر ہوئی تھی۔ وہ کلاسیکی شعریات کے اصول و ضوابط سے نہ صرف پوری طرح واقف تھے، بلکہ انھوں نے ان شعریات و رسومیات کو اپنی ابتدائی تخلیقات میں برتا بھی ہے۔ حالی ظاہری اور خارجی دباؤ کے باوجود غیر شعوری طور پر کلاسیکی شعریات و رسومیات کی طرف جھک ہی جاتے ہیں۔ سید عبداللہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاعری اور ادب کے متعلق مولانا حالی کا ذہن قدیم بلاغت کے تصورات سے اس قدر متاثر ہے کہ ظاہری تبدیلی کے باوجود غیر شعوری طور پر ادھر جھک ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ بیان و انشا کو داخلی سے زیادہ خارجی اور محض صناعتی چیز سمجھنے کے معاملہ میں وہ ہمیشہ جدید خیال کے مقابلہ میں قدیم خیال کی طرف میلان ظاہر کرتے ہیں۔''[11]

> ''حالی نے مطالعۂ کائنات کی تشریح کرتے ہوئے اس کے دائرے کو بہت وسیع کردیا ہے، تخیل اور حافظہ دونوں اس کے دائرۂ کار میں آگئے ہیں۔''

حالی اپنے عہد کے تقاضے اور ماحول کی تبدیلی، نیز سرسید تحریک کے زیرِ اثر مقصدی اور افادی ادب کے پُرجوش داعی تھے۔ اسی لیے انھوں نے ایسے نظریات کو پیش کیا جو ان کے مقصدی اور افادی ادب کے مطابق ہوں، لیکن غیر شعوری طور پر قدیم تصورات بلاغت کی طرف وہ جھک جاتے ہیں۔ اور ان سے کہیں نہ کہیں کلاسیکی شعریات و رسومیات کا اظہار ہو جاتا ہے۔

تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ کو حالی نے شاعری کی شرط قرار دیا ہے۔ تخیل شاعری کی شرط اول ہے، اس پر بحث ارسطو کے زمانے سے ہی چلی آرہی ہے۔ لیکن مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ کو شاعری کی شرط قرار دینا کہاں سے ماخوذ ہے؟ حالی نے اپنے اس نظریے کی بنیاد کس کے نقطۂ نظر پر رکھی ہے؟ آیا یہ نقطۂ نظر یورپ کے کسی نقاد یا محقق کے قول پر ہے، یا حالی کے غور و فکر کا نتیجہ ہے؟ اس حوالے سے حالی کے کسی نقاد نے کوئی بحث نہیں کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حالی کا یہ نقطۂ نظر ان کی مشرقی افتادِ طبع اور کلاسیکی شعریات سے آگہی کا نتیجہ ہے۔

حالی انگریزی ادب سے واقف نہ تھے۔ وہ جس سماج میں پروان چڑھے تھے، اس میں انگریزی سیکھنے اور انگریزی کالجوں میں داخلہ لینے کو نہ صرف معیوب سمجھا جاتا تھا، بلکہ انگریزی کالجوں کو 'مچھلے' کہا جاتا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف بالواسطہ انگریزی ادب کے نظریات و خیالات سے واقفیت بہم پہنچائی، بلکہ اسے اردو داں طبقے تک پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ اگرچہ حالی ان نظریات و خیالات کو بخوبی نہ سمجھ سکے ہوں اور مکمل طور پر صحیح مذاق شعری رہنمائی بھی نہ کرسکے ہوں، لیکن حالی نے شعر و شاعری کے حوالے سے اردو داں طبقے میں جو ایک نظریاتی بحث چھیڑی تھی، غور و فکر کا جو ایک ماحول بنایا تھا اور بعد میں آنے والے ناقدین و مفکرین کو شعر و ادب پر گفتگو کرنے کی جو راہ دکھائی تھی، اس میں وہ نہ صرف پوری طرح کامیاب و کامران ہیں، بلکہ اس میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔

حواشی

1 مقدمہ شعر و شاعری، الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2018، ص 52
2 حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ، ممتاز حسین، سعد پبلی کیشنز، 1988، ص 116-117
3 ایضاً، ص 188
4 مقدمہ شعر و شاعری، ص 52
5 کلیات غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2003، ص 154
6 حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ، ص 35
7 مقدمہ شعر و شاعری، ص 58
9 اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، بک امپوریم، پٹنہ، 2018، ص 82
9 نکات الشعرا، میر تقی میر، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، دکن، 1935، ص 20
10 مقدمہ شعر و شاعری، ص 58
8 سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2011، ص: 310

■

Mohd Shahnawaz Khan
Research Scholar, Dept of Urdu,
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob: 9536673993
shahnawazrazi73@gmail.com

فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات

عبداللہ

ہندوستان کے نوآبادیاتی نظام میں کئی ایسے تعلیمی ادارے قائم ہوئے جنھوں نے اردو زبان وادب کو فروغ دیا۔ ایسے ہی اداروں میں فورٹ سینٹ جارج کالج بھی شامل ہے، جو 1812 میں ریاستِ مدراس میں قائم ہوا۔

حالانکہ اس کالج کی جڑیں تقریباً دو صدی قبل فورٹ سینٹ جارج کے قلعے سے جا ملتی ہیں، جس کی تعمیر 23 اپریل 1640 کو شروع ہوئی اور تین سال میں مکمل ہوئی، اور اسی قلعے میں ایک پبلک اسکول بھی قائم کیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر افضل الدین اقبال اپنی کتاب 'فورٹ سینٹ جارج کالج: دکنی زبان وادب کا ایک اہم مرکز' (صفحہ 12) میں 'The Story of Madras' (مصنف: جی. بارلو) کا حوالہ دیتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ 1645 میں فادر افریہم (Father Ephraim) نے فورٹ سینٹ جارج میں مدراس کے پہلے پبلک اسکول کی بنیاد رکھی۔ جب کہ راقم الحروف کی نظر میں 'The Story of Madras' میں کوئی متعین تاریخ درج نہیں، البتہ اتنا ضرور لکھا گیا ہے کہ سترہویں صدی میں فادر افریہم نے مدراس میں پہلا پبلک اسکول قائم کیا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس اسکول کو زیادہ اہمیت نہ دی اور یہ ایک Poor School کے طور پر جانا جانے لگا۔ بعد ازاں، 1717 میں فورٹ سینٹ جارج اسکول (رائٹرس کالج) کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ ادارہ یورپ سے آنے والے جونیئر انگریز ملازمین کی تعلیم و تربیت کا پہلا مرکز بنا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کو باقاعدہ کالج کا درجہ 1812 میں ملا۔ اس کالج کے قیام کا پس منظر یہ تھا کہ 1802 میں جب فورٹ ولیم کالج کو عدالتی منظوری نہ ملی اور اس کی مرکزی حیثیت ختم کر دی گئی، تو مدراس حکومت نے وہاں اپنے ملازمین اور منشیوں کو بھیجنا بند کر دیا۔ ایسے میں یہ سوال اٹھا کہ صرف کلکتہ ہی تعلیمی مرکز کیوں ہو؟ کیوں نہ مدراس اور بمبئی میں بھی اسی نوعیت کے ادارے قائم کیے جائیں؟ اس سوچ کا عملی نتیجہ فورٹ سینٹ جارج کالج کی صورت میں سامنے آیا۔

کالج کے بانی کے حوالے سے مختلف آرا موجود ہیں۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال کے مطابق، اس کی بنیاد سر جارج بارلو نے رکھی، جب کہ Oxford Reference اور مدراس ہیریٹیج بلاگ جیسے معتبر ذرائع فرانس وائٹ ایلس (F. W. Ellis) کو اس کا اصل بانی قرار دیتے ہیں۔ مختلف حوالہ جات کے تقابلی مطالعے کے بعد قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سر جارج بارلو (اس وقت مدراس کے گورنر جنرل تھے) کی سرپرستی میں مستشرق فرانس وائٹ ایلس نے اس ادارے کی علمی و لسانی بنیاد رکھی—یعنی ایک نے سیاسی سرپرستی فراہم کی، اور دوسرے نے فکری قیادت۔

اس کالج کے قیام کا مقصد فورٹ ولیم کالج سے کچھ مختلف نہ تھا، لیکن فورٹ سینٹ جارج کالج کو بعض اعتبار سے فوقیت حاصل تھی، کیونکہ یہاں صرف منشی یا ادیب ہی نہیں، بلکہ جج، وکلا، اور ڈاکٹروں کو بھی تربیت دی جاتی تھی۔ یہاں زبان و ادب کے ساتھ ساتھ قانون اور حساب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج میں فارسی، عربی، سنسکرت، تامل، ہندوستانی اور دکنی اردو کی تدریس کا انتظام موجود تھا۔ اس ادارے میں تعلیم کے علاوہ تصنیف و ترجمہ کے باقاعدہ شعبہ جات، ایک کتب خانہ، پریس، اور نمایاں کارکردگی پر انعام و اکرام کا بھی مکمل نظام قائم تھا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کا قیام بھی اسی مقصد کے تحت عمل میں آیا تھا جس مقصد کے تحت فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تھا، یعنی انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانا۔ اس کالج نے بھی کم و بیش فورٹ ولیم کالج کی طرز پر اپنی خدمات انجام دیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج پر ہر ماہر ادب اور اردو زبان و ادب کے مؤرخین کی توجہ مرکوز رہی، اور اس پر خوب لکھا گیا، جب کہ فورٹ سینٹ جارج کالج تاریخ کے صفحات میں کہیں گم ہو گیا۔ اس کالج کی اردو خدمات کو

کسی نے بھی سنجیدگی سے اپنا موضوع تحقیق نہیں بنایا۔
اس تعلق سے محمد افضل الدین اقبال کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں، جنھوں نے 'مدراس میں اردو ادب کے نشوونما' پر تحقیق کے دوران فورٹ سینٹ جارج کالج کو اپنے مقالے میں ایک باب کے طور پر شامل کیا، اور بعد میں مزید اضافہ کے ساتھ دو مستقل کتابوں (فورٹ سینٹ جارج کالج: دکنی زبان وادب کا ایک اہم مرکز، اور فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج: تقابلی وتنقیدی جائزہ) کی صورت میں شائع کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے ایک مضمون کا بھی حوالہ ملتا ہے۔

کالج کی اردو خدمات

فورٹ سینٹ جارج کالج نے 1812 میں اپنی تعلیمی وتصنیفی خدمات دینا شروع کیں اور 1854 تک مسلسل اپنے علمی ولسانی کردار کو نبھاتا رہا، لیکن اس کے قیام سے قبل بھی فورٹ سینٹ جارج کے احاطے میں اردو زبان سے متعلق چند عملی نمونوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نام پادری شلز کا سامنے آتا ہے، جو فورٹ سینٹ جارج سے وابستہ تھا۔ اس نے اردو زبان کی ایک قواعد مرتب کی، جو 1744 میں طبع ہوئی، اور اسی پادری نے 1748 میں بائبل کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

وکیپیڈیا پر موجود تحقیقی حوالوں کے مطابق اردو قواعد مرتب کرنے والے پادری کا درست نام بینجمن شلز (Benjamin Schultze) تھا، جو جرمنی سے تعلق رکھنے والا ایک مشنری اور مستشرق تھا، اور اس نے 1745 میں اردو (دکنی) گرامر ترتیب دی۔

اس کے علاوہ، کپتان ہنری ہیریس (Henry Harris) نے 1791 میں مدراس سے ایک 'ہندوستانی لغت' شائع کی (بحوالہ wikitree)، جب کہ کپتان تھامس روبک (Thomas Roebuck) نے گلکرسٹ کی لغت کی تدوین میں معاونت کی، اسی طرح، 'حکایت الجلیلہ' جیسے نثری سرمایہ کے مصنف منشی شمس الدین، 1806 سے ہی فورٹ سینٹ جارج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال کے مطابق اسی ادارے سے وابستہ ایک اور اہم نام جنرل جوزف اسمتھ (General Joseph Smith) کا ہے، جن کے ایماء پر عطا حسین

خان تحسین نے قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ 'نوطرز مرصع' کے عنوان سے کیا تھا۔ حالانکہ 'نوطرز مرصع' کے مقدمے کے مطابق یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ مقدمے میں سید نورالحسن ہاشمی نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ''انھوں (شجاع الدولہ) نے سن کر بہت پسند کیا اور حکم دیا کہ اسے لکھ کر مکمل کرو۔'' البتہ یہ درج ضرور ہے کہ سفر کلکتہ کے دوران تحسین کے ایک ساتھی نے جنرل اسمتھ کو ایک قصہ سنایا تھا جو 'نوطرز مرصع' میں مذکور ہے۔

اس کالج کے شعبۂ تصنیف وتالیفات میں ہندوستانی، دکنی، عربی، فارسی، سنسکرت، تامل کے علاوہ قانون، ریاضی، صرف ونحو، لغت وقواعد، افسانہ، تاریخ وسوانح اور اخلاقیات کے موضوع اور مضمون پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، یہ کالج چونکہ جنوب مشرق میں تھا اس لیے یہاں دکنی اردو غالب رہی، یہاں بیک وقت کئی اساتذہ موجود تھے جو درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف اور تراجم کا بھی کام کرتے تھے۔

ان اساتذہ میں مولوی تراب علی کا نام سرفہرست آتا ہے جن کا تخلص نامی تھا، یہ کالج کے بڑے عالم، شاعر اور استاذ ہونے کے ساتھ شعبۂ عربی، فارسی اور ہندوستانی کے صدر بھی تھے۔ تراب علی 1813 میں کالج سے وابستہ ہوئے، ان کی تصانیف میں دارالمنظوم، وسیط النحو، رسالہ حکایتِ چند، ایران وعرب کا سفرنامہ وغیرہ شامل ہیں۔

نامی کے بعد سید حسین شاہ حقیقت کا ذکر ضروری ہے جو ترکستان سے تعلق رکھتے تھے، اور حضرت امیر کلال کی اولاد میں سے تھے۔ شاہ حقیقت کانپور اور لکھنؤ سے ہوتے ہوئے فورٹ سینٹ جارج کالج جا پہنچے اور میر منشی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ شاہ حقیقت کا ذکر اردو کے تذکرہ نویسوں نے بھی کیا ہے۔ ان کی تصانیف میں صنم کدہ چین، جذب عشق، تحفۂ انجم، خزینۃ الامثال، تذکرۂ احبا، مثنوی ہشت گلزار، مثنوی ہیرا من طوطا، ہفت نسخہ اور دیوان شامل ہیں۔

شاہ حقیقت کا ایک اردو شعر ملاحظہ ہو جو مجموعۂ نغز میں درج ہے۔

نہ خفا ہو جو تک رہوں پیارے
کہ نہیں اختیار میں آنکھیں

> فورٹ سینٹ جارج کالج کو بعض اعتبار سے فوقیت حاصل تھی، کیونکہ یہاں صرف منشی یا ادیب ہی نہیں، بلکہ جج، وکلا، اور ڈاکٹروں کو بھی تربیت دی جاتی تھی۔ یہاں زبان وادب کے ساتھ ساتھ قانون اور حساب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج میں فارسی، عربی، سنسکرت، تامل، ہندوستانی اور دکنی اردو کی تدریس کا انتظام موجود تھا۔ اس ادارے میں تعلیم کے علاوہ تصنیف وترجمہ کے باقاعدہ شعبہ جات، ایک کتب خانہ، پریس، اور نمایاں کارکردگی پر انعام واکرام کا بھی مکمل نظام قائم تھا۔

حسن علی ماہلی (بقول نصیرالدین ہاشمی، مصنف مدراس میں اردو 'محمد حسن خان نام اور حسن تخلص') کا تعلق بھی فورٹ سینٹ جارج کالج سے تھا، ان کا وطن اتر پردیش کا ایک گاؤں ماہل ہے اور اسی نسبت سے یہ ماہلی کہلائے۔ فورٹ سینٹ جارج کالج میں حسن علی کا تقرر 1816 میں بحیثیت مدرس ہوا تھا، ان کی تصانیف میں 'تبصرۃ الحکمہ' اور 'منتخب التحریر' قابل ذکر ہیں جو عربی و فارسی زبان میں ہیں۔ منشی غلام حسین معاون خان بھی اس کالج سے منسلک تھے، ان سے منسوب کوئی کتاب مذکور نہیں ہے لیکن کالج کے فعال اساتذہ میں منشی غلام حسین معاون خان کا نام ضرور شامل ہے۔

ان کے علاوہ کالج کے دیگر اساتذہ میں مفتی محمد تاج الدین حسین خاں (تصانیف: رسالہ فن حرف، قافیہ مسمی بہ، مجمع البحرین، شرح گلستان بنام چمنستان)، مرزا عبدالباقی وفا (کالج سے وابستگی 1831)۔ مرزا محمد

جان (تصانیف: رسالہ قلبیہ، مقاصد علوم، جامع بیان ریاضی، رسالہ در علم فزک/فزکس)، سید تاج الدین (تصانیف: تاج نامہ، عقائد، گل دستہ ہند)، محمد خان (اردو تصانیف :اسرار احمدی، دستور النثر ،تقویم الایمان)، منشی سید غلام دستگیر (تصنیف: مثنوی احوال قیامت)، منشی مظفر (تصنیف 'حیدر نامہ')، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری (معروف تصنیف: دکنی انوار سہیلی یا دکنی انجمن)، منشی شمس الدین احمد (تصنیف: الف لیلہ کا ترجمہ، یہ ترجمہ 'حکایات الجلیلہ' کے نام سے فورٹ سینٹ جارج کالج سے شائع ہوا تھا)، سید میر حیدر بلگرامی (تصانیف: عربی گرامر موسوم 'منتخب الصرف'، میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج والے کے دیوان پر مقدمہ) وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک اور نام محمد مہدی واصف (کالج سے وابستگی 1818 سے 1835 تک) کا ہے۔ عربی فارسی کے علاوہ ان کی اردو تصانیف کی تعداد کم و بیش بائیس 22 ہیں۔ 'مجمع الامثال' آداب الصالحین کا اردو ترجمہ، انگریزی ہندوستانی اور فارسی لغت 1851، دلیل ساطع، مناظر اللغات، ترجمہ کیمیائے سعادت، رسالہ تعبیر خواب، منہاج العابدین، شادی نامہ وغیرہ محمد مہدی واصف کی اہم کتابیں ہیں۔

اس کالج سے وابستہ انگریز مدرسین و مصنفین کی بھی ایک طویل فہرست ہے، جنھوں نے اس کالج میں اپنی خدمات پیش کیں۔ انگریز اساتذہ میں تھامس روبک، ڈاکٹر ہنری ہیرس، جنرل جوزف اسمتھ ، ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور نے متعدد تصنیفی خدمات انجام دی ہیں، جن میں 'گلدستۂ سخن' (فارسی و اردو شعراء کے کلام کا انتخاب)، کتاب علم نجوم (ترجمہ)، اردو و انگریزی میں دنیا کے اعداد و شمار کا نقشہ 'اصول فن قبالت' شامل ہیں۔ ان سب کے علاوہ بعض ایسے مطبوعات اور مخطوطات کے بھی ذکر ملتے ہیں جن کے مصنف نامعلوم ہیں۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے پاس اپنا خود کا ایک پریس بھی تھا جس سے کالج کے مصنفین کی کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔ پریس بہت فعال نہیں تھا پھر بھی کئی اہم کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں۔ کالج پریس کی مطبوعات میں سب سے اہم اور معروف کتاب 'دکنی انوار سہیلی' ہے، جو دکنی اردو کا سرمایہ ہے۔

اسی طرح کالج کے پاس ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی موجود تھا، جس میں عربی، فارسی، اردو (ہندوستانی)، تامل، تلگو، سنسکرت اور انگریزی زبانوں کی نہ صرف مطبوعہ بلکہ غیر مطبوعہ (مخطوطہ) کتب بھی بڑی تعداد میں محفوظ تھیں۔ ولیم ٹیلر (William Taylor) نے ان تمام کتابوں کی فہرست مرتب کر کے اسے دو یا تین جلدوں میں فورٹ سینٹ جارج گزٹ سے شائع کیا۔ ان میں سے پہلی جلد 1857 میں شائع ہوئی، جو فی الوقت کیلی فورنیا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس جلد کی ڈیجیٹل کاپی انٹرنیٹ پر دستیاب ہے جس کے سرورق سے پہلے کے صفحے پر 'کیلی فورنیا یونیورسٹی لائبریری' کا نام اور مہر ثبت ہے۔ اور سرورق پر درج عبارت کچھ اس طرح ہے:

'Oriental Manuscripts
in the
Library of the (Late) College
Fort Saint George
Now in Charge of the Board of
Examiners
By the
Rev., William Taylor, Vol A
Madras: Prented by H. Smirth, at The
Fort St. George Gazete Press, 1857"

اس کالج کے علمی احاطے میں قدیم اردو، خصوصاً دکنی اردو کے ایسے نادر سرمائے وجود میں آئے جو لسانی، تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یہ سرمائے وہ علمی خزانے ہیں جنھیں نظر انداز کرنا، اردو ادب کے ماضی سے ناانصافی کے مترادف ہوگا۔

ان تمام علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ، فورٹ سینٹ جارج کالج میں زبان سیکھنے اور سکھانے پر انعامات دئے جاتے تھے۔ بہترین تصنیف پر بھی انعام سے نوازا جاتا، جس کا مقصد نہ صرف لسانی مہارت کو فروغ دینا تھا بلکہ علمی مسابقت کو بھی بڑھاوا دینا تھا۔

کالج کا اختتام اور موجودہ صورت: مقصد بر آنے پر جیسے فورٹ ولیم کالج کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ویسا ہی سلوک اس کالج کے ساتھ بھی ہوا، 1854 میں کالج کی حیثیت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی اور ''اس کا انضمام مدراس لٹریری سوسائٹی کے ساتھ ہو گیا۔''

فی الوقت، کالج کی تاریخی عمارت Directorate of Public Instruction (DPI) Campus کا حصہ ہے، جو چینئی کے کالج روڈ پر واقع ہے۔ یہ عمارت اب ٹامل ناڈو حکومت کے تعلیمی دفاتر کے طور پر استعمال ہو رہی ہے، جن میں ڈائریکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشن اور ڈائریکٹوریٹ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن شامل ہیں۔ عمارت کا کچھ حصہ آج بھی آرکائیول ریکارڈز (Archives) اور دیگر سرکاری مقاصد کے لیے محفوظ ہے۔ اپنی نوآبادیاتی طرز تعمیر، علمی ورثے اور تاریخی حیثیت کے سبب، یہ عمارت اب مدراس ہیریٹیج کا ایک اہم اور قیمتی حصہ تسلیم کی جاتی ہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج میں اگر چہ فورٹ ولیم کالج کی معروف و مقبول داستان 'باغ و بہار' جیسی نفیس، سلیس اور سحر انگیز نثر تخلیق نہ ہو سکی، جو اردو دنیا کو اپنی جادو بیانی سے مسحور کر لے، اس کے باوجود اس کالج کے علمی احاطے میں قدیم اردو، خصوصاً دکنی اردو کے ایسے نادر سرمائے وجود میں آئے جو لسانی، تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یہ سرمائے وہ علمی خزانے ہیں جنھیں نظر انداز کرنا، اردو ادب کے ماضی سے ناانصافی کے مترادف ہوگا۔

ماخذ و مصادر

1. فورٹ سینٹ جارج کالج: دکنی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز مصنف: ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، 1969، مدراس ہیریٹیج بلاگ
2. The Story of Madras، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1921
3. بحوالہ فورٹ سینٹ جارج کالج: دکنی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز، از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال صفحہ 39-64، و تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم، از ڈاکٹر جمیل جالبی، 1122
4. بحوالہ مجموعۂ نغز، مرتبہ محمود شیرانی، 1933

Abdullah
(Prof. Sauban Saeed, Supervisor)
Research Scholar
Khwaja Moinuddin Chishti Language University
Lucknow- 226013 (UP)

انور ہادی جنیدی

امیر خسرو کی پہیلیاں
لسانی حسن اور فکری رنگ

امیر خسرو کو برصغیر کی ادبی و تہذیبی تاریخ میں ’ہندوستان کی زبانوں اور ثقافتوں کا سفیر‘ کہا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام ابوالحسن یمین الدین محمد خسرو تھا اور وہ 1253 میں پٹیالی (ضلع ایٹہ، اتر پردیش، ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ والد ترک النسل امیر سیف الدین محمود تھے جب کہ والدہ ہندوستانی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہی امتزاج آگے چل کر امیر خسرو کی شاعری اور فکر میں ہندوستانی و ایرانی تہذیب کے حسین ملاپ کی بنیاد بنا۔ امیر خسرو کو بچپن ہی سے عربی، فارسی، ہندی اور مقامی بولیوں سے شغف تھا۔ ان کے والد کسی جنگ میں شہید ہوگئے تو ان کے نانا عماد الملک نے خسرو کو ابتدائی تعلیم دی۔ قدرتی ذہانت اور شعری صلاحیت نے انھیں کم عمری میں ہی شعر گوئی کی طرف مائل کر دیا۔

1275 میں خسرو کے نانا عماد الملک بھی اس جہان سے کوچ کر گئے۔ نانا کی وفات کے بعد خسرو کشلو خان عرف چھجو کے یہاں ملازمت اختیار کی بعد میں بغرا خان اور سلطان محمد کے پاس بھی ملازمت کی اور ان کے ساتھ ملتان بھی گئے تھے۔ عادل امیر دہلوی لکھتے ہیں:

”امیر خسرو امن و سکون کے ساتھ ملتان میں تھے کہ ایک ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ ہوا یہ کہ مغلوں نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ بدقسمتی سے شہزادہ سلطان محمد اس حملہ میں ہلاک ہوگیا امیر خسرو گرفتار کر لیے گئے۔ کچھ عرصہ بعد امیر خسرو مغلوں کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ جہاں سے وہ سیدھے اپنی والدہ کے پاس پٹیالی پہنچے۔ بعد ازاں دہلی آئے اور بلبن کے دربار میں سلطان محمد کا مرثیہ پڑھا جو انھوں نے ملتان میں شہزادے کی شہادت اور مغلوں کی غارت گری کے متعلق لکھا تھا۔ مرثیہ سن کر بلبن بہت رویا اور آخر کار اسی صدمے کی وجہ سے تیسرے دن انتقال کر گیا۔“[1]

خسرو نے زندگی کا بڑا حصہ دہلی سلطنت کے مختلف سلاطین کے دربار سے وابستہ ہو کر گزارا۔ وہ بیک وقت شاعر، موسیقار، سپاہی اور درباری مورخ بھی تھے۔ انھوں نے التمش کے بعد آنے والے کئی بادشاہوں کے عہد دیکھے، مگر خاص طور پر علاء الدین خلجی کے دور میں ان کا مقام بہت بلند ہوا۔ خلجی نے انھیں دربار کا لازمی رکن بنایا۔ وہ اپنے کلام اور ذہانت کی بدولت بادشاہ کے نہ صرف قریبی مصاحب تھے بلکہ فتوحات اور اہم واقعات کے شعری مرقع نگار بھی تھے۔ اسی ملازمت کے نتیجے میں امیر خسرو نے تاریخ کو منظوم انداز میں محفوظ کرنے کی روایت ڈالی۔ امیر خسرو موسیقی کے بھی عظیم فنکار تھے۔ ہندوستانی موسیقی میں کئی نئے راگوں کی تخلیق اور سازوں (خصوصاً طبلہ و ستار) کی ایجاد کا سہرا انھی کے سر جاتا ہے۔ قوالی کو باقاعدہ صنفِ موسیقی بنانے میں بھی ان کا بڑا کردار ہے۔ امیر خسرو کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی روحانی وابستگی ہے۔ وہ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ حضرت نظام الدین اولیا کے مریدِ خاص تھے۔ ان کا عشق بہت ہی گہرا تھا کہ حضرت کی وفات کے صرف چھ ماہ بعد ہی وہ بھی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے (1325)۔ امیر خسرو نے تقریباً بہتر برس کی عمر پائی اور 1325 میں دہلی میں انتقال کیا۔ ان کا مزار دہلی حضرت نظام الدین اولیاء کے آستانے کے پہلو میں واقع ہے۔ خسرو برصغیر کی مشترکہ تہذیب، فنونِ لطیفہ اور صوفیانہ محبت کی علامت کی شکل میں آج بھی زندہ ہیں۔

اردو اور ہندوی ادب کی تاریخ میں امیر خسرو کی حیثیت ایک ایسے نابغہ روزگار شاعر کی ہے جس نے صرف غزل، قصیدہ، رباعی یا مثنوی ہی نہیں کہی بلکہ اپنی تخلیقی توانائی سے عوامی ادب کو بھی نئی جان بخشی۔ ان کے کلام میں جہاں فارسی کی لطافت اور دربار کی نزاکت ہے وہیں عوامی بولیوں کی مٹھاس اور دہلی کے کوچوں کی زبان بھی شامل ہے۔ اسی امتزاج نے ان کی پہیلیوں کو ایسا رنگ دیا ہے کہ وہ صدیوں بعد بھی زبان کا زندہ اور جیتا جاگتا نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ پہیلیاں نہ صرف تفریح کا ذریعہ تھیں بلکہ زبان کے حسن، فکر کی وسعت اور مشاہدے کی گہرائی کی تربیت بھی کرتی تھیں۔ برصغیر میں پہیلی صدیوں سے عوامی ادب کا حصہ رہی ہے۔ یہ خواتین کے بیچ گھریلو کھیل کی صورت بھی رکھتی تھی اور میلوں ٹھیلوں میں بچوں کے لیے تفریح کا سامان بھی بنتی تھی۔ پہیلی ہمیشہ سے زبان کی چالاکی اور انسانی عقل کی آزمائش کا ذریعہ رہی ہے۔ مگر خسرو کی پہیلیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اسے محض تفریح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں فکر، فلسفہ اور زندگی کی باریکیوں کو سمو دیا۔ خسرو کی پہیلیوں میں روزمرہ کی عام چیزیں بھی ایک نئے تناظر کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی اشیا جیسے کنگھی، چکی، آئینہ، کان، جوتا یا بیل وغیرہ کو اپنی پہیلیوں کا موضوع بناتے ہیں، انھیں ایسے پرکشش اور دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والا حیرت و مسرت کی کیفیت میں آ جاتا ہے۔ پہیلیوں کے متعلق سید یوسف بخاری دہلوی لکھتے ہیں:

”نظم اور نثر کے ان منظم اور غیر منظم موتیوں میں آپ کو جا بجا توریہ اور ایہام سے واسطہ پڑے گا۔ کبھی

آپ استعاروں کنایوں اور اشاروں کے ذریعے دل کی باتیں اور من کے بھید سنیں گے 'تل اوٹ پہاڑ اوٹ' کے مصداق آپ ہر پہیلی کی اوٹ میں ایک پہاڑ کھڑا دیکھیں گے لیکن بوجھ کے اتے پتے کا نازک اور ننھا سا تیشہ اپنی ایک ہلکی سی ضرب سے اس پربت کو رائی سے کائی کرکے مسمار کر دے گا۔ آن کی آن میں دل کے عقدے اور من کے بھید ظاہر ہو جائیں گے۔ پہیلی کے بول ایسے انمول ہیں جو جیون کا رس بن کر امرت کی صورت کانوں میں ٹپکتے اور دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ ان کی دلکش گونجیں جیون کا روپ دھارتی اور بڑھاتی ہیں۔ دھکتے دلوں کا دارو بنتی ہیں۔ یہ ہماری خانگی اور بیرونی معاشرت اور قومی تہذیب کی سچی تصویریں ہیں شاعری کی روح اور آرٹ کی جان ہیں۔''2

امیر خسرو کی پہیلیوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی سادگی اور مقبول عام زبان ہے۔ وہ مشکل یا ثقیل الفاظ کے بجائے عوامی بولی کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ ہر طبقے کے لوگ انھیں سمجھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پہیلیاں دہلی سے لے کر دکن تک اور عوامی محفلوں سے لے کر تعلیمی درسگاہوں تک زبان زد خاص و عام رہیں۔ ان میں ایک طرح کی لوک سچائی اور ہندوستانی تہذیبی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ گویا یہ پہیلیاں صرف ادبی فن پارے نہیں بلکہ اپنے عہد کے معاشرتی و ثقافتی حالات کی جھلک بھی ہیں۔ یہ کہنا بجا ہے کہ امیر خسرو کی پہیلیاں اردو عوامی ادب کا بنیادی سرمایہ ہیں۔ ان میں زبان کی شگفتگی، فطری پن اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ ان کے ذریعے امیر خسرو نے عوام اور خواص کے درمیان ایک فکری و لسانی رشتہ قائم کیا۔ ان پہیلیوں نے زبان کو نہ صرف مٹھاس عطا کی بلکہ ذہنی تفریح اور فکری بالیدگی کا بھی سامان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ پہیلیاں زندہ ہیں اور بچوں سے لے کر بڑوں تک ہر طبقے کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ امیر خسرو کی پہیلیاں محض دل لگی یا ذہنی کھیل نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب و زبان کی آئینہ دار ہیں۔ خسرو نے اپنی تخلیقات میں نہ صرف صوفیانہ رموز و اشارات کو برتا بلکہ عوامی زندگی کے روزمرہ اشیا، مشاغل اور محاورات کو بھی شعری رنگ میں ڈھالا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پہیلیاں آج بھی زبان و بیان کے حسن اور تہذیبی شعور کا گہرا حوالہ ہیں۔ ان کی پہیلیوں پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو نے کس طرح سادہ اور عام فہم اشیا کو رمزیت اور تخیل کے پردے میں چھپا کر ذہنی آزمائش کی صورت پیدا کی۔ مثال کے طور پر، آئینہ، آکھ، انار، بایا کا گھونسلا، کاجل، پتنگ، نعت رسول، جگنو، ڈگڈگی، قینچی جیسی منتخب پہیلیاں ملاحظہ فرمائیں۔

منتخب پہیلیاں:

ایک ناری پیا کو بھانی   تن وا کو سگرا جوں پانی
آب رکھے پر پانی نا نہہ   پیا کو راکھے ہردے مانہہ
جب پی کو وہ منہ دکھلاوے   آپ ہی سگری پی ہو جائے

آئینہ 3

'ایک ناری پیا کو بھانی، تن وا کو سگرا جوں پانی' ان اشعار میں آئینہ کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ خسرو نے شفافیت اور عکس کے کھیل کو اس طرح پیش کیا کہ آئینہ ایک زندہ کردار بن گیا۔ محبوب کا عکس اس میں پڑتا ہے تو گویا وہ پوری طرح اسی کا ہو جاتا ہے۔ یہاں سادہ سی چیز کو دیکھنے کا زاویہ بالکل نیا ہے۔ زبان میں 'پیا، پی، پانی' کی تکرار اور صوتی ہم آہنگی پہیلی کو نغمہ بنا دیتی ہے۔ فکر کے اعتبار سے یہ پہیلی انسان کو اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ آئینہ دراصل ہماری اپنی شبیہ لوٹاتا ہے، گویا ہم ہی اپنے محبوب کو اپنے اندر دیکھ رہے ہیں۔

امیر خسرو کی پہیلیاں اردو عوامی ادب کا بنیادی سرمایہ ہیں۔ ان میں زبان کی شگفتگی، فطری پن اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ ان کے ذریعے امیر خسرو نے عوام اور خواص کے درمیان ایک فکری و لسانی رشتہ قائم کیا۔ ان پہیلیوں نے زبان کو نہ صرف مٹھاس عطا کی بلکہ ذہنی تفریح اور فکری بالیدگی کا بھی سامان کیا۔

ایک پیڑ ریتی میں ہوئے   بن پانی دئے ہرا وہ ہر ہوئے
پانی دیے سے وہ جل جائے   آنکھ لگے اندھا ہو جائے

آکھ کی پہیلی 3

ریت میں ہرا رہنے والا اور پانی ملتے ہی جل جانے والا پودا۔ یہ ہے آکھ۔ اس پہیلی میں فطرت کا باریک مشاہدہ جھلکتا ہے۔ کسانوں اور دیہات کے لوگوں کے تجربے کو خسرو نے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ آکھ کے دودھ یا رس کا نقصان اور آنکھ میں پڑنے پر اندھا پن پیدا کرنا سبھی دیہی زندگی کے علم کا حصہ ہیں۔ اس پہیلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو صرف دربار یا خانقاہ کی دنیا تک محدود نہیں تھے بلکہ دیہی فطرت اور اس کے اسرار پر بھی نظر رکھتے تھے۔ زبان کی مٹھاس، جیسے ریتی، بن پانی، جل جائے، ایک موسیقی پیدا کرتی ہے جو پہیلی کو گیت کی صورت دے دیتی ہے۔

آگ لگے پھولے پھلے سینچت جاوے سوکھ
میں تو یے بوجھوں اے سکھی پھول کے بھیتر روکھ

انار کی پہیلی (آتش بازی کا) 4

'آگ لگے پھولے پھلے، سینچت جاوے سوکھ، یہ انار کی آتش بازی پر مبنی پہیلی ہے۔ یہاں زرعی منطق الٹ دی گئی ہے۔ عام پودا پانی سے تر و تازہ اور آگ سے خشک ہوتا ہے مگر آتش بازی کے انار کو آگ ملے تو وہ کھل اٹھتا ہے اور پانی ملے تو بجھ جاتا ہے۔ یہی تضاد ذہن کو چونکا دیتا ہے۔ خسرو نے چنگاریوں کے بکھرنے کو 'پھول کے بھیتر روکھ' یعنی پھول کے اندر درخت قرار دیا، جو سراسر تخیل کا کمال ہے۔ اس میں فکری پہلو یہ ہے کہ ہر شے اپنی حقیقت کے مطابق پھلتی پھولتی ہے، ظاہری منطق سے نہیں۔

اچرج بنگلا ایک بنایا   اوپر نیو تلے گھر چھایا
بانس نہ بلی بندھن گھنے   کہو خسرو گھر کیسے بنے

بایا کے گھونسلے کی پہیلی 5

بایا کا گھونسلا قدرتی انجینئرنگ کی حیرت ہے۔ خسرو نے اس پہیلی میں دکھایا کہ نہ بانس ہے نہ بلی اور نہ کوئی بندھن، مگر گھونسلا اتنا پیچیدہ اور مضبوط ہے کہ انسانی ہنر بھی حیران رہ جائے۔ یہاں فکری رنگ یہ ہے کہ فطرت کا ہر جاندار اپنی بقا کے لیے کمال کی صنعت گری رکھتا ہے۔ لسانی سطح پر 'اچرج بنگلا' جیسا فقرہ گھونسلے کو ایک شاندار محل کی طرح پیش کرتا ہے۔

آدھ کٹے سے سب کو پالے   مدھ کٹے سے سب کو مارے
انت کٹے سے سب کو میٹھا   خسرو وا کو آنکھوں دیکھا

کاجل کی پہیلی 6

'آدھ کٹے سے سب کو پالے، مدھ کٹے سے سب کو مارے' اس پہیلی کے مختلف جوابات روایت میں ملتے

ہیں۔ آپ کے بیان کے مطابق اس کا جواب کاجل ہے۔ آنکھ کا حوالہ آتے ہی جواب واضح ہو جاتا ہے۔ خسرو نے 'آدھ، مدھ، انت' کی تکرار سے پہیلی کو کھیل بنا دیا ہے۔ یہ پہیلی بتاتی ہے کہ لفظوں کی ترتیب کس طرح معنی بدل دیتی ہے۔ فکری پہلو یہ ہے کہ کاجل ایک ہی وقت میں حسن اور زینت بخش بھی ہے اور نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے، اس طرح یہ انسانی زندگی کی دوہری حقیقت کی علامت بن جاتا ہے۔

ایک کہانی میں کہوں تو سن لے میرے پوت
بنا پروں وہ اڑ گیا باندھ گلے میں سوت

پتنگ کی پہیلی7

'بنا پروں وہ اڑ گیا، باندھ گلے میں سوت' یہ پہیلی پرواز کی ضدی منطق پیش کرتی ہے۔ پر کے بغیر اڑان ممکن نہیں لگتی مگر پتنگ ڈور کے سہارے فضا میں بلند ہو جاتی ہے۔ یہ فکری اشارہ ہے کہ ہر پرواز صرف جسمانی قوت سے نہیں ہوتی بلکہ کوئی اور سہارا بھی درکار ہوتا ہے۔ زبان میں 'کہانی، اور'پوت'، کے الفاظ اس کو گھریلو رنگ دیتے ہیں، گویا دادا پوتے کو قصہ سنا رہا ہے۔

ایک پُرکھ ہے دئی سنورا دنیا کا نستارن ہارا
وا کے چرنوں لاگ رہو زیادہ بچن نہ منہ سے کہو

نعت کی پہیلی8

'ایک پُرکھ دئی سنورا، دنیا کا نستارن ہارا' یہ پہیلی سراسر روحانی عقیدت سے لبریز ہے۔ اس کا جواب نعت ہے یا پھر براہ راست حضور اکرمؐ کی ذات۔ یہاں پہیلی کھیل نہیں عقیدت کا بیان بن جاتی ہے۔ خسرو نے اپنے زمانے کی روحانی فضا کو پہیلی کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ یہ پہیلی بتاتی ہے کہ ان کا فن دنیاوی اور روحانی دونوں جہتوں پر محیط تھا۔

اپنے سے سے اک پنچھی آئے
ٹک دیکھے اور پھر چھپ جائے
بوجھ کر اٹھیو قسم ہے تم پر
آگ بنا اجیارا دم پر

جگنو کی پہیلی8

جگنو کی روشنی لمحاتی ہے۔ خسرو نے اس کو اس طرح بیان کیا کہ 'اپنے سے سے آئے، آگ بنا اجیارا دم پر'۔ اس میں وقت کی پابندی اور روشنی کا لمحہ بھر کا ہونا واضح ہوتا ہے۔ فکری طور پر یہ پہیلی ناپائیداری اور لمحاتی جمال کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ زبان کی سادگی اور

امیر خسرو کی زبان میں دھلی کی بولی کی مٹھاس، عوامی محاورے کی برجستگی اور صوتی تکرار کی خوشبو ھے۔ پھیلیاں کبھی کھیل معلوم ھوتی ھیں، کبھی سبق دیتی ھیں اور کبھی روحانی واردات کا پتہ دیتی ھیں۔ لسانی اعتبار سے ان پھیلیوں میں اختصار، محاورہ بندی، تکرار اور صوتی ھم آھنگی نمایاں ھے۔ کھیں استعارہ ھے، کھیں تمثیل ھے اور کھیں تجسیم۔ فکری سطح پر ان میں مشاھدہ، فطرت کا علم، انسانی تجربہ اور روحانی بصیرت سب کچھ جمع ھے۔

'ٹک دیکھے، جیسے الفاظ اس کو لوک گیت کی طرح بنا دیتے ہیں۔

ایک منڈھی جوگی کے ہاتھ فکر پھریں ہیں بالک ساتھ
کھود بدن پر کاڑھے ہے اپنے آپ کو مارے ہے
کھود دیہی پر اپنی کھائے گاوے جوگی منڈھی بجائے

ڈگڈگی کی پہیلی9

جوگی کے ہاتھ میں بجنے والی ڈگڈگی کو خسرو نے نہایت تصویری انداز میں بیان کیا۔ 'کھود بدن پر کاڑھے ہے، اپنے آپ کو مارے ہے' جیسی تراکیب کھیل تماشے کا منظر سامنے لے آتی ہیں۔ اس میں فکری پہلو یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی چیز کس طرح مجمع کو محظوظ کرتی ہے۔ لسانی سطح پر 'ڈگڈگی' خود ہی ایک صوتی نقل ہے، جو سننے میں بجنے کی آواز پیدا کرتی ہے۔

اندر چلمن باہر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے
امیر خسرو یوں کہیں وہ دو دو انگل سر کے

قینچی کی پہیلی10

'اندر چلمن، باہر چلمن، بیچ کلیجہ دھڑکے' یہ پہیلی قینچی کو دو پردوں کی طرح بیان کرتی ہے۔ بیچ میں کلیجہ یعنی جڑ کا ذکر قینچی کے ڈھانچے کو انسانی جسم سے جوڑ دیتا ہے۔ یہ محض ایک گھریلو آلے کا بیان نہیں بلکہ ایک بصری تصویر ہے جو قاری کے سامنے قینچی کو نیا روپ دے دیتی ہے۔

ان تمام پہیلیوں کو دیکھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خسرو نے عام چیزوں کو غیر معمولی نظر سے دیکھا۔ ان کی زبان میں دہلی کی بولی کی مٹھاس، عوامی محاورے کی برجستگی اور صوتی تکرار کی خوشبو ہے۔ پہیلیاں کبھی کھیل معلوم ہوتی ہیں، کبھی سبق دیتی ہیں اور کبھی روحانی واردات کا پتہ دیتی ہیں۔ لسانی اعتبار سے ان پہیلیوں میں اختصار، محاورہ بندی، تکرار اور صوتی ہم آہنگی نمایاں ہے۔ کہیں استعارہ ہے، کہیں تمثیل ہے اور کہیں تجسیم۔ فکری سطح پر ان میں مشاہدہ، فطرت کا علم، انسانی تجربہ اور روحانی بصیرت سب کچھ جمع ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پہیلیاں صرف کھیل یا مشغلہ نہیں بلکہ لسانی حسن اور فکر کی بلندی کا عمدہ نمونہ ہیں۔

حواشی

1. عادل اسیر دہلوی، خسرو کی پہیلیاں، دہلی: ملک بک ڈپو، 2009، ص-8-7
2. سید یوسف بخاری دہلوی، ہماری پہیلیاں، پاکستان: ایچ، ایم، سعید کمپنی، 1978، ص-20
3. عادل اسیر دہلوی، خسرو کی پہیلیاں، دہلی: ملک بک ڈپو، 2009، ص-13
4. ایضاً، ص-14
5. ایضاً، ص-15
6. ایضاً، ص-19
7. ایضاً، ص-20
8. ایضاً، ص-23
9. ایضاً، ص-25
10. ایضاً، ص-28

ماخذ

1. سید یوسف بخاری دہلوی، ہماری پہیلیاں، پاکستان: ایچ، ایم، سعید کمپنی، 1978
2. ڈاکٹر وحید مرزا، امیر خسرو سوانح عمری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2006
3. گوپی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرہ اشپرنگر۔ سنگ میل پبلی کیشنز: لاہور 2008-
4. عادل اسیر دہلوی، خسرو کی پہیلیاں، دہلی: ملک بک ڈپو، 2009

■

S Anwar Hussain (Anwar Hadi Junaidi)
Research Scholar
Dept. of Arabic, Persian & Urdu
Sri Venkateshwara University
Tirupati - (Andhra Pradesh)
Cell: 7013282616
anwar.hadi786@gmail.com

ابراراحمد اجراوی

شکیل الرحمن کا تنقیدی موقف

مشہور جمالیاتی ناقد پروفیسر شکیل الرحمٰن (1931-2016) کا تنقیدی منہج و موقف دوسرے تنقیدی مکاتب فکر سے الگ اور ان کے مقابلے میں ذرا پیچیدہ تھا، جہاں تک رسائی کے لیے بہت مغز پچی کرنی پڑتی ہے کہ اس تنقیدی نظریے کی تفہیم وتفسیر بظاہر بہت مشکل ہے اور ایک وقت طلب کام ہے۔ ان کے تنقیدی افکار و خیالات سے بحث کرنے سے پہلے ایک نظر ان کے خاندانی اور تعلیمی پس منظر پر ڈالتے چلیں تاکہ قارئین نہ صرف ان کے تنقیدی موقف ومنہج سے واقف ہوسکیں، بلکہ ان کے آبائی پس منظر اور ان کے خاندان اور ان کی تعلیم گاہوں سے بھی مکمل طور پر آگاہ ہوجائیں۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن ضلع مشرقی چمپارن ریاست بہار کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام خان بہادر مولوی محمد جان مرحوم تھا۔ انھوں نے بڑی کد و کاوش سے ابتدا تا انتہا اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، پٹنہ یونیورسٹی جیسی اپنے وقت کی مشہور درس گاہ سے بی اے اور ایم اے فرسٹ کلاس کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ابتدا میں بھدرک اڑیسہ کے ایک ڈگری کالج میں لکچرر رہے، پھر کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر اور اردو شعبے کے صدر کے طور پر کام کیا۔ قسمت کی خوبی دیکھیے کہ اپنی انتظامی صلاحیت اور انصرامی قابلیت کی بنیاد پر وہ ایک نہیں، تین تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بنائے گئے، قسمت نے یاوری کی اور میدان سیاست کی وادی پرخار میں بھی قدم رکھا، جہاں اکثر پڑھے لکھے لوگ غچا کھاجاتے ہیں اور کامیاب نہیں ہوپاتے، مگر وہ اس میدان میں بھی کام یابی سے ہم کنار ہوئے، ممبر پارلیمنٹ رہے اور مرکزی حکومت میں کابینی وزیر بھی بنائے گئے۔

وہ جہان اردو میں ایک جمالیاتی ناقد کے طور پر مشہور ہیں اور یہ کہنا بجا اور قابل ستائش امر ہے کہ انھوں نے اردو ادب اور جمالیات کے موضوع پر ایک درجن سے زائد بنیادی اور اساسی کتابیں لکھی ہیں، جن میں ہندستان کا نظام جمال، ادب اور جمالیات، میر کی جمالیات، مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، ہندستانی جمالیات، اساطیر کی جمالیات، منٹوشناسی، امیر خسرو کی جمالیات، مولانا رومی کی جمالیات، جمالیات حافظ شیرازی، محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، بارہ ماسے کی جمالیات اور کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات بہت اہم، نتیجہ خیز اور قابل مطالعہ کتابیں ہیں۔ آشرم ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے، جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف پڑاؤ پر روشنی ڈالی ہے۔ شکیل الرحمٰن مرحوم کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں اور ان کے ادبی کارناموں اور تصنیفی و تالیفی خدمات کا بجا طور پر اعتراف بھی کیا گیا اور انھیں ہند و بیرون ہند سے کئی ایوارڈ اور اعزاز بھی ملے، جس کے وہ حق دار بھی تھے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن عصر حاضر کے اہم جمالیاتی ناقد تھے، انھوں نے ادب و تنقید کے میدان میں نفسیات کو اپنا رہنما بنایا۔ انھیں مشرقی شعریات کی جمالیات کا امام کہا جاتا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کو جمالیات کی جستجو اور جمالیات کا منبع کہا ہے کہ انسان تا عمر جمالیاتی اقدار و معیار کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ان کے مطابق فنون لطیفہ یا مناظر کائنات کے کسی بھی ذرہ کے اصل جوہر کی دریافت جمالیات کی مدد کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ انھوں نے اردو اور آرٹ کی تخلیق میں اساطیر کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ کیونکہ ہر اعلیٰ درجے کا ادب اساطیر کا ہی رہین منت ہوتا ہے۔

وہ ابتدا سے ہی مختلف النوع تنقیدی اور ادبی مضامین لکھتے رہے۔ جب وہ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہے تھے اور ابھی طالب علم ہی تھے کہ اسی زمانے میں ان کی ایک تنقیدی کتاب منظر عام پر آئی اور وہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو کے ادبی حلقوں سے داد و تحسین بھی وصول کرچکے تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 'ادب اور نفسیات' پٹنہ سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل تھے، اس سے ان کی ذہنی سطح، فکری مقام و مرتبہ اور علمی تہ داری کا پتہ تو چلتا ہی ہے کہ انھوں نے اس کتاب کے مضامین میں متنوع اور دلچسپ موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کے مشمولات کی بنیاد میں مارکسی فلسفہ کا عنصر بھی شامل تھا، جس میں مارکسی افکار و نظریات کا جذباتی اظہار بھی بخوبی ہوا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ابتدا میں ان کا رجحان مارکسی تنقید کی طرف ہی تھا، مگر بعد میں وہ نفسیاتی تنقید کی طرف متوجہ ہوگئے اور پھر اسی کوچے کے اسیر ہوکر رہ گئے۔ اردو ادب اور فسادات، ادب اور نفسیات، کلیم الدین احمد بہ حیثیت نقاد، سردار جعفری کا لال سلام، ترقی پسند ادب اور غزل، ادب کی جدلیاتی ماہیت، اردو افسانہ کا مستقبل، جوش کے سماجی شعور کا تجزیہ، تاغور [ٹیگور] کی شاعری پر ایک نظر، اردو ادب میں آزاد نظمیں اور اکبر کا آرٹ کے عناوین سے اس کتاب میں کل 11 مضامین شامل تھے۔ کتاب کی ابتدا میں اپنے عہد کے مشہور ترقی پسند ناقد پروفیسر احتشام حسین کی تحریر بھی موجود تھی۔ مگر یہ کتاب ان کی تنقیدی نظریہ سازی کا حوالہ قرار نہیں دی جاسکتی۔

شکیل الرحمٰن اپنی تنقید نگاری میں ینگ (Yung) اور اس کے افکار و خیالات سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اس کا جو نظریہ شعور و لاشعور تھا، اس کی عملی کیفیت، شکیل الرحمٰن کی کتاب 'غالب کی جمالیات' میں نمایاں ہوگئی ہے۔ اسی کو آرکی ٹائپی تنقید کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی تنقید سے کیا مراد ہے اور اس کے حدود اربعہ کیا ہیں، اس تعلق سے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ینگ

کا یہ خیال ہے کہ انسان کا ذہن مختلف خانوں میں منقسم ہے۔ یہ خانے یکساں بھی نہیں ہیں کہ ان پر ایک حتمی حکم لگا دیا جائے اور سکوت اختیار کرلیا جائے بلکہ یہ خانے مختلف قسم کے اثرات کو مختلف سطحوں پر سمیٹے ہوئے ہیں۔ انسانی ذہن و دماغ میں اسی طرح کا ایک خانہ نسلی لاشعور کا بھی ہے۔ اس نسلی لاشعور والے خانے میں ہمارے اسلاف اور پرکھوں کے جو تجربات ہیں وہ ورثے کے طور پر انسانوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ خاندانی رجحان و میلان دراصل اس نسلی اور اجتماعی لا شعور کا مظہر ہوتا ہے، جو وراثت کے طور پر خاندان در خاندان اور نسل درنسل منتقل ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسلی لاشعور کوئی الگ شے نہیں، وہ دراصل اجتماعی لاشعور ہی ہے۔ اب ایک فرد جو اتفاق سے ایک فن کار و تخلیق کار بھی ہے، جب کسی تخلیقی مرحلے سے گزر رہا ہوتا ہے تو نسلی لاشعور یا اجتماعی لاشعور کے تجربے ایک بہاؤ کی کیفیت اختیار کر کے متعلقہ فن کار و تخلیق کار کے ادب پارے میں فطری طور پر در آتے ہیں۔

(اعجاز علی ارشد، (ڈاکٹر) بہار میں اردو تنقید، دی آرٹ پریس پٹنہ، 1981، ص 71)

اردو میں آرکی ٹائپی تنقید کو شکیل الرحمٰن کے علاوہ دوسرے نقادوں نے بھی اختیار کیا ہے اور اپنے تنقیدی نظریات کی تشکیل و تفہیم میں اس کو برتا ہے، اس حوالے سے کئی ایک اہم نام ملتے ہیں۔ وہ اپنی تنقید میں ذاتی یا انفرادی نفسیاتی جہتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے، لیکن اجتماعی لاشعور کو برتنے کی سعی میں مصروف رہے ہیں۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد کے مطابق اردو تنقید میں یہ آرکی ٹائپی رویہ محض شکیل الرحمٰن نے نہیں اپنایا، بلکہ اس قسم کے نقادوں میں محمد حسن عسکری، وحید قریشی، شبیہ الحسن نونہروی، دیویندر اسر اور ممتاز مفتی وغیرہ کے نام بھی اہم ہیں۔

آرکی ٹائپ کیا ہے، اس عملی عمل تنقید اور نظریۂ نقد کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر شکیل الرحمٰن خود اپنی کتاب 'غالب کی جمالیات' میں لکھتے ہیں:

''آرچ ٹائپ انسانی ذہن کا ایک مخصوص عمل ہے، ہم عموماً ان کے وجود سے بے خبر رہتے ہیں۔ جب تک کچھ حسی اور نفسی لہریں انھیں نہیں چھوتیں، اس وقت تک ان کا عمل شروع نہیں ہوتا۔ آرچ ٹائپ کے عمل سے وہ حیاتی پیکر نت نئی تصویروں میں ابھرنے لگتے ہیں جو نسلی لاشعور یا اجتماعی شعور میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان پیکروں اور تصویروں کے ساتھ ایک طرف نسلی شعور کے سایے ہوتے ہیں اور دوسری طرف عہد جدید کے مخصوص تصورات اور تجربات دونوں جذب ہو جاتے ہیں۔ آرٹ ان ہی حیاتی پیکروں کو پیش کرتا ہے۔''

(شکیل الرحمٰن (ڈاکٹر) غالب کی جمالیات، عصمت، پبلی کیشنز کشمیر، 1969، ص 25)

شکیل الرحمٰن صاحب کی اہم تنقیدی کتابیں درج ذیل ہیں۔ ابوالکلام آزاد، اختر الایمان جمالیاتی لجنڈ، ادب اور نفسیات، ادب کی جمالیات، اقبال، اقبال اور فنون لطیفہ، امیر خسرو کی جمالیات، ایک علامت کا سفر، بارہ ماسے کی جمالیات، غالب کی جمالیات، فراق کی جمالیات، کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات، میر تقی میر کی جمالیات، ہندوستانی جمالیات وغیرہ۔ شیخ عقیل احمد نے ان کے اسی قسم کے مضامین کا مجموعہ 'ادب اور جمالیات' کے عنوان سے جو ترتیب دیا ہے، اس کے اکثر مضامین جمالیات کے باب میں خشت اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اساطیر جمالیات، امیر خسرو کی جمالیات، قلی قطب شاہ کی جمالیات، روشنی کی جمالیات، ترجمان القرآن کے اسلوب کا جمالیاتی معیار، فراق کی جمالیات اہم مضامین ہیں۔

جمالیات کیا ہے؟ اس کا سر اور سرا اور غرض و غایت کیا ہے؟ عالمی ادبیات کے حوالے سے اس کی تشریح و تعبیر کرنے کے بعد شکیل الرحمٰن صاحب خود اپنے قلم سے لکھتے ہیں کہ جمالیات کا تعلق انسان اور انسانی سماج سے ہے، اس کا ربط و تعلق انسان کے حواس خمسہ سے ہے، اس کے شعور اور لاشعور سے ہے۔ انسان اور انسانی سماج عمر بھر حسن و جمال کی تلاش و جستجو ہی میں مصروف رہا ہے، خالق کائنات کا حسن و جمال ہو یا سماجی زندگی کا، اپنی ذات کا حسن و جمال ہو یا دوسرے افراد کا، حیات و کائنات کا حسن و جمال ہو یا فطرت کے جلال و جمال کا، زندگی کا حسن و جمال ہو یا موت کا، فنون لطیفہ میں تو ان سب کے تجربے پیش ہوئے ہیں۔ وہ 'ترِی مورتی' ہو یا 'نت راج'، وینس کا پیکر ہو یا بدھ کا مجسمہ، تاج محل، اجنتا ایلورا ہو یا حافظ، کبیر اور غالب، ڈیوائن کامیڈی، میک بتھ اور شاہنامہ فردوسی ہو یا عجمی اور مغل آرٹ۔ ان سبھی میں جمالیات کا عنصر موجود ہے۔

شکیل الرحمٰن نے مرزا غالب کو بھی اس عملی تنقید کی رو سے جانچا اور پرکھا ہے اور اس کی بنیاد پر اہم اور مفید نتائج اخذ کیے ہیں۔ غالب کے آریائی لاشعور، غالب کے آتشی پیکر اور ان کے پیکروں کی آزاد صورتوں کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ یعنی غالب کے محسوسات کے جہان کو ان کے اجتماعی لاشعور میں دیکھنے کی انھوں نے کوشش کی ہے۔ ان کے ایک شعر۔

ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہ ہو

کی روشنی میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے نظریۂ تنقید کو خاصا نمایاں کرتا ہے:

''غالب اس دل کو سینے کے لیے باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں جو آتش کدہ نہ بن گیا ہو... یہ عشق کی آگ ہے، وجود اور روح کی گہرائی میں عشق کی آگ جل رہی ہے، اس آرکی ٹائپ نے دل کو آتش کدہ بنادیا ہے۔ سانسوں میں آتش کا سیلاب بھی نظر آتا ہے اور شاعر کے پرزور اور متحرک لاشعور کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ وجود کی گہرائیوں میں جو آتش کدہ ہے اس کا تعلق ظاہری حسن سے گہرا ہے۔ عشق اور حسن اور عاشق اور محبوب کے رشتے پر نظر رکھیے، اسی تخلیقی رشتے سے غالب کی جمالیات کے ایک معانی خیز پہلو کو سمجھا جاسکتا ہے۔''

(غالب کی جمالیات، ص 123)

دوسرے ناقدین نے بھی شکیل الرحمٰن کے نظریۂ نقد و انتقاد کو اپنانے کی کوشش کی ہے، مگر وہ اس نظریہ تنقید کا ساتھ زیادہ دیر تک دیتے ہوئے نظر نہیں آتے اور نہ ہی اس کی توضیح و تشریح میں اس طرح کا انہماک و انشغال نہیں ہے جس طرح کا انہماک و انشغال پروفیسر شکیل الرحمٰن نے دکھایا ہے۔ ان کا نظریہ تنقید پیچیدہ ضرور تھا، تاہم ناقابل فہم نہیں تھا۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شکیل الرحمٰن صاحب مرحوم کا جو تنقیدی نظریہ تھا، وہ پہلے سے اردو میں رائج نہیں تھا۔ یہ تنقید کی ایک نئی لہر تھی، یہ تنقید کا ایک نیا نظریہ تھا، جو ان کا ایجاد کردہ تھا اور دوسرے نقادوں اور ادیبوں کے لیے حیرانی و پریشانی کا سبب بنتا تھا اور جس کی تفہیم و تفسیر اور توضیح و تشریح بھی ذرا مشکل تھی۔ ان کا طرز بیان اور انداز و اطوار بھی کھلا اور واضح نہیں، بلکہ ذرا پیچیدہ اور مبہم تھا، اس لیے وہ اپنے نظریات کی ترسیل و تفہیم میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اپنے نظریے کے حوالے سے وہ اپنی بات قارئین تک پہنچانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

■

Abrar Ahmad
Department of Urdu
Forbesganj College Forbesganj
Araria - 854318 (Bihar)
Mob.: 9910509702
abrarahmadijravi@gmail.com

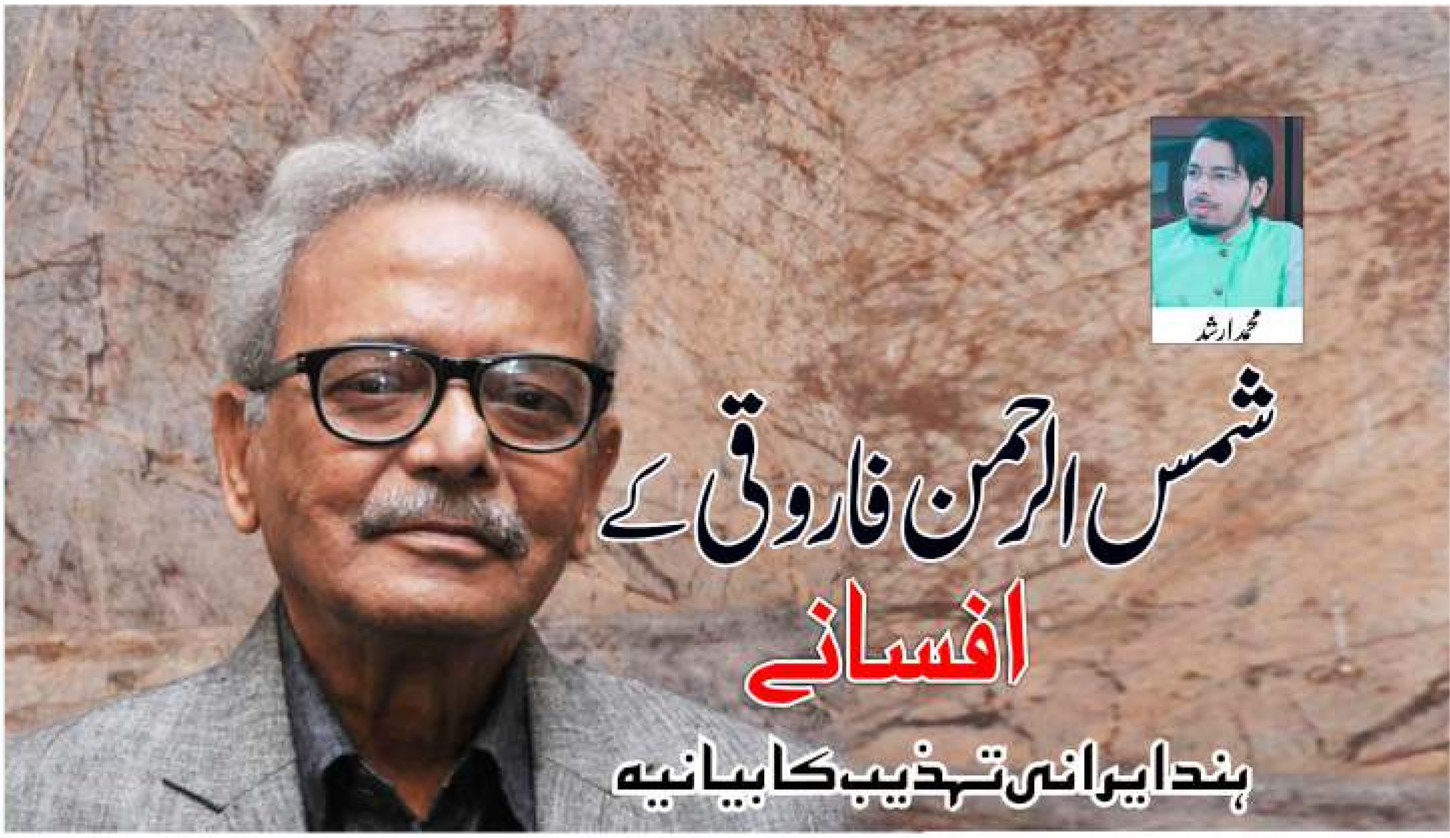

محمد ارشد

شمس الرحمن فاروقی کے افسانے

ہند ایرانی تہذیب کا بیانیہ

شمس الرحمٰن فاروقی نے ادبی دنیا میں نقاد اور جدیدیت کے بنیاد گزار کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ افسانے اور ناول کی شکل میں جب ان کی تخلیقات منظر عام پر آئیں تو قارئین اور ناقدین نے یہ تسلیم کیا کہ تنقید نگار فاروقی ایک بہترین تخلیق کار بھی ہیں۔ تنقید کی طرح تخلیق میں بھی انھوں نے عام روایت سے ہٹ کر الگ موضوعات و اسالیب کا انتخاب کیا۔ اہل ادب اس امر سے واقف ہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی زندگی کا آغاز تخلیق سے ہوتا ہے۔ باضابطہ تنقید کی طرف آنے سے قبل، بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں انھوں نے کئی افسانے لکھے جو الہ آباد یونیورسٹی میگزین اور بعض مقامی رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ ایک ناولٹ 'دلدل سے باہر' 1950 یا 1951 میں رسالہ 'معیار' میرٹھ کے چار شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔ اسی زمانے میں انھوں نے 'سرخ آندھی' کے نام سے بھی ایک افسانہ لکھا جو سویت روس میں مذہب پر استبداد کے موضوع پر تھا۔ ان کے مربی، غلام مصطفیٰ خان رشیدی نے وہ افسانہ بہت پسند کیا اور اردو کے ان کے ایک استاد شمس الآفاق شمس گورکھپوری نے اسے پڑھ کر فرمایا تھا کہ یہ تو کسی بہت بڑے افسانہ نگار کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ فاروقی نے افسانہ 'سرخ آندھی' کا انگریزی ترجمہ 'The Scarlet Tempest' کے نام سے کیا جو اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کی میگزین میں شائع ہوا۔ اس کے متعلق وہ خود تحریر کرتے ہیں:

''جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں ایم اے کے آخری سال میں تھا (1954/55) تو ایک دن میرے جی میں آئی کہ اگر افسانہ 'سرخ آندھی' اتنا ہی عمدہ ہے جتنا شمس الآفاق صاحب کہتے تھے تو اسے انگریزی میں ترجمہ کرکے یونیورسٹی میگزین میں کیوں نہ دے دوں؟

شمس الرحمن فاروقی نے ادبی دنیا میں نقاد اور جدیدیت کے بنیاد گزار کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ افسانے اور ناول کی شکل میں جب ان کی تخلیقات منظر عام پر آئیں تو قارئین اور ناقدین نے یہ تسلیم کیا کہ تنقید نگار فاروقی ایک بہترین تخلیق کار بھی ہیں۔ تنقید کی طرح تخلیق میں بھی انھوں نے عام روایت سے ہٹ کر الگ موضوعات و اسالیب کا انتخاب کیا۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ میگزین کے ایڈیٹر میرے استاد، کے۔ کے ملہوترا صاحب تھے، میں جن کے مداحوں میں تھا۔ میں نے جھٹ پٹ ترجمہ کرکے افسانے کا انگریزی عنوان 'The Scarlet Tempest' رکھا۔ ٹائپ وغیرہ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا، ہاتھ سے لکھ لکھا کر میں نے افسانہ ان کے حوالے کیا اور میری توقع کے بالکل خلاف انھوں نے بھی اسے پسند کیا اور اسی عنوان سے چھاپ دیا۔ بعد میں مجھے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے میں 'CrimsonTempest' کا فقرہ نظر آیا تو مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ عنوان کیوں نہ رکھا۔ بہر حال! اب میرے پاس اس افسانے کا اردو مسودہ ہے نہ انگریزی اور نہ الہ آباد یونیورسٹی میگزین کا وہ شمارہ جس میں 'The Scarlet Tempest' چھپا تھا۔''[1]

شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری کا یہ دور آغاز تھا۔ اس زمانے میں جو بھی افسانے ان کے قلم سے وجود میں آئے وہ ان سے مطمئن نہیں تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ جس طرز کا افسانہ وہ لکھنا چاہ رہے تھے اس کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے جب 'شب خون' کا سلسلہ شروع کیا، یعنی تقریباً دو دہائی کے بعد تو وہ ایک بار پھر افسانے کی طرف مائل ہوئے۔ اب انھوں نے 'ہند اسلامی تہذیب کی بازیافت' کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ شروع میں فرضی ناموں سے کچھ افسانے لکھے اور پھر متواتر کئی اور افسانے منظر عام پر آئے جو مذکورہ

موضوع کو محیط تھے۔ قارئین کو شک گزرا کہ بنی مادھو رسوا، عمر شیخ مرزا اور جاوید جمیل جیسے فرضی ناموں کے پیچھے شاید شمس الرحمٰن فاروقی ہیں کہ اس نوعیت کے افسانے وہی لکھ سکتے ہیں۔ 2001 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'سوار اور دوسرے افسانے' جب شائع ہوا تو شک پر یقین کی مہر ثبت ہوگئی کہ ان افسانوں کے خالق فاروقی ہی ہیں۔ انھوں نے مذکورہ مجموعہ کے دیباچے میں ان اسرار و رموز کی وضاحت کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان افسانوں کی تخلیق کے کیا محرکات تھے۔

'سوار اور دوسرے افسانے' کی اشاعت کے بعد ان کے دو ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں اور قبض زماں' منظر عام پر آئے جن میں اول الذکر نے ادبی دنیا میں خاصی ہلچل پیدا کی۔ اس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے، یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن ان ناولوں میں بھی ادبی تاریخ اور ہند اسلامی تہذیب کی بازیافت ہی محور و مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں فاروقی کی ناول نگاری پر بات نہ کرکے 'سوار اور دوسرے افسانے' کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی۔

زیر نظر مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری کا جائزہ ہند اسلامی تہذیب کی روشنی میں لیا جائے گا اس لیے ضروری ہے پہلے یہ جان لیا جائے کہ 'ہند اسلامی تہذیب' کیا ہے؟ بقول عماد الحسن آزاد فاروقی ''1206 میں دہلی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہندوستان کے دروازے جس اسلامی تہذیب و تمدن کے استقبال کے لیے کھلے وہ اپنے آپ میں مختلف تہذیبوں کے خمیر اور مختلف الاصل عناصر کی ترکیب سے تیار ہوئی تھی، اس میں عرب کا سوز دروں اور عجم کا حسن دونوں شامل تھا۔ خود ہندوستان میں جس تہذیب سے اس کا ساتھ ہوا وہ اس سے کہیں زیادہ قدیم تھی اور اسی نوع کے ارتقائی عمل سے گزر کر اپنی پختہ عمر کو پہنچ چکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب دونوں تہذیبوں یعنی ہندی اور ایرانی میں اخذ و قبول اور تہذیبی لین دین کا سلسلہ شروع ہوا تو اس مخصوص تمدن کی بنیاد پڑی جو بعد میں ہند ایرانی تہذیب کی صورت میں اس ملک کے لیے مایہ افتخار رہا۔ سیاسی سطح پر ہندوستان کے مقامی باشندوں کا بیرونی حکومت کے ساتھ اشتراک و تعاون بعد کی سماجی، ادبی، علمی و فنی زندگی میں دونوں قوموں کے ایک دوسرے کے اثرات قبول کرنے اور ایک ملی جلی تہذیب کے فروغ دینے کی تمہید تھی۔ ایرانی تہذیب کے ہمہ جہتی بناؤ میں دونوں تہذیبوں کے ملاپ سے ہندوستان میں جو تمدنی ترقی ہو رہی تھی، اس میں اس تمدنی رنگا رنگی کے علاوہ تہذیبوں کے اس سنگم سے فنون لطیفہ کو جیسا فروغ اور فن کی جیسی بلندیاں حاصل ہوئیں وہ تہذیب و تمدن کے کسی اور گوشے کے حصے میں نہیں آئیں۔''2

> **شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری کے متعلق یہ سوالات بھی قائم کیے گئے کہ علامتی اور تجریدی اسلوب کی حوصلہ افزائی کرنے والے جدیدیت کے نقیب نے بھی بیانیہ اسلوب کا ہی سہارا لیا اور کلاسیکیت میں ہی پناہ لینی پڑی۔ ایسا کیوں؟ فاروقی کے یہاں اس کی توجیہہ یہ ملتی ہے کہ افسانے کا کوئی ایک متعینہ اسلوب نہیں ہے کہ اسی پر اصرار کیا جائے۔ افسانہ نگار کو آزادی ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں کہ جو نمونہ پریم چند اور سعادت حسن منٹو نے بنا دیا اسی کے پابند ہوکر رہ جائیں۔**

شمس الرحمٰن فاروقی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کو ہند ایرانی تہذیب کا زریں باب سمجھتے ہیں۔ اس عہد میں فارسی، اردو، تصوف، ادب، موسیقی، فنون حرب و ضرب اور علوم عقلیہ و نقلیہ کا جو فروغ ہوا ہے اس کی مثال پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ اس دور کی دِلّی کو محض بدامنی، طوائف الملوکی، زوال اور انتشار کا استعارہ سمجھا جاتا ہے مگر فاروقی اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کی ادبی تہذیب صحیح معنوں میں اپنا رنگ اور طور طریق محمد شاہ، احمد شاہ اور پھر شاہ عالم ثانی کے زمانے میں حاصل کرتی ہے۔ سیاسی قوت اس شہر کی بھلے ہی زوال کا شکار ہوگئی ہو لیکن اس کی تہذیب زوال آمادہ اور انحطاط آلودہ نہ تھی اور کئی بار اجڑنے کے بعد بھی دِلّی کی گلیوں میں اس زمانے کی حسین ترین رقاصائیں ناچتی تھیں۔ دِلّی کا چھوٹا سا نمونہ آصف الدولہ کے وقت سے لے کر واجد علی شاہ کا لکھنؤ تھا۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ وہ صدی ادبی اور تہذیبی زوال کی صدی تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے افسانوں کے توسط سے اس مخصوص عہد کی تہذیب و ثقافت اور زبان و اسلوب کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں بطور خاص اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی پوری ادبی تاریخ اور تہذیب جلوہ گر نظر آتی ہے جسے فاروقی ہند ایرانی تہذیب سے موسوم کرتے ہیں۔ ادبی تاریخ اور سماجی ثقافت کے باقیات کی بازیافت ان کے افسانوں کا مرکزی نقطہ ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری کے متعلق یہ سوالات بھی قائم کیے گئے کہ علامتی اور تجریدی اسلوب کی حوصلہ افزائی کرنے والے جدیدیت کے نقیب نے بھی بیانیہ اسلوب کا ہی سہارا لیا اور کلاسیکیت میں ہی پناہ لینی پڑی۔ ایسا کیوں؟ فاروقی کے یہاں اس کی توجیہہ یہ ملتی ہے کہ افسانے کا کوئی ایک متعینہ اسلوب نہیں ہے کہ اسی پر اصرار کیا جائے۔ افسانہ نگار کو آزادی ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں کہ جو نمونہ پریم چند اور سعادت حسن منٹو نے بنا دیا اسی کے پابند ہوکر رہ جائیں۔ کئی طرح کے اسلوب ہیں، بس افسانہ نگار کو انھیں استعمال کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ ہر موضوع کو ایک ہی ہیئت میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ موضوع کے اعتبار سے اسلوب میں تبدیلی کوئی عیب نہیں ہے۔ فاروقی اپنے بیانیہ کے ذریعے جس ہند ایرانی تہذیب کی بازیافت کی سعی کر رہے ہیں اور عہد ماضی کو اس کے تمام حقیقی رنگوں کے ساتھ دکھانا چاہ رہے ہیں تو ظاہری بات ہے کہ تجریدی اور علامتی افسانے اس کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ رقم طراز ہیں:

''میں اس تہذیب کے بارے میں لکھ رہا ہوں جس کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے وہ ہے ہی نہیں، اکثر لوگوں کے خیال میں وہ کبھی تھی ہی نہیں، اس کو میں کسی صورت سامنے لانا چاہتا ہوں۔ بتا رہا ہوں کہ وہ

تہذیب اس طرح سے تھی، لوگوں کی داخلی زندگی تھی، وہ عقل وشعور رکھتے تھے، عشق کے بارے میں ان کے تصورات تھے، یہ نہیں کہ ہمارا کوئی ماضی ہی نہیں تھا۔ ہم بالکل جاہل، اجڈ اور غیر ترقی یافتہ تھے۔ ہم نے تو دنیا دیکھی نہیں تھی، جب نیا زمانہ آیا تو ہماری آنکھ کھلی۔ میں نے بتایا کہ نہیں، ہماری بھی ایک زندہ تہذیب تھی۔ اگر ان باتوں کے لیے انور سجاد یا سریندر پرکاش کا اسلوب اختیار کروں تو سامنے ہی کچھ نہیں آئے گا۔ وہ جس تہذیب کے افسانے ہیں وہ اپنی جگہ درست اور معتبر اور میں جس تہذیب کے بارے میں لکھ رہا ہوں وہ بھی درست اور معتبر لیکن فرق یہ ہے کہ وہ تہذیب زندہ ہے اور میں جس تہذیب پر لکھ رہا ہوں وہ زندہ نہیں ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کا کوئی نقش نہیں ہے۔''3

شمس الرحمٰن فاروقی جہاں ہند ایرانی تہذیب کو فکشن کے بیانیہ میں بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹتے ہوئے نظر آتے وہیں فن کی اس باریکی کا خیال بھی رکھتے ہیں کہ طبع زاد فکشن کے برعکس تاریخی فکشن میں تخیل کو بے لگام نہیں چھوڑا جاتا، بلکہ ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ بیانیہ تاریخ کے علم کے تابع رہے۔ اس لیے وہ تخیل کو حسب ضرورت بروئے کار لاتے ہیں۔ فاروقی کی اس فنکاری کے متعلق معروف ناول نگار رحمٰن عباس لکھتے ہیں:

''فاروقی کے افسانوی تخیل نے ادبی ثقافت کے ٹھوس اور جامد حقائق کو تاریخی ماخذات کی چھان بین کے ساتھ فارسی وعربی الفاظ کی سحر کاری اور اس کے متصوفانہ رجحانات وسیاسی اتار چڑھاؤ کے سہارے بیان کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس ادبی ثقافتی تاریخ کے لسانی اسالیب اور عربی وفارسی آمیز اردو سے تو بے شمار لوگ واقف تھے اور ان پر علیحدہ کام بھی کیے گئے مگر تخلیقی شعور کے تجزیے اور ثقافتی تاریخ کو فکشن کے روپ میں اس جامعیت سے پہلے پیش نہیں کیا گیا تھا۔''4

سوار اور دوسرے افسانے میں اردو ادب کے معروف شعرا مرزا غالب، غلام ہمدانی مصحفی، میر تقی میر اور علامہ اقبال زندہ کردار کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ہم ان کرداروں کے سہارے اس عہد کی ادبی، تہذیبی اور تاریخی صورتحال سے روبرو ہوتے ہیں۔ زمان و مکان اور زبان واسلوب میں جو ہم آہنگی ہے اس نے بیانیہ کو دلکش اور موثر کن بنادیا ہے۔ دوران قرأت یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسی عہد میں جی رہے ہیں۔ وہی لوگ، وہی زبان اور وہی لب ولہجہ۔ فاروقی نے فارسی آمیز اردو اور اس عہد زریں کے اسلوب ولہجے کو اپنے فکشن میں حیات نو عطا کردی ہے۔ ان کے افسانوں کے تمام کردار اپنے عہد کی قابل رشک تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا طرز گفتگو، نشست وبرخاست، رہن سہن، وضع قطع اور لباس و پوشاک ہر ایک شے میں ان کی تہذیبی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں صرف دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''شام ڈھلنے کے ذرا پہلے میں نے لباس تبدیل کیا۔ مچھلی کے چھلکوں کی ٹوپی سر پر جمائی اس پر رنگین پگڑی باندھی، کانوں میں موتی کے بالے ڈالے، ریشمی دھوتی کے نیچے پاؤں میں بانے پہنے، جودھپوری جوتیاں پہنی۔ پھر ساز سینگڑا لگا کر اپنے دادا مرحوم کی بنائی ہوئی گٹھری کاندھے سے لٹکائی۔ میں اپنے قریبی قصبہ مبارک پور سے مرزا صاحب قبلہ کے لیے دو ریشمی لنگیاں اور دو ہی ریشمی پگڑیاں بطور خاص بنوا لایا تھا۔ میرے وطن نظام آباد کی مٹی کے کچھ برتن، مثلاً چلمیں اور فرشیاں بھی تھیں۔ ان کو خوان پر رکھوایا، اسی پر کتاب بھی رکھ کر سائیس کے حوالے کیں۔ مشالچی کو آگے کیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر چلا۔''5

''میرے لیے تو آپ مسیحائے شوق ہیں اور آپ کا بلاوا جنبش داماں ہے، جس نے میری خاکستر کو پھر سے روشن کردیا۔ بندہ آپ کی کرم گستری کے لیے دل سے ثنا خواں ہے۔

خوب! انشاء اللہ بشرط وفاداری تم ہمیں بھی اپنا پشتی بان پاؤ گے۔ کہو ادھر کچھ کہا؟ جی چاہے تو سناؤ۔

عالی جاہا! اس دربار میں طلبی کے انبساط نے کل رات دل گرفتہ کو وا کردیا تو یہ رباعی موزوں ہوئی۔ پھر میر نے انوکھے، سادہ اور دلکش انداز میں، کچھ متبسم لبوں کے ساتھ رباعی پڑھی۔''6

فاروقی نے منظر کشی اور مکالمہ نگاری میں بھی فنکاری کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ گذری ہوئی دو صدیاں پورے رنگ و روپ کے ساتھ قاری کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ افسانہ 'غالب' میں، غالب کا سراپا اور ان کے فکر وفن کو کلاسیکی زبان و بیان اور فکشن کے اسلوب میں اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے جسد غالب میں روح پھونک دی گئی ہو۔ افسانے میں جہاں اس عہد کی ادبی تہذیب اور سیاسی ماحول کی منظر کشی کی گئی ہے وہیں غالب کے ساتھ بنی مادھو رسوا کا کردار اس عہد کی ثقافتی ہم آہنگی کو بھی پیش کرتا ہے۔ بنی مادھو کے بجائے یہاں کوئی مسلم کردار ہوتا تو شاید ثقافتی یکجہتی کی تصویر اتنی نمایاں نہیں ہوتی۔ یہ رنگ 'آفتاب زمیں' میں بھی نظر آتا ہے جہاں مصحفی کے ساتھ بھورا بیگم اور درباری مل وفا جیسے حقیقی کردار پیش کیے گئے ہیں جو مشترکہ تہذیب کی علامت ہیں اور اس عہد کے ادبی اقدار اور روایات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بدھ سنگھ قلندر اور رائے کشن چند اخلاص جیسے کرداروں کی پیشکش کے ذریعے ہندوستان کے معاشرتی، لسانی اور تہذیبی میل جول کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔

''سارا شہر ہلکے پستئی زرد رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان، بسنت کا ذوق سب کو تھا۔ سلطان جی کی بارگاہ پر بسنتی کپڑے پہنے عورتوں مردوں کے جھنڈ شام وسحر نظر آتے تھے۔ پہلے مسلمانوں کو اس موسم اور اس کے میلوں سے رغبت نہ تھی۔ لیکن حضرت سلطان جی اور امیر خسرو کا تعلق بسنت کے تہوار سے قائم ہوا تو چیت کے مہینے کا وسط ہوتے ہوتے دہلی کے سارے مسلمان بسنتی رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ چاندرات ہی سے بسنت چڑھانے کی تقاریب کا سلسلہ شروع

فاروقی نے منظر کشی اور مکالمہ نگاری میں بھی فنکاری کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ گذری ہوئی دو صدیاں پورے رنگ و روپ کے ساتھ قاری کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں۔افسانہ 'غالب' میں، غالب کا سراپا اور ان کے فکر وفن کو کلاسیکی زبان و بیان اور فکشن کے اسلوب میں اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے جسد غالب میں روح پھونک دی گئی ہو۔

ہو جاتا۔''[7]

افسانہ 'غالب'، 'سوار'، 'ان صحبتوں میں آخر' اور 'آفتاب زمیں' میں پوری دِلّی اور کسی قدر لکھنؤ پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ غالب، میر، مصحفی اور خود شہر دِلّی اس کے حقیقی اور مرکزی کردار ہیں۔ ان افسانوں کے حوالے سے فاروقی کہتے ہیں:

''دِلّی کا حق تھوڑا بہت ادا کرنے کے لیے میں نے پہلے میر کے بارے میں افسانہ نہیں لکھا، بلکہ 'سوار' لکھا۔ میرے اپنے حساب سے اس افسانے کا مرکزی کردار خود شہر دہلی ہے جس کے بغیر نہ وہ پراسرار سوار ہوتا، نہ بدھ سنگھ قلندر، نہ عصمت جہاں اور نہ افسانے کا راوی مولوی خیر الدین۔ ان سب کی شخصیتیں دِلّی کی شخصیت کا ذرا ذرا سا ٹکڑا ہیں۔ پھر 'سوار' کے بعد مجھے 'ان صحبتوں میں آخر' لکھنا ہی تھا اور وہاں بھی جیسا کہ بہت سے پڑھنے والوں نے محسوس کیا صرف میر نہیں ہیں۔ اس کے بعد 'آفتاب زمیں' آتا ہے جس میں دہلی کی جھلک بھی ہے اور دہلی کی اولاد معنوی یا اس کے جانشین کے طور پر لکھنؤ دھیرے دھیرے خود کو قائم کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے شجاع الدولہ اور سعادت علی خان کا خون گرم برق خرمن بن گیا۔ اس کی طرف کچھ اشارے غالب افسانہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔''[8]

'لاہور کا ایک واقعہ' یہ افسانہ دیگر تمام افسانوں سے اسلوب اور موضوع ہر لحاظ سے مختلف ہے۔ گو کہ اس میں ہند ایرانی تہذیب کی وہ فضا نہیں پائی جاتی مگر بدلتی ہوئی تہذیبی صورتحال اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے ادبی ماحول کو تخلیقی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس افسانے میں وجودی اور علامتی رنگ جھلکتا ہے جو جدیدیت کے اہم عناصر ہیں۔ افسانے کے مرکزی کردار کا علامہ اقبال سے ملاقات کے لیے جانا، کچھ شریر لڑکوں کا راستہ روکنا، گاڑی کا اسٹارٹ نہ ہونا، ملگجی قمیض والے کا پستول دکھانا اور راوی کا گھر میں چھپنا، کسی سیاہ چیز کے کمرے میں داخل ہونے پر خواتین کا بے ہوش ہونا اور آخر میں اپنی کار چھوڑ کر تانگہ سے واپس شہر لوٹنا۔ یہ انسان کی اپنی شناخت کے چھن جانے کی طرف اشارہ ہے اور اپنے وجود کے تحفظ کی فکر کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ یہ افسانہ ایک خواب پر مبنی ہے جو مصنف نے دیکھا اور اس میں بغیر کسی حذف واضافے کے مگر ایک انجام متصور کر کے فکشن کے قالب میں ڈھال دیا۔ فاروقی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ 'لاہور کا ایک واقعہ' 'افسانہ غالب' کی طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دیگر افسانوں کے بالمقابل اس میں ادبی تاریخ اور ہند ایرانی تہذیب کی گونج مدھم تھی مگر یہ افسانہ بھی اسی ادبی اور تہذیبی سلسلے سے مربوط ہے۔

افسانوں کی ترتیب میں بھی مصنف کا تنقیدی اور تحقیقی ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔ شب خون میں اشاعت کی ترتیب کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو پہلے افسانہ غالب، لاہور کا ایک واقعہ، سوار، ان صحبتوں میں آخر اور پھر آفتاب زمیں ہونا چاہیے۔ زمانی اعتبار سے (ماضی سے حال) اگر ترتیب دیا جائے تو درست ترتیب یہ ہوگی۔ سوار، ان صحبتوں میں آخر، آفتاب زمیں، افسانہ غالب اور لاہور کا ایک واقعہ۔ مگر مجموعے میں اس ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے 'افسانہ غالب' میں ادبی تہذیب کے اس زمانے کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو زوال پذیر ہے۔ 'سوار' اور 'ان صحبتوں میں آخر' کے ذریعے اس عہد زریں کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں جب شہر دِلّی میں ہند ایرانی تہذیب پورے شباب پر تھی۔ 'آفتاب زمیں' میں دِلّی کے ساتھ لکھنؤ کی ادبی اور تہذیبی فضا کو پیش کیا گیا ہے اور لاہور کا ایک واقعہ، اس میں تہذیبی رنگ قدرے مختلف ہے کیونکہ اب اقدار وروایات تبدیل ہو رہے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کا دائرہ کار بڑھ رہا ہے اور پرانی تہذیبیں اپنی شناخت کھو رہی ہیں۔ شاید اس وجہ سے اس افسانہ کو آخر میں جگہ ملی ہے۔ فکشن میں تاریخی اور تہذیبی بیانیہ کو پیش کرنے کے پیچھے کیا محرکات ہیں؟ اس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''میں کئی برس سے اردو کی قدیم ادبی تاریخ اور تہذیب پر بیک وقت اردو اور انگریزی میں کتاب لکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہماری پرانی ادبی تہذیب ہمارے حافظے اور علم سے تقریبا غائب ہو چکی ہے۔ اگر یہ وقت کی سطح کے نیچے اتر کر ڈوب گئی تو ہمارا نقصان عظیم ہوگا اور اس کی بازیافت تو خیر ممکن ہی نہ ہوگی۔ جن تہذیبوں کا ماضی نہیں ان کا مستقبل بھی نہیں۔ اردو ادب وتہذیب کو فراموش کر دینے، اسے پائے اعتبار سے ساقط تصور کرنے یا ساقط قرار دلوانے کی جو کوشش ملک میں جگہ جگہ ہو رہی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے تاریخی حافظے کو زندہ رکھیں اور اپنی ادبی تہذیب کو جاندار، قائم رہنے والی اور آج بھی بامعنی حقیقت کے طور پر پیش کریں۔''[9]

فاروقی نے ہر افسانے کے آغاز سے قبل جو اشعار یا مغربی دانشوروں کے جو اقوال نقل کیے ہیں وہ نہ صرف افسانے سے گہرا ربط رکھتے ہیں بلکہ معنوی سطح پر بھی بیانیہ کی وسعت میں اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اسلوب کا وہ رنگ اختیار کیا ہے کہ مجموعے کا ہر افسانہ اپنے پچھلے افسانے، بیان اور معنویت کا تسلسل معلوم ہوتا ہے جہاں تاریخ اور تہذیب گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فاروقی کا اسلوب ایسا ہے کہ ان کے افسانوں میں صرف کرداروں سے ہی نہیں بلکہ شہر کے گلی کوچوں سے بھی تہذیبی نقوش ابھرتے ہیں۔ انھوں نے ہند ایرانی تہذیب کو مکمل جزئیات کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمو دیا ہے۔ یہ شمس الرحمٰن فاروقی کا ناقابل فراموش تخلیقی کارنامہ ہے۔

حوالہ جات

1. شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی 2022، ص16
2. ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا، مرتب، عمادالحسن آزاد فاروقی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1985، ص5
3. وہ جو چاند تھا سر آسماں، مرتبین، اشعر نجمی ورضوان الدین فاروقی، اثبات پبلی کیشنز، ممبئی 2024، ص270
4. اردو چینل، شمس الرحمٰن فاروقی نمبر، مدیران، عبید اعظم اعظمی، قمر صدیقی، ستمبر تا دسمبر 2003، ص161
5. افسانہ غالب، شمس الرحمٰن فاروقی، افسانوی مجموعہ، سوار اور دوسرے افسانے، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی 2022، ص52
6. افسانہ، ان صحبتوں میں آخر، ص208
7. افسانہ، سوار، ص 122
8. شمس الرحمٰن فاروقی، سوار اور دوسرے افسانے، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی 2022، ص32
9. ایضاً، ص23

■

Md Arshad
Research Scholar,Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob: 9536236908
mdarshad01995@gmail.com

وہاب اشرفی کی تنقیدی بصیرت

اسلم رحمانی

وہاب اشرفی کا شمار اردو کے قابل ذکر ناقدوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید نگاری ان کی ادبی زندگی کے دوسرے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے کیا تھا، ان کے افسانے ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئے۔ لیکن قدرت نے شاید انھیں تنقید کے لیے پیدا کیا تھا۔ وہاب اشرفی نے اپنی تحقیق و تنقید میں جس آزادی و بے باکی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال ان کی تنقیدی کتابوں بطور خاص ملا وجہی کی 'قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ'، 'قدیم ادبی تنقید'، 'معنی کی تلاش'، 'نقوش ادب'، 'مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ'، 'مثنوی اور مثنویات'، 'کاشف الحقائق' (ترتیب مع مقدمہ)، 'سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے'، 'پطرس اور ان کے مضامین'، 'راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری'، 'کاشف الحقائق: ایک مطالعہ'، 'تفہیم البلاغت'، 'شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری'، 'آگہی کا منظر نامہ' اور 'تاریخ ادبیات عالم'، 'اردو فکشن اور تیسری آنکھ' میں جا بجا ملتی ہے۔ وہاب اشرفی نے اردو فارسی اور انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے زمانے سے بہت قبل مغربی تنقید اردو ادب پر چھا چکی تھی۔ انگریزی تنقید کے ترجمے اردو تنقید کا حصہ بن چکے تھے۔ مغربی تنقید کا وہ پیمانہ تیار ہو چکا تھا جس سے اردو کے تخلیقی ادب کو ناپا جاتا ہے۔ وہاب اشرفی کی تنقید کی اہم ترین اور نمایاں خصوصیت ان کے تنقیدی نظریات کی وضاحت اور قطعیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ تنقیدی دبستان میں ان کو قابل تحسین مقام حاصل ہے۔ وہ کسی فن پارے پر نقد یا تبصرہ بغیر دلیل یا شواہد کے نہیں کرتے بلکہ ان کے تنقیدی مضامین کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ فن پارے کی روح میں مستغرق ہو کر اس کے جملہ معائب اور محاسن کا ایک نباض کی طرح پتا لگاتے ہیں۔ وہ جلد بازی یا عجلت میں تنقیصی پہلو اختیار نہیں کرتے۔

انھوں نے نہ صرف اپنے پیش رو نقادوں کے کام کو آگے بڑھایا بلکہ بذات خود کئی نئی جہات بھی دریافت کی ہیں۔ وہاب اشرفی 1967 میں بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ایم اے کرنے کے بعد وہیں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ اسی اثنا میں انھوں نے وجہی کی شہرہ آفاق مثنوی قطب مشتری پر 'قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ' لکھی۔

جہاں تک ملا وجہی کی اہمیت اور قطب مشتری کی افادیت کا تعلق ہے، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اردو ادب کے مورخین، ناقدین اور محققین نے اردوئے قدیم کے سلسلے میں وجہی کی ادبی خدمات اور بالخصوص قطب مشتری کی خصوصیات کا اعتراف و اعادہ کیا ہے، لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اردو ادب میں اب تک ادبی شخصیتوں اور ادبی کارناموں پر انفرادی طور پر شرح و بسط کے ساتھ تصنیف و تالیف کا رواج بہت کم رہا ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ قطب مشتری کے متعلق جستہ جستہ بیانات مل جاتے ہیں لیکن یکجا طور پر تشفی بخش مطالعہ کا مواد نہیں ملتا۔ لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ ملا وجہی پر کتابوں کی کوئی قلت نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ملا وجہی کی کتاب قطب مشتری پر وہاب اشرفی کی کتاب اس سلسلے کی اہم کڑی اور ان کا ایک بہترین ادبی کارنامہ ہے۔

وہاب اشرفی تنقید کی راہ میں تحقیق کو بھی شریک سفر بناتے ہیں لیکن یہاں بھی معروضیت کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہاب اشرفی کی پہلی تصنیف کئی زاویوں سے تنقیدی ضابطے کے مطابق مکمل نہیں ہے۔ اس کے قطع نظر یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ وہاب اشرفی جس وقت قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ پیش کر رہے تھے، اس وقت وہ ایک طالب علم تھے اس کے باوجود وہ یہ جانتے ہیں کہ قطب مشتری پر کہاں کہاں اور کیا کیا لکھا گیا ہے۔ انھیں یہ بھی اندازہ ہے کہ ان تحریروں میں کون سی تحریر قابل ذکر ہے اور کون سی نظر انداز کر دینے کے قابل، دوسری بات یہ کہ انھیں غیر ضروری خاکساری کے اظہار سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے محنت کی ہے ان کا دعوی بے دلیل نہیں، کیونکہ کتاب کے بغور مطالعہ کے بعد ہی وہ کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ مجموعی طور پر وہاب اشرفی نے اپنی پہلی ہی تنقیدی کتاب میں اپنے تنقیدی شعور کا اظہار کیا ہے۔ وہاب اشرفی کا یہ کارنامہ اردو ادب کے طلبہ کے لیے مشعل راہ ہے۔

فکشن کی تنقید

اردو فکشن تنقید میں وہاب اشرفی ایک نظریہ ساز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف نظری بلکہ اردو فکشن کی عملی تنقید کے بھی نہایت عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ اپنے بیش تر تنقیدی سرمایوں سے اردو کی ادبی تنقید میں اضافہ کیا۔ وہاب اشرفی کا شمار اردو افسانے کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے شاعری پر بھی خوب لکھا ہے اور اردو ادب کی تاریخ لکھ کر ادبی مورخین میں بھی ہمیشہ کے لیے اپنا نام لکھوایا ہے۔ مگر فکشن پر لکھے گئے ان کے مضامین اور کتابوں کی تعداد قابل ذکر ہے۔ اردو افسانے پر ان کی نظر گہری ہے۔ جس کی وجہ سے افسانے کی تنقید میں ان کا نام بھی ایک معتبر حوالہ ہے۔

وہاب اشرفی کے یہاں فکشن کے فن اور فکر کو سامنے رکھتے ہوئے کردار نگاری، زبان، اسالیب، تکنیک اور نفسیاتی موضوعات کے علاوہ اساطیری قدروں اور سماجی جہتوں پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ اس خصوص

میں غیاث احمد گدی، جوگندر پال، شفیع جاوید، منظر کاظمی، راجندر سنگھ بیدی اور سہیل عظیم آبادی کے افسانے۔ اسی طرح شاد عظیم آبادی، اختر اورینوی، قرۃ العین حیدر، عبدالصمد اور غضنفر کے ناولوں کی لسانی اور فکریاتی ساختوں کی گرہ کشائی شامل ہے۔ وہ اپنے مضامین میں درج بالا افسانہ گاروں اور ناول نگاروں کے ناولوں پر ذو معنی اور عمیق مطالعات کو سامنے لائے ہیں۔ لیکن یہاں بھی یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ دیگر افسانوں کے ساتھ ساتھ بالخصوص بیدی کے افسانوں پر انھوں نے جو نقد کیا ہے۔ ان سے کسی گہری تنقیدی شعور کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔

وہاب اشرفی کے افکار اور تنقیدی پہلو عام روایت سے مختلف، منفرد اور قدرے اچھوتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے بیدی کے افسانوں کے مطالعے میں ان امور کو موضوع بحث بنایا ہے جو یقیناً بیدی کی نئی تکنیک ہے۔ جس میں سوچ کی کئی تہیں یا کئی آوازیں ایک ساتھ ابھرتی ہیں اور مصنف کرداروں کے مختلف نکتہ ہائے نظر کو آزادانہ ابھرنے دیتا ہے۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ بیدی مختلف آوازوں کو کسی ایک مرکزی آواز کے تابع نہیں رہنے دیتے۔ اس کے تمام کردار اپنے نکتۂ نظر سے داخلی ارتکاز کی کسی نئی اور غیر متوقع جہت کو پیش کرتے ہیں۔ وہاب اشرفی کے مطابق 'اپنے دکھ مجھے دے دو' میں چھوٹے بڑے سب کردار اپنا رویہ، اپنا انداز، اپنے اطوار اور اپنی نفسیات رکھتے ہیں اور اپنے نکتہ نظر اپنی زبان اور اپنے محاورے میں بات کرتے ہیں۔ ہر چند کہ بیدی کی افسانہ نگاری پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن وہاب اشرفی کی کتاب ایک الگ نوعیت کی ہے اور اس میں جس طرح اختصار سے تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہاب اشرفی جب بیدی کے افسانوں کے تجزیے سے گزرتے ہیں تو ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس کا پلاٹ پیش کرتے ہیں، اس طرح کہ پوری کہانی یا قصہ کا جزو اعظم سامنے آجائے۔ ایک عام قاری بھی اس بات کو جانتا ہے کہ بیدی کا 'لاجونتی' افسانہ فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ لاجونتی افسانہ کی مرکزی کردار ہے، جسے اغوا کر لیا جاتا ہے اور پھر ایک مدت کے بعد اسے اپنے ملک ہندوستان واپس لایا جاتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لگتی ہے، لیکن اس کے شوہر کے کردار میں لاجونتی کے معاملے میں جو جارحیت تھی وہ سب ختم ہو جاتی ہے اور اب وہ اسے دیوی سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ شوہر کے اندر اتنی تبدیلی کیسے اور کیوں آ گئی اس جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے وہاب اشرفی اپنے جائزہ میں لکھتے ہیں:

''لیکن یہاں مسئلہ محض کسی مغویہ عورت کے سماجی مرتبے کی تجدید کا نہیں ہے بلکہ نفسیات کا ہے۔ معاشرے میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ نہایت ہی

> **وہاب اشرفی کی تنقیدی تحریروں میں جہاں عمیق النظری، فلسفیانہ استدلال اور گہری بصیرت ملتی ہے وہیں اسلوب نگارش کا ایک ایسا حسن بھی پایا جاتا ہے جو ان کی تنقیدی تحریروں میں تخلیق کی سی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہاب اشرفی کی تنقید سے اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن وہ جو رائے ظاہر کرتے ہیں، پورے استدلال اور مدلل انداز میں کرتے ہیں۔ان کی تحریروں میں، سلاست، فکر و نظر اور حسن بیان کی خوبی شامل ہے۔**

آوارہ عورتوں کے لیے یہاں گنجائش نکالی گئی ہے اور نہ صرف سماج نے بلکہ ان کے شوہروں نے بھی پوری طرح انھیں قبول کر لیا ہے، لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ لاجونتی کا شوہر سندر لال بظاہر اسے قبول کرنے اور پہلے سے زیادہ عزت دینے کے باوجود وہ مقام نہیں دے پاتا جس کی صرف لاجونتی نہیں بلکہ ہر عورت تمنا کرتی ہے۔ اب لاجونتی شوہر کے گھر میں رہنے کے باوجود اس کی بیوی سے زیادہ ایک دیوی کا روپ اختیار کر چکی ہے جو اسے پسند نہیں۔ یہ عورت کا نفسیاتی مسئلہ ہے جسے بیدی نے بڑی چابکدستی سے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ آخر لاجونتی اپنے شوہر سے سلوک کی کیوں متمنی ہے اور پہلے سے زیادہ عزت و حترام پانے کے باوجود کیوں غیر مطمئن ہے۔ جواب بہت سیدھا ہے۔ یعنی خود لاجونتی کا ذہن صاف نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جو واقعات گزر چکے ہیں وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئے اور شوہر کے بہترین سلوک کے باوجود ان واقعات کو نہیں بھول پاتی جو اس پر گزر چکے ہیں۔ گویا سندر لال سے زیادہ خود لاجونتی نفسیاتی مریض بن چکی ہے جو اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔''

(راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 42-41)

لاجونتی افسانہ کے اس تجزیے پر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بیدی کے شاہکار افسانہ پر وہاب اشرفی کا تجزیہ بھی ایک شاہکار ہے جس سے ادب کے طالب علموں کے لیے مباحث کے دروازے کھلتے ہیں۔

بیدی سمیت سہیل عظیم آبادی، اختر کاظمی وغیرہ کے افسانوں پر بھی وہاب اشرفی نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اختصار کے پیش نظر اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

افسانوں کے ساتھ ساتھ وہاب اشرفی نے چیدہ ناولوں پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

وہاب اشرفی نے ناول کی تنقید کے لیے جو پیمانہ اور اسلوب اپنایا ہے اس کی وجہ سے انھیں اپنے ہم عصروں میں درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد تنقیدی میلان اور اسلوب سے ناول اور افسانے کی فنی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس کی انفرادیت مسلم ہے۔ وہاب اشرفی کی تنقیدی تحریروں میں جہاں عمیق النظری، فلسفیانہ استدلال اور گہری بصیرت ملتی ہے وہیں اسلوب نگارش کا ایک ایسا حسن بھی پایا جاتا ہے جو ان کی تنقیدی تحریروں میں تخلیق کی سی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہاب اشرفی کی تنقید سے اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن وہ جو رائے ظاہر کرتے ہیں، پورے استدلال اور مدلل انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں، سلاست، فکر و نظر اور حسن بیان کی خوبی شامل ہے۔ ادب کے کئی پہلوؤں سے ان کی تحریریں اہم اور دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ نقاد کا کام صرف فن پارے کے تجزیے اور خوبی خامی بتانے تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ خلاق اور تخلیق کار کی طرح تخلیق معنی بھی کرتا ہے۔ اس نکتۂ نظر سے تنقید نگار کی زبان اور اسلوب میں بھی وہ حلاوت ہونی چاہیے جو قاری کو کسی فن پارے کی گرفت میں لے سکے۔ اردو افسانے اور ناولوں پر وہاب اشرفی نے بہت کچھ لکھا ہے۔ فکشن کی تنقید کے حوالے سے ان کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔

■

Aslam Rahmani
Dept of Urdu, Nitishwar College
Muzaffarpur- 842002 (Bihar)
Mob.:6201742128
rahmaniaslam9@gmail.com

عبدالباری

مومن خاں مومن

شخصیت اور شاعری

اردو شاعری کی تاریخ میں غزل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صنفِ سخن نہ صرف اردو کی پہچان ہے بلکہ اس کی ادبی روح بھی ہے۔قلی قطب شاہ سے لے کر میر و مرزا کے عہد تک اور اس کے بعد سے ترقی پسند تحریک سے لے کر جدیدیت اور مابعد جدیدیت تک ہر عہد میں غزل کا نیا رنگ و آہنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کسی نے اسے داخلیت کے قالب میں ڈھالا تو کسی نے فکر وفلسفہ کا جامہ پہنا کرنئی شناخت عطا کی۔غرض غزل میں ہمیں ہر طرح کے رنگ و آہنگ اور موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں ہر کس و ناکس کو اپنے مطلب کی چیز مل جاتی ہے یا وہ اسے اپنے مقصود و منشا کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

جن شعرا نے اردو غزل کو ثروت مند بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور غزل کو نئی شناخت عطا کی ان میں ایک اہم نام مومن خاں مومن کا بھی ہے۔مومن نے غزل کو عشق کی صداقت اور دل کی واردات سے زندہ کیا۔مومن کی شاعری میں عشق و محبت کی نازک ترین کیفیتیں، ایہام آفرینی، اور مکرِ شاعرانہ کی جلوہ گری ملتی ہے۔ وہ غزل کے ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں محبوب زمینی اور حقیقی وجود کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ غالب جیسے صاحبِ فکر شاعر نے بھی مومن کے ایک شعر پر اپنا کلیات قربان کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔محمد حسین آزاد اپنی مشہور کتاب 'آبِ حیات' میں اس واقعے کو بیان کرتے ہیں:

''غالب نے کہا تھا کہ اگر یہ شعر میرا ہوتا تو اپنی ساری کلیات اس پر قربان کر دیتا'' (آبِ حیات، ص325)۔

یہی واقعہ مومن کے مقام و مرتبے اور ان کی شاعری کی اہمیت و عظمت بتانے کے لیے کافی ہے۔

مومن صرف ایک عاشق مزاج شاعر نہیں بلکہ دہلی کی تہذیب، زبان اور معاشرت کے حقیقی نمائندہ بھی تھے۔ ان کی شاعری میں دہلی کی بول چال، محاورے، شوخی، بانکپن اور نازکی سب کچھ موجود ہے۔

مومن خاں مومن کا عہد انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت روبہ زوال ہو چکی تھی۔شاہی دربار محض نام کے رہ گئے تھے مگر دہلی کی فضا میں اس وقت بھی اردو غزل کی متعدد اہم قد آور شخصیات موجود تھیں جن میں اہم نام مرزا غالب، شیخ ابراہیم ذوق، مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ وغیرہ کا ہے۔ یہ شعرا نہ صرف دہلی کی علمی محفلوں اور مشاعروں کو رونق بخش رہے تھے بلکہ دہلی کی زبان و بیان اور تہذیب و معاشرت کی بھی ترجمانی کر رہے تھے۔

شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی میں دہلی کی فضا میں جو ذوق، نازکی اور محاورہ بندی تھی، وہ اردو غزل کی روح تھی۔''

(شعر العجم، حصہ سوم، ص210)

یہی تہذیبی اور ادبی فضا مومن کی تربیت کا پس منظر بنی۔ دہلی کے کوچہ و بازار میں بولی جانے والی زبان ان کی شاعری کا سرمایہ بنی۔ ان کے کلام میں دہلی کا روزمرہ پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

مومن خاں مومن 1801 میں دہلی کے کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد مومن تھا لیکن شاعری میں تخلص 'مومن' اختیار کیا۔خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں اور دادا نامدار خاں شاہی طبیب تھے۔اس وراثت کے باعث مومن نے بھی طب میں مہارت حاصل کی اور عملی زندگی میں طبیب کی حیثیت سے بھی شہرت پائی۔ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی۔قرآن و حدیث کے مطالعے کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی پر گہری دسترس حاصل کی۔ شاعری کی طرف رجحان دہلی کے ماحول کا عطیہ تھا جہاں ہر کوچے میں شعر و ادب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''مومن نے طب میں بھی مہارت حاصل کی اور دہلی کے علمی و ادبی ماحول نے ان کے اندر غیر معمولی شعری استعداد پیدا کر دی''

(تاریخ ادب اردو، جلد2، ص412)

مومن نے عربی، فارسی، منطق، حدیث اور علوم اسلامی کی تعلیم حاصل کی تھی اور حافظ قرآن بھی تھے۔ طب تو ان کا خاندانی پیشہ تھا اس کے علاوہ انھیں رمل، جفر، نجوم، شطرنج اور موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ مگر انھوں نے اپنا پیشہ شاعری کو بنایا اور یہ مشغلہ انھوں نے اوائل عمری میں ہی شروع کر دیا تھا۔ فائق کی تحقیق کے مطابق مومن بارہ برس کی عمر میں ہی مثنوی 'شکایت ستم' (1227ھ) لکھ چکے تھے۔ابتدا میں انھوں نے شاہ نصیر سے اصلاح لی مگر بعد میں انھوں نے اپنا الگ انداز اختیار کیا۔

مومن نے پوری زندگی دہلی میں گزاری، گرچہ معاشی اعتبار سے زیادہ خوشحال نہ رہے لیکن طبیب اور شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت یہیں بنائی۔انھوں نے متعدد شہروں کا سفر ضرور کیا مگر مستقل ہجرت نہیں کی۔ 1851 یا مئی 1852 میں اپنے گھر کی چھت پر مرمت کے کام کو دیکھتے ہوئے گر گئے اور یہی حادثہ ان کی وفات کا سبب بنا۔

مومن کی شخصیت تضادات سے بھرپور تھی۔ ایک

طرف وہ خوش گفتار، خوش مزاج اور رنگین طبیعت کے حامل تھے، دوسری طرف مذہبیت اور روحانیت بھی ان کی زندگی کا حصہ تھی۔ ان کا بیعت ہونا سید احمد شہید بریلوی کے ہاتھ پر اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے اندر مذہبی وابستگی بھی تھی۔ تاہم وہ عملی جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''مومن کی طبیعت میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ مذہبیت بھی بسی ہوئی تھی'' (آب حیات، ص 327)۔

مومن کی نجی زندگی کے بھی دلچسپ پہلو تھے۔ وہ خوش لباس اور خوش گفتار تھے۔ محفلوں میں ان کی شوخی اور بذلہ سنجی کا شہرہ تھا۔ لیکن ان کے دل کے اندر ایک حساس عاشق بھی آباد تھا جو ان کی شاعری میں پوری شدت سے جلوہ گر ہوتا ہے اور انھوں نے اپنے عشق کو پوشیدہ بھی نہیں رکھا بلکہ مثنوی اور دیگر ذرائع سے اس کا اظہار بھی برملا کیا۔ پہلا عشق تو نو برس کی عمر میں ہو گیا تھا جس کا خاتمہ محبوبہ کی موت پر ہوا اور سترہ برس کی عمر تک وہ دو عشق کر چکے تھے۔ اس سے ان کے عشقیہ مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ان کی شاعری میں پردہ نشین محبوب کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ جسے مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں۔

پردے کی کچھ حد بھی ہے پردہ نشیں
کھل کے مل بس منھ چھپانا چھوڑ دے

مومن کو اپنی شاعری پر بہت ناز تھا۔ مومن خود اپنی شاعری کا تعارف اس انداز سے کراتے ہیں ''میرے گوہر معانی تمام بے بہا ہیں۔ میرے کلام کے خاص سونے کے مقابلے میں پرویز کا طلائے دست افشار کھوٹا ہے اور میرے سینے کے خزینہ کے سامنے خزانہ قارون بے اعتبار۔ میرے مضامین رنگیں نے جو یاقوت کی طرح قیمتی ہیں رنگین لب حسینوں کے لعل لب کا بازار سرد کر دیا اور میرے قیمتی موتیوں کی چمک کے رشک نے پاک گہروں کے گوہر اشک کو غبار آلودہ بنا دیا۔ ابیات: سمندر اور کان میں میرے مضامین کا فیض پہنچا ہے کہ ایک کے لیے موتی اور دوسرے کے لیے لعل لے جاتا ہوں... ندرت کلام کے لحاظ سے میں زمانہ میں یکتا ہوں اور نہ کوئی نظم میں میرا ہمسر ہے اور نہ نثر میں۔ میری بندگی کے فخر سے شروان کے شاعر کے نزدیک خاقانی اور پرستاری دونوں کے معنی ایک ہیں۔''

(بہ حوالہ مومن اور مطالعہ مومن ص: 484)

مومن نے عربی، فارسی، منطق، حدیث اور علوم اسلامی کی تعلیم حاصل کی تھی اور حافظ قرآن بھی تھے۔ طب تو ان کا خاندانی پیشہ تھا اس کے علاوہ انھیں رمل، جفر، نجوم، شطرنج اور موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ مگر انھوں نے اپنا پیشہ شاعری کو بنایا اور یہ مشغلہ انھوں نے اوائل عمری میں ہی شروع کر دیا تھا۔

مومن کی شاعری کی خصوصیات

مومن کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت عشق کی واردات کا سچا اور براہِ راست بیان ہے۔ وہ عشق کو نہ فلسفے کی گتھیوں میں الجھاتے ہیں اور نہ ہی اس میں تصوف کے رنگ زیادہ گھولتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق دل کی کیفیت ہے، جذبے کی شدت ہے، اور محبوب سے مکالمہ ہے۔

ان کی شاعری کے اہم اوصاف میں مکر شاعرانہ، ایہام، معاملہ بندی، مضمون آفرینی، نازک خیالی، حسن تعلیل، زبان کی سادگی، محبوب کا زمینی تصور اور شدت جذبات وغیرہ شامل ہیں۔

مکر شاعرانہ

مکر شاعرانہ الفاظ کے ساتھ کھیلنے اور معنی آفرینی کا فن ہے۔ مومن کے ہاں مکرِ شاعرانہ ایک نمایاں وصف ہے۔ وہ عام الفاظ کو اس انداز میں برتتے ہیں کہ قاری حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مومن کو غزل میں اس طرز کا موجد مانا جاتا ہے۔ مومن محبوب سے اس انداز سے مخاطب ہوتے ہیں کہ لگتا ہے وہ محبوب کے فائدہ کی بات کر رہے ہیں مگر درحقیقت اس میں ان کا فائدہ ہوتا ہے۔ مومن کا مشہور شعر ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

مذکورہ بالا شعر میں مکر شاعرانہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مومن کا ایک اور مشہور شعر ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ شعر مومن کے فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس میں بظاہر سادگی ہے لیکن معنوی طور پر گہرائی اور وسعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب جیسا عظیم شاعر اس شعر کے بدلے اپنا پورا دیوان دینے کو تیار تھے۔

ایہام

مومن ایک مصرعے یا شعر میں دو مختلف معنوں کا امتزاج پیدا کرنے کا ہنر بھی خوب جانتے تھے، انھوں نے ایہام آفرینی کے فن کو اپنی شاعری میں کمال مہارت کے ساتھ استعمال کیا۔ جیسے مومن کا شعر ہے۔

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کرکے

معاملہ بندی

شاعری میں معاملہ بندی سے مراد ہوتا ہے راز و نیاز کی وہ باتیں جو خلوت میں عاشق و معشوق کے درمیان ہوتی ہیں۔ مومن کی غزلوں میں معاملہ بندی کی بھی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مومن ہمیشہ اپنی دلی کیفیات کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔ ان کے عشق میں عریانیت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کی جھلک اس شعر میں دیکھی جا سکتا ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کو نہ نہ یاد ہو

مومن کی زبان سادہ اور فصیح ہے۔ عام اور سادہ بات کو بھی اس خوبصورتی سے شاعری کا حصہ بناتے ہیں کہ وہ دلکش اسلوب اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی شاعری دہلی کے روزمرہ اور محاورات کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ انھیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کہاں کس لفظ کا استعمال کرنا ہے وہ کبھی کبھی صرف لفظوں کی ترتیب بدل کر بھی معمولی سے معمولی باتوں کو دلچسپ پیرایے میں ڈھال دیتے ہیں۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''مومن کی زبان دہلی کی مستند اور فصیح زبان ہے، جس میں شوخی بھی ہے اور بانکپن بھی۔''

(کلیاتِ مومن، مقدمہ، ص 12)۔

سہل ممتنع سے مراد ایسا شعر ہوتا ہے جو اس قدر آسان لفظوں میں ادا ہو جائے کہ مزید سلاست کی گنجائش نہ ہو۔ایسی شاعری بہت آسانی سے زبان زد عام و خاص ہو جاتی ہے۔ مومن کے یہاں سہل ممتنع کی بھی مثالیں خوب دیکھنے کو ملتی ہیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا
میں بھی خوش نہ تھا وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مومن کی غزل گوئی

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف ہے اور مومن کی پہچان بھی غزل سے ہی ہے گرچہ مومن نے نظم و نثر کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی مگر ان کے تمام تجربات پر غزل کا رنگ نمایاں رہا۔ میر کے بعد مومن نے عشق کو اس شدت اور صداقت کے ساتھ پیش کیا کہ وہ 'عشق کے شاعر' کہلائے۔

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں: ''غالب فکر کے شاعر ہیں اور مومن عشق کے'' (غالب اور مومن، ص 59)۔

مومن کی غزل میں عشق کی واردات دل سے دل تک پہنچتی ہے۔ ان کے ہاں تصنع اور بناوٹ نہیں بلکہ براہِ راست دل کی صدا ہے۔ یہی وصف ان کو ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے، عاشق، معشوق اور رقیب کا مثلث مومن جس خوبصورتی سے تیار کرتے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

زبان و بیان کی خصوصیات

مومن کی زبان دہلی کی بول چال ہے۔ ان کے کلام میں محاوروں کی تازگی اور روزمرہ کی سادگی ہے لیکن ساتھ ہی فصاحت و بلاغت بھی اپنی انتہا پر ہے۔ ان کی شاعری اس بات کا ثبوت ہے کہ دہلی کی زبان کتنی زرخیز اور پر کشش تھی۔

شبلی نعمانی لکھتے ہیں: ''مومن نے دہلی کی زبان کو غزل کے قالب میں ڈھال کر ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا'' (شعرالعجم، حصہ سوم، ص 218)۔

مومن اور غالب کی شاعری کا موازنہ

مومن اور غالب دونوں ہم عصر تھے اور دونوں نے غزل کو نئی جہتیں عطا کیں۔ لیکن دونوں کا زاویۂ نظر مختلف تھا۔

غالب عقل اور فکر کے شاعر تھے، وہ عشق کو بھی فلسفے اور کائناتی سوالات سے جوڑتے ہیں۔

مومن جذبات اور عشق کے شاعر تھے، وہ محبوب کو زمینی اور حقیقی تصور میں پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مطابق:

''مومن نے اردو غزل میں زمینی محبوب کو متعارف کرایا اور عشق کو حقیقی انسانی سطح پر پیش کیا۔''

(اردو غزل: معنی کی تلاش، ص 142)۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ غالب اور مومن ایک ہی فضا میں سانس لیتے تھے لیکن ان کی شاعری کی روح مختلف تھی۔

مومن کی غزلوں کا فکری اور فنی جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں عشق کی شدت اور صداقت، ایہام اور مکرِ شاعرانہ کا کمال، دہلی کی زبان اور محاورہ کی تازگی، محبوب کا زمینی اور حقیقی تصور، سادہ اور براہِ راست جذباتی اظہار، مذہبیت اور روحانیت وغیرہ عناصر اتم درجہ میں دیکھنے کو ملتے ہیں ان تمام کو وہ اس انداز سے اپنی غزلوں کا حصہ بناتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے دیگر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''مومن نے غزل کو عشق کی ایک حقیقی واردات کا آئینہ بنا دیا'' (تاریخ ادب اردو، جلد 2، ص 415)۔

جمیل جالبی کا یہ تبصرہ مومن کی غزل گوئی کے نمایاں پہلو کی عمدہ ترجمانی کر رہا ہے ان کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ مومن کی شاعری آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ زندہ اور زبان زد عام و خاص ہے۔

مومن خاں مومن اردو غزل کے ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں تصنع اور بناوٹ نہیں بلکہ دل کی براہِ راست صدا ہے۔ ان کی زبان دہلی کی مستند اور شستہ اردو ہے جس میں محاورے کی تازگی، شوخی اور بانکپن سب کچھ موجود ہے۔

یوں مومن کا نام اردو غزل کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ نہ صرف دہلی کی زبان کے نمائندہ ہیں بلکہ عشق کے شاعر بھی ہیں جن کی شاعری آج بھی قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اردو کے بیشتر ناقدین نے ان کے سلسلے میں مثبت آرا پیش کی ہیں۔ ہم ان نظریات کی روشنی میں بھی ان کی شاعری کے نمایاں وصف کو سمجھ سکتے ہیں۔

محمد حسین آزاد: ''مومن کی شاعری میں عشق اور مذہبیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔''

(آبِ حیات، ص 327)۔

شبلی نعمانی: ''مومن دہلی کی زبان کے سب سے بڑے نمائندہ ہیں'' (شعرالعجم، حصہ سوم، ص 218)۔

رشید احمد صدیقی: ''مومن عشق کے شاعر ہیں، غالب فکر کے'' (غالب اور مومن، ص 59)۔

جمیل جالبی: ''مومن نے اردو غزل کو نئی معنویت بخشی۔'' (تاریخ ادب اردو، جلد 2، ص 415)۔

گوپی چند نارنگ: ''مومن نے غزل میں حقیقی محبوب کی تصویر کھینچی'' (اردو غزل: معنی کی تلاش، ص 142)۔

کلیم الدین احمد: ''مومن کی شاعری اردو غزل کے مزاج کی اصل نمائندہ ہے'' (تنقید شعر، ص 201)۔

شمیم حنفی: ''مومن کی شاعری میں دل کی وارداتیں ایک تہذیبی زبان کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔''

(موازنہ شاعری، ص 88)۔

مومن کی غزلوں کا فکری اور فنی جائزہ لیتے ہیں تومعلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں عشق کی شدت اور صداقت، ایہام اور مکر شاعرانہ کا کمال، دہلی کی زبان اور محاورہ کی تازگی، محبوب کا زمینی اور حقیقی تصور، سادہ اور براہ راست جذباتی اظہار، مذہبیت اور روحانیت وغیرہ عناصر اتم درجہ میں دیکھنے کو ملتے ہیں ان تمام کو وہ اس انداز سے اپنی غزلوں کا حصہ بناتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے دیگر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

Dr. Abdul Bari
Assistant Professor Urdu
Regional Institute Of Education Ajmer
(NCERT)
Room No137,Capt.D.P Chaudhry Marg
Ajmer- 305004 (Rajasthan)
Email.abariqasmi13@gmail.com
Mobile.9871523432

بنیادی تعلیم

مصنف: ڈی ایس گورڈن
مترجم: خلیل الرحمٰن سیفی پریمی

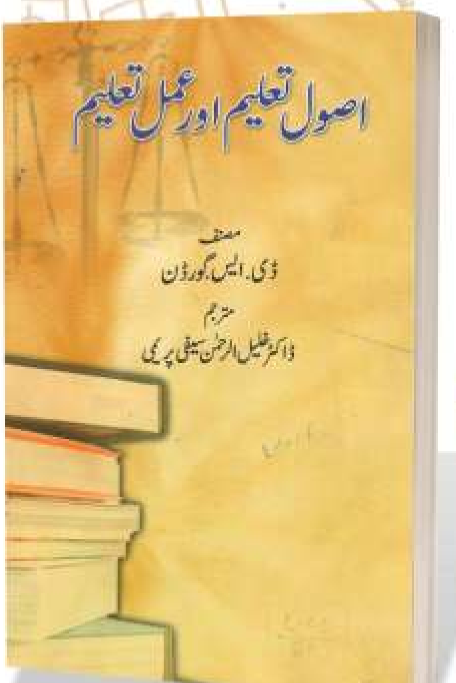

بنیادی تعلیم

منصوبی طریقے کی قدر و قیمت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس میں با مقصد عمل پر زور دیا جاتا ہے۔ اس میں ہاتھ کے عمل یا حرفہ کے کام کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے جس کے گرد تمام علم وقوع میں آتا ہے۔ یہی تصور گاندھی جی کے حرفہ مرکز تعلیمی نظام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک اہم فرق کے ساتھ۔ جب کہ منصوبی طریقہ بعض مضامین مدرسہ کے علم تک محض رسائی کا ایک طریقہ ہے۔ گاندھی جی کی اسکیم ایک قطعی تعلیمی نظام ہے۔ مزید برآں گاندھی جی نے کسی تعلیمی نظریے یا عمل کا مطالعہ کرکے یا واقفیت حاصل کرکے اپنی اسکیم تیار نہیں کی۔ انھوں نے اپنی فکر اور تجربے اور اپنے ملک کے پیدا شدہ حالات کے مخصوص حوالہ سے اس اسکیم کو بنایا۔ جس کو اب بنیادی تعلیم کہا جاتا ہے۔ اس کو اپنے ہی تعلیمی فلسفے کی حمایت حاصل ہے اور اسی سے پہلے کے تعلیمی مفکرین کے بیانات سے کوئی چیز نہیں لی گئی ہے۔ گاندھی جی نے جو کچھ تجویز کیا ہے اور دوسروں نے جو کچھ کہا ہے اور عمل کیا ہے اس میں اگر کہیں کوئی مماثلت ملتی ہے تو وہ قطعی اتفاقی ہے۔

نظریۂ بنیادی تعلیم کی اہم خصوصیات

بنیادی تعلیم کی اہم خصوصیات کو اس طور پر بیان کیا گیا ہے:

1. کم سے کم معیار تک تمام شہریوں، مردوں اور عورتوں کے لیے تعلیم عام ہونی چاہیے۔ شروع میں اس کو لازمی قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن جیسے ہی سہولتیں میسر آئیں اس کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ اس عام کم از کم تعلیم کو گاندھی جی بنیادی تعلیم کہتے ہیں۔
2. اس تعلیم کا نصاب سات برس کا ہے۔ اور سات برس کی عمر سے تعلیم شروع ہوتی ہے۔
3. فی الحال بنیادی تعلیم کا تعلق اسکول سے پہلے کی سطح یا بعد کی بنیادی سطح سے نہیں ہے۔
4. بنیادی تعلیم مادری زبان کے ذریعہ ہونی چاہیے۔
5. اس کا مرکز کوئی آرٹ یا دست کاری ہونا چاہیے۔ جس آرٹ یا حرفہ کا انتخاب کیا جائے۔ تمام تدریس اسی کے ذریعہ ہونا چاہیے۔
6. آرٹ یا حرفہ کو لیاقت اور عملی نتائج کے پیش نظر سیکھنا چاہیے۔
7. مصنوعات کو اقتصادی طور پر نفع بخش ہونا چاہیے۔
8. اس امر کی کوشش ہونی چاہیے کہ استاد کی تنخواہ کام کے معاوضہ سے پوری ہو سکے۔
9. اسکول کی عمارت اور ساز و سامان کا بقیہ صرفہ ریاست کو مہیا کرنا چاہیے۔
10. حرفے کی مصنوعات کو ریاست اپنی ضروریات اور اسی کے تحت جو مقامی انجمنیں ہیں ان کے کام میں لائے۔ مصنوعات با افراط ہونے کی صورت میں ریاست کو بازاروں میں فروخت کرنے کی سہولتیں فراہم کرنا چاہئیں۔

گاندھی جی کو ان خطوط پر سوچنے کے لیے کس چیز نے آمادہ کیا؟ تعلیم کے میدان میں اپنے چاروں طرف نقائص پر نظر کرنے سے غور و فکر کا آغاز ہوا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ انگریزوں کے رائج کیے ہوئے تعلیمی نظام میں درج ذیل خامیاں تھیں۔

1. اس تعلیمی نظام میں مرکزیت کتابوں کو حاصل تھی اور وہ قطعی ادبی تھی۔
2. اس میں واقعات کو زندگی سے ہم رشتہ ہوئے بغیر سکھایا جاتا تھا۔ یعنی اس سے علم حاصل ہوتا تھا، تفہیم کا مادہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔
3. اس میں علم کو غیر متعلق اور منفصل مضامین میں تقسیم کرکے مصنوعی انداز میں تعلیم دی جاتی تھی۔
4. اس میں عملی فن کو نظر انداز کر دیا گیا اور وہ سماجی کارکردگی کو بڑھاوا دینے میں ناکام رہا۔
5. اس نے رقابت اور مقابلہ کا جذبہ ابھارا اور تعاون و رفاقت کا نہیں۔
6. اس میں اہم ترین مقام انگریزی کو ملا اور مادری زبان کو نظر انداز کیا گیا۔
7. اس نے معدودے چند تعلیم یافتہ افراد اور بقیہ عوام کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی۔
8. اس میں بڑی جنس رائگاں شامل تھی کیونکہ پرائمری اسکول کی پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک چند طلبہ ہی پہنچ پاتے ہیں۔

برخلاف اس کے بنیادی تعلیم میں:

1. تعلیم کا مرکز بچہ ہوتا ہے۔
2. علم کو ایک مربوط کل تصور کیا جاتا ہے۔
3. بچے کام کر کے سیکھتے ہیں یعنی عمل کے ذریعہ۔
4. یہ عمل ایک حرفہ ہوتا ہے جو کہ بار آور ہے اور بامقصد ہوتا ہے۔
5. بچوں میں ہاتھ کی محنت کا احترام پیدا ہوتا ہے۔
6. استاد اور شاگرد دونوں سماجی ترقی کے لیے کام کرتے ہیں۔

لیکن بنیادی تعلیم سیکھنے کی ضرورت اس حرفہ سے ابھرتی ہے جس حرفہ میں بچے مشغول رکھے جاتے ہیں اور علم کی جب بھی ضرورت ہوتی ہے اسی وقت اس کا حصول ہوتا ہے۔ بچے خوش اسلوبی سے چیزوں کو انجام دینے اور کام میں لانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔

بنیادی تعلیم کا فلسفہ

بنیادی تعلیم طفل مرکز تعلیم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ روسو سے جان ڈوئی تک جدید تعلیمی فکر سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن بنیادی تعلیم کو حرفۂ مرکز تعلیم بھی سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اصطلاح کے فرق سے کوئی انتشار پیدا ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ بنیادی تعلیم کا بچے سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا اس حرفہ سے جس میں بچہ مصروف ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بنیادی تعلیم دو باہمی عملی عوامل کا نتیجہ ہوتی ہے یعنی بچہ اور اس کا حرفہ۔ لیکن جب ہر ایک چیز حرفے کے ذریعہ سکھائی جاتی ہے اور جب بچوں کی تیار کی ہوئی چیزیں اسکول کے اخراجات کی کفایت کے لیے فروخت کی جاتی ہیں تو فطری طور پر یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں کیا بچوں کی دلچسپیوں اور ہنر کو مالی منفعت کے تحت نہیں رکھا جارہا ہے۔ اس بنیاد پر بنیادی تعلیم پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اس تنقید کے نتیجے میں اب عام اتفاق ہوگیا ہے کہ بنیادی تعلیم پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اس تنقید کے نتیجے میں اب عام اتفاق ہوگیا ہے کہ بنیادی تعلیم کے معاوضہ کے پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسکیم اصل میں تعلیم کی اور پیداوار کی نہیں اور یہ کہ اس کے تحت دست کار تیار کرنے کی نیت نہیں ہے۔ پس ظاہر ہے کہ یہ خیال کہ حرفہ مرکز تعلیم کو اسکول کے جزوی اخراجات کا کفیل ہونا چاہیے، اسکیم کا لازمی حصہ قطعی نہیں ہے۔ پھر ابتدا میں انسان نے علم کو تجربہ کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔ وہ کسی الفاظ میں علم ہمیشہ زندگی کے موقع و محل میں حاصل کیا گیا۔ اس کا زندگی سے قریبی تعلق تھا اور اس نے زندگی کی ضروریات کو پورا کیا۔ لیکن رفتار وقت کے ساتھ اس علم کو متعدد شعبوں میں مرتب کیا گیا۔ اور اسکول میں اس کو مضامین میں تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن بنیادی تعلیم، علم کی اصل روح گرفت کے لیے ایک کوشش ہے یعنی زندگی کے مقاصد اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے واقعات کی دریافت کرنا۔ اس لیے بنیادی تعلیم میں مضامین کی مصنوعی حدیں قائم رکھنے کا کوئی محل نہیں۔ نام نہاد مضامین بالغ ذہنوں کی جانب سے علم کی درجہ بندی کرنے کو دراصل منطق کا اطلاق ہیں لیکن بنیادی نصاب مدرسہ مضامین کی اس تقسیم کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ تمام علم کو ایک مربوط کل تصور کرتا ہے۔

دوسرے، بنیادی تعلیم میں بچے کام کر کے سیکھتے ہیں۔ وہ ایک نصاب عمل سے گذرتے ہیں۔ ان کی تعلیم کتاب مرکز نہیں ہوتی جیسا کہ غیر بنیادی اسکولوں میں ہوتا ہے بلکہ وہ حرفہ مرکز ہوتی ہے۔ جب بچے کتابوں سے سیکھتے ہیں تو وہ کسی اندرونی تقاضے کے جوابی عمل کی صورت میں مجبور ہو کر نہیں سیکھتے بلکہ محض اس لیے کہ استاد سے سیکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن بنیادی تعلیم سیکھنے کی ضرورت اس حرفہ سے ابھرتی ہے جس حرفہ میں بچے مشغول رکھے جاتے ہیں اور علم کی جب بھی ضرورت ہوتی ہے اسی وقت اس کا حصول ہوتا ہے۔ بچے خوش اسلوبی سے چیزوں کو انجام دینے اور کام میں لانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ چیزوں کی نوعیت کے بارے میں سیکھتے ہیں۔ بعد میں بچے اس قابل ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ چیزوں کی نوعیت کے بارے میں سیکھتے ہیں۔ بعد میں بچے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ ان چیزوں سے کچھ بنا سکیں جن سے وہ کھیل چکے ہیں۔ بنیادی تعلیم بچوں میں تعلیمی مقاصد کے لیے اس اصول عمل کا استعمال کراتی ہے۔

تیسرے، بنیادی تعلیم بچوں کا عمل بامقصد ہوتا ہے۔ شروع ہی سے بچہ اپنے ہاتھوں سے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ یہ معمولی سی چیز بھی ہوسکتی ہے جیسے کہ 'پتنگ بنانا' لیکن وہ ایک مکمل پیداوار ہے اور وہ اس پیداوار کو بہترین صورت میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کاغذ کاٹتا ہے۔ تیلیوں کو ترتیب دیتا ہے۔ جہاں ضرورت ہوا ان کو چپکاتا ہے۔ مکمل چیز بنانے کی کوشش کرتا ہے اگر وہ خاطر خواہ نہیں ہے تو اس کو چھیلتا ہے اور پھر کوشش کرتا ہے یہ عمل شروع ہی سے بامقصد ہے۔ اس مقصد کے پورا کرنے میں ہر قدم بچے کو نصب العین سے قریب تر لے جاتا ہے۔

مالی پہلو

بنیادی تعلیم کو مالی اعتبار سے منفعت بخش ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر جب کوئی چیز تیار کی جائے تو وہ قابل فروخت ہونی چاہیے اور فروخت کی آمدنی سے اسکول چلانے کے اخراجات کا جزوی حصہ پورا ہونا چاہیے۔ اس سوال کے بعض پہلوؤں کا ہم مختصر طور پر پہلے ہی حوالہ دے چکے ہیں۔ اس تجویز نے تعلیمی دنیا کو چونکا دیا خاص طور پر اس لیے کہ یہ بات گاندھی جی کی زبان سے نکلی تھی جو ایک مثالیت پسند انسان کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن اس تجویز میں مثالیت پسند کے عملی پہلو کا بذات خود اظہار ہوتا ہے اور اگر چہ یہ کام و دہن میں تلخی پیدا کرتی ہے سوال یہ ہے کہ اصول اخلاق کے مطابق کیا بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو فروخت کرنے اور

بنیادی تعلیم کو مالی اعتبار سے منفعت بخش ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر جب کوئی چیز تیار کی جائے تو وہ قابل فروخت ہونی چاہیے اور فروخت کی آمدنی سے اسکول چلانے کے اخراجات کا جزوی حصہ پورا ہونا چاہیے۔

جزوی طور پر اسکول کے اخراجات اس سے پورا کرنے میں کوئی عیب ہے؟ اخلاقی طور پر اس طریق عمل میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ صرف ایک خطرہ ہے یعنی کاروباری مقصد کی دھن میں بچی تعلیم کے نظر انداز ہونے کا امکان ہے لیکن بہت سے بڑی عمر والے یقینا کماتے ہیں اور اسی کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ امریکہ میں یہ بات بالکل عام ہے۔ بچوں کے ایسا کرنے میں دراصل کوئی نقصان نہیں ہے بشرطیکہ کسب زر کے پہلو پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔

لیکن ہندوستان میں تعلیم کے حرفہ کا سوال اتنی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ گاندھی جی اپنی اسکیم میں اس سوال کا حوالہ نہ دیتے اگر وہ ایسا کرنے کی فوری اور شدید ضرورت محسوس نہ کرتے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ہندوستانی تعلیم کا جہاز ہمیشہ مالیت کی چٹان پر تباہ ہوتا رہا ہے۔ برطانوی حکومت ہمیشہ ملک کے لیے عام تعلیم کی حمایت کا اظہار کرتی رہی تھی لیکن جب خرچ کے سوال پر غور کیا جاتا تھا تو ناممکن نظر آتا تھا۔ جب گوکھلے کا پیش کردہ 1911 کا ابتدائی تعلیم کا بل ناکام ہو گیا تو وہ زیادہ تر مالیات کی بنیاد پر ہی ہوا۔ عموماً اس زمانے میں برطانوی حکومت کو فوج پر زیادہ اور تعلیم پر بہت کم روپیہ خرچ کا الزام دینا ایک رواج بن گیا تھا۔ لیکن آج آزاد ہندوستان میں ہم دفاعی ملازموں پر کچھ کم خرچ نہیں کر رہے ہیں اور تعلیم میں اپنا سرمایہ لگانا ہنوز ہمارے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے پنڈت روی شنکر شکلا نے برسوں پہلے ودیا مندر اسکیم پیش کی تھی۔ اس میں انھوں نے اظہار کیا تھا کہ ہندوستان کی مذہبی بنیادیں عہد قدیم سے کارفرما رہی ہیں۔ حکمرانوں اور دیندار لوگوں نے زمینوں کے عطیات سے مدد کی ہے۔ اسی طرح انھوں نے تجویز رکھی تھی کہ ہمارے ملک میں تعلیم کی مستقل طور پر مدد زمین کے عطیات سے ہو سکتی ہے اور خاص مقاصد کے لیے کبھی کبھی حکومت سے بھی امداد مل سکتی ہے۔ آج بھی اس اسکیم کا جائزہ لینا اور اس کے امکانات کو دریافت کرنا خاطر خواہ ہوگا۔ دستور ہند کی دفعہ 45 میں درج ذیل رہنمایانہ بنیادی اصول شامل کیا گیا ہے۔

''اس دستور کے اعلان سے دس برس کی مدت میں چودہ برس تک کے تمام بچوں کو ریاست مفت اور لازمی تعلیم مہیا کرے گی۔'' دس برس کی مدت پوری ہو رہی ہے لیکن کیا ہم کہیں بھی منزل کے قریب ہیں؟ ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ آزادی کے آغاز سے ہمارے ملک میں خواندگی اوسطاً محض 12 فیصد سے 20 فیصد ہوئی ہے۔ مفت اور لازمی تعلیم کا مسئلہ سب کے لیے اب بھی مالیات پر ٹکا ہوا ہے۔ اس لیے جب گاندھی جی نے یہ تجویز کیا تھا کہ بنیادی تعلیم سے کسی حد تک پڑھائی کا صرفہ پورا ہونا چاہیے تو ان کی تجویز پر خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

اس کے علاوہ اس باب میں کسی یقینی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے کئی دوسرے امور قابل غور ہیں۔ پہلی بات یہ کہ بنیادی اسکولوں کو سختی کے ساتھ بنیادی تعلیم کے اصولوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ دوسرے، اساتذہ کو بنیادی تعلیم میں یقین رکھنے والا پر جوش اور پورے طور پر بالیاقت کارکن ہونا چاہیے۔ اگر انھوں نے اپنی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے اسکول چھوڑ دیا تو پیداوار پر اثر پڑے گا۔ چوتھے، نہایت عقلمندی سے اور خصوصاً علاقہ کا لحاظ رکھتے ہوئے حرفے کا انتخاب کرنا چاہیے اور معقول قیمت پر افراط کے ساتھ ساز و سامان فراہم کرنا چاہیے۔ پانچویں یہ کہ بازاروں میں مال فروخت ہونے کا باقاعدہ اہتمام ہونا چاہیے۔

بنیادی تعلیم اور حرفہ کا کام

ہم اب اگلی مد پر غور کرتے ہیں یعنی بنیادی تعلیم کسی حرفے یا منفعت بخش کام کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ اسکول کے عام مضامین مثلاً زبانیں، سماجی علوم، ریاضی، سائنس وغیرہ سب کو کسی حرفے سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے قریبی تعلق سے پڑھائی ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے معمولاً منتخب حرفوں میں کتائی اور بنائی، باغبانی اور زراعت، جلد سازی اور لکڑی اور دھات کا کام، چمڑے کا کام، مٹی کے برتن بنانا، مچھلی پکڑنا اور لڑکیوں کے لیے گھریلو امور خانہ داری ہیں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بعض حلقوں میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اسکول کے تمام مضامین کا حرفے کے کام سے فطری طور پر ربط پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ''بعض حرفوں کے ذریعہ ہی یہ ہوتا ہے کہ انسان خام اشیا قدرت سے حاصل کرتا ہے اور اس کو انسانی سماج کے استعمال کی چیزوں میں منتقل کر دیتا ہے اور یہ نام نہاد مضامین، علم کی شاخیں ہیں جن کو انسان نے فطرت کی تسخیر کر کے ان سے نفع حاصل کیا ہے۔ اس لیے تاریخ اور جغرافیہ کو کتائی کے ذریعہ سکھانا دور از کار ہونے کی بجائے فطری طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ کپاس کی بڑھوار اور کاشت۔ ممالک اور آب و ہوا، زمین اور موسم جن میں کپاس بڑھتی ہے۔ اس کے مختلف ٹائپ، انسانی لباس کا ارتقا اور ہمارے کپڑوں میں جو تبدیلیاں تاریخی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہوئی ہیں یہ تمام علم کتائی اور بنائی سے ہم رشتہ کرنا تاریخ اور جغرافیہ کی گہری اور زیادہ واقفیت ثابت ہوگا یہ بہ نسبت اس کے کہ درسی کتب سے بے روح واقعات پڑھائے جائیں۔''[1]

جب نصاب مدرسہ کو عام چیزوں سے اس طرح مربوط کر دیا جاتا ہے تو بچے صرف علم اور عملی ہنر ہی حاصل نہیں کرتے بلکہ اپنی کامیابیوں میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح تجربہ کے تمام پہلو، ذہنی عملی اور جذباتی یکساں طور پر ذاتی مہم کے سہارے ترقی پاتے ہیں۔

بچے کتائی کے دوران حساب کو اپنی کٹیاں گن کر سیکھتے ہیں۔ کتے ہوئے ڈورے کو ناپ کر سیکھتے ہیں نیز کل کے مقابلے میں آج کتنا زیادہ یا کم بُنا اور ایک ہفتے یا مہینے میں وہ کتنا بُن لیں گے وغیرہ۔ ''جب نصاب مدرسہ کو عام چیزوں سے اس طرح مربوط کر دیا جاتا ہے تو بچے صرف علم اور عملی ہنر ہی حاصل نہیں کرتے بلکہ اپنی کامیابیوں میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح تجربہ کے تمام پہلو، ذہنی عملی اور جذباتی یکساں طور پر ذاتی مہم کے سہارے ترقی پاتے ہیں۔''[2]

بنیادی تعلیم کے نتائج

یہ اعتراض کہ بنیادی تعلیم بچوں سے کام کرالیتی ہے لیکن خیال انگیزی پیدا نہیں کرتی اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ''خیال اور استدلال مجرد طور پر ترقی نہیں پاتے بلکہ مسائل کا حل کرنے اور صورت حال کا مقابلہ کرنے سے فروغ پاتے ہیں اور حرفے کے کام میں بچوں سے مسائل کا مقابلہ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو ٹھوس اور ضروری موقع محل میں واقع ہوتے ہیں اور ان کے حل کرنے میں بچوں کو موثر طریقہ سے سوچ بچار پر مائل کیا جاتا ہے۔''[3]

آخر میں بعض دوسرے اوصاف کا بنیادی تعلیم میں دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس میں اساتذہ اور طلبہ دونوں کو زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ بچے اپنی سرگرمی کی خود رہنمائی کرتے ہیں۔ امتحان قریب ہونے پر متعینہ نصاب تعلیم کو پورا کرنے یا منظور شدہ درسی کتب کو ختم کرنے کے لیے اساتذہ اور طلبہ میں سے کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ بنیادی اسکولوں میں بھی نصاب مضامین ہوتا ہے۔ وہ کتابیں بھی استعمال کرتے ہیں لیکن یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ پھر بھی کام کے پروگرام کی انجام دہی میں زیادہ لچک ہوتی ہے۔

ہر ایک تعلیم یافتہ فرد کو صرف اپنا بوجھ ہی نہیں اٹھانا چاہیے بلکہ سماج کی بہبود میں بھی اس کو کچھ حصہ لینا چاہیے۔ سردست اسکول کا کام سماج کی ضروریات سے گہرے طور پر متعلق نہیں ہے۔ بنیادی تعلیم کا دعویٰ ہے کہ اس کا پروگرام اور طریقے اسی چیز پر مبنی ہیں جس کی سماج کو ضرورت ہے۔

بنیادی اسکول ہاتھ کی محنت کی عظمت کا نقش بٹھاتے ہیں۔ ہمارے سماج میں سب سے بڑی ایک خامی یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقات ہاتھ کی محنت کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو وہ ہاتھ کے کام سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان خطوط پر سوچنے کے بعد اس تجویز کی طرف رہنمائی ہوئی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو دیہات میں جانا چاہیے اور وہاں بود و باش کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ہاتھ کا کام کرنا چاہیے۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں اس پر پہلے سے عمل ہو رہا ہے اور اسے لازمی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پہلے ہی سے یہ تجویز ہے کہ یونیورسٹی کسی امیدوار کو ڈگری عطا نہ کرے جب تک وہ کمیونٹی کی ایک خاص مدت تک لائق تحسین سماجی خدمت نہ کرے۔

بنیادی تعلیم اور سماجی مقصد

پھر، فی الحال اسکول ہی ایسی جگہ ہے جہاں بچوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ لیکن کس مقصد کے لیے ان کو تربیت دی جاتی ہے؟ دنیا میں بہتر زندگی گذارنے کے پیش نظر ان کو تربیت دی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے ذاتی مفاد کی خاطر سماج میں اعلیٰ مطابقت پیدا کرنے کے خیال سے ان کو تربیت دی جاتی ہے۔ ایسے تعلیمی سسٹم میں انفرادی مفاد ظاہر ہے لیکن سماج کا مفاد اتنا واضح نہیں ہے۔ جب ایڈم اسمتھ نے اپنے اقتصادی نظریہ اصول عدم مداخلت کی وکالت کی تھی تو اس کی دلیل یہی تھی کہ جب ایک فرد بغیر پابندی کے اپنے کاروبار میں کامیاب ہوگیا تو تمام سماج بھی خوش حال ہوگیا۔ تجربہ سے اس نظریہ کی غلطی جلد ہی واضح ہوگئی۔ چند افراد، اکثریت کی قیمت پر دولت مند ہوگئے۔ اسی طرح تعلیم میں انفرادی بہبود ایک قطعی مناسب مقصد نہیں ہو سکتی۔ اگر تعلیم کو کمیونٹی کی ضروریات کو پورا کرنا ہے تو تعلیم کا سماجی مقصد بھی ہونا چاہیے۔

سماج اپنے نوجوان کی تعلیم پر بڑی رقم صرف کرتا ہے۔ سماج کو اس قربانی کا براہ راست کیا معاوضہ ملتا ہے؟ دراصل نہایت حقیر۔ اسکول کو افراد کے لیے اپنا مستقبل سنوارنے کی محض تربیت گاہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو سماجی مفاد کا ایک ادارہ بھی ہونا چاہیے۔ وہ جو تعلیم دیتا ہے اس کی بنیاد سماجی ضروریات پر ہونا چاہیے۔ ہر ایک تعلیم یافتہ فرد کو صرف اپنا بوجھ ہی نہیں اٹھانا چاہیے بلکہ سماج کی بہبود میں بھی اس کو کچھ حصہ لینا چاہیے۔ سردست اسکول کا کام سماج کی ضروریات سے گہرے طور پر متعلق نہیں ہے۔ بنیادی تعلیم کا دعویٰ ہے کہ اس کا پروگرام اور طریقے اسی چیز پر مبنی ہیں جس کی سماج کو ضرورت ہے۔

بنیادی تعلیم کی اسکیم

جب گاندھی جی نے تعلیم کے حرفہ مرکز نظام کا تصور قائم کیا اور 1937 میں اس کے بارے میں 'ہریجن' میں لکھا تو انھوں نے اسی نظام کے تحت تعلیم کی مدت سات برس تجویز کی تھی۔ دوسرے برس کانگریس اور ذاکر حسین کمیٹی نے اس تجویز کو قبول کرلیا۔ اس کو واردھا سنٹرل صوبہ جات میں نافذ کیا گیا جہاں گاندھی جی رہتے تھے۔ اور یہ واردھا اسکیم معروف ہوگئی۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے اسکیم کو ایک کمیٹی کے حوالہ کر دیا۔ بی ۔ جی ۔ کھیر صاحب کمیٹی کے صدر تھے۔ کھیر کمیٹی نے سفارش کی کہ حرفہ مرکز تعلیم معمولاً 6 برس سے 14 برس کے بچوں کے لیے شروع کی جا سکتی ہے۔ بلکہ وہ ایسے اسکولوں میں 5 برس کی عمر میں بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ اسی اثنا میں مجوزہ حرفہ مرکز تعلیم ، بنیادی تعلیم کہلانے لگی۔ کھیر کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ پانچویں جماعت کے بعد بنیادی اسکولوں سے بچوں کو دوسرے اسکولوں میں منتقل کیا جاسکتا ہے یعنی تقریباً 11 برس کی عمر میں ۔ بنیادی تعلیم کا اعلیٰ سطحوں سے تال میل رکھنے کو ایک دوسری کمیٹی اسی چیرمین کے تحت قائم کی گئی۔ اس کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ بنیادی تعلیم کا نصاب 6 برس کی عمر سے 14 برس کے بچوں کے لیے 8 برس کا ہونا چاہیے۔ نصاب کے دو مرحلے ہوں۔ یعنی ایک جونیئر مرحلہ جو کہ پہلے پانچ سال پر مشتمل ہو 6 برس سے 11 برس تک کے بچوں کے لیے اور سینئر مرحلہ بقیہ تین برس کا نصاب پورا کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ 5-3 کی تنظیم جنوبی ہند میں رائج نصاب یعنی پانچ برس پرائمری اسکول اور تین برس مڈل اسکول نصاب سے مطابقت رکھتی ہے۔ اگر بنیادی اسکول کے تصور کو تین برس اور آگے بڑھا دیا جائے تو اس سے ہائی اسکول کی تعلیم بھی پوری ہو جاتی ہے۔ فی الحال ہائی اسکول کی تعلیم کو مابعد بنیادی تعلیم (پوسٹ بیک ایجوکیشن) کہا گیا ہے۔

بنیادی تعلیم کی مابعد بنیادی تعلیم سے مناسب ہم آہنگی ایک ضروری معاملہ ہے، چونکہ ہائی اسکول میں طریق تعلیم اس سے مختلف ہوتا ہے جو اس سے پہلے تھا اس لیے یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ بنیادی نظام کے تحت تعلیم یافتہ طلبہ اگر اعلیٰ نہ ہوں تو کم سے کم عام طور پر تعلیم یافتہ طلبہ کے برابر تو ہوں۔ صرف تجربہ ہی ظاہر کر سکے گا کہ بنیادی مدرسے کس خوبی سے انجام دہی کر رہے ہیں۔ اسی دوران تقابلی جائزے لیے گئے ہیں اور یہ رپورٹ ملی ہے کہ بنیادی مدرسوں کے عملی پروگرام بچوں کی نشو و نما کی تمام

ضروری مدّات میں عام اسکولوں کی روایتی روش سے اعلیٰ پائے گئے ہیں۔ یہ حوصلہ افزا بات ہے۔ لیکن بنیادی تعلیم اب بھی طفلی کے مرحلے میں ہے اور بہت سے اساتذہ اور دیگر افراد اس کے موثر ہونے کے متعلق ہنوز مشکوک ہیں۔ اس لیے اس سمت میں جو کوششیں پہلے سے ہوئی ہیں ان میں ڈھیل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تجربہ کی روشنی میں اس نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانا ضروری ہے۔

تعلیم بطور مطابقت

حرفے کے ذریعہ تعلیم کو فرد کی سماج کے ساتھ ایک قسم کی مطابقت سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ خیال کہ طالب علم جس کمیونٹی میں زندگی گذارتا ہے تو تمام تعلیم بنیادی طور پر اس کمیونٹی کی ضروریات سے مطابقت کا نام ہے۔ یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ اس کی تشکیل چند دہائی قبل ہوئی تھی۔ ہندوستانی تعلیم پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی بڑی اکثریت 1951 کی مردم شماری کے مطابق 82 فیصد دیہات میں بستی ہے اور اپنی روزی کے لیے کچھ زراعت اور کچھ دیہی دست کاری پر اس کا انحصار ہے۔ گاندھی جی نے اس صورت حال کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اس حقیقت پر زور دیا تھا کہ گاؤں والوں کا مکمل یا پورے برس کا دھندہ زراعت نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کو ذیلی پیشے خاص طور پر کتائی اور بنائی کو اختیار کرنا چاہیے۔

ہندوستان ایک جمہوریہ ہے۔ اس میں جمہوری نظام حکومت ہے یعنی ایسی حکومت جس میں فیصلہ کن رائے عوام کی ہوتی ہے۔ ایسی حکومت کی کامیابی کا انحصار خود عوام کی مناسب طور پر سوچنے کی صلاحیت اور خود غرض جماعتوں کی گمراہ کن رہنمائی سے گریز کرنے پر ہوتا ہے۔

انھوں نے جس وقت یہ تجویز پیش کی تھی تو یہ سمجھا گیا تھا کہ انھوں نے ایسا زیادہ تر سیاسی مقصد کے تحت کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ سمجھا گیا کہ گاندھی جی اپنے ہم وطنوں کو لنکا شائر کے سوتی سامان کی دست نگری سے نجات دلانے اور اس سامان کی ادائیگی کے عوض انگلینڈ میں ہندوستانی دولت کے بہاؤ کو روکنے اور ہندوستان کی دیہی صنعت کو مضبوط بنانے کے لیے یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔ لیکن انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی گاندھی جی نے اس باب میں اپنا خیال تبدیل نہیں کیا۔ برخلاف اس کے انھوں نے اپنی بنیادی تعلیم کے پروگرام میں اس کو مرکزی عامل کی حیثیت سے شامل کرلیا اور اس کی حمایت جاری رکھی۔

اگر سماج کی بدلتی ہوئی ضروریات سے فرد کی مطابقت کا نام تعلیم ہے تو ایسے سماج میں جہاں گھریلو صنعتیں اب بھی بڑا عمل دخل رکھتی ہیں وہاں اگر تعلیم دینی ہے تو اس کو حرفہ مرکز تعلیم ہونا چاہیے۔ لیکن ہندوستان تیزی سے بدل رہا ہے۔ اس میں متعدد صنعتوں کی ترقی ہو رہی ہے اور متعدد پن بجلی طاقت منصوبے (ہائڈروالیکٹرک پاور پروجیکٹس) شروع کیے جا رہے ہیں۔ ان سے گھریلو صنعتوں کے لیے سستی بجلی کی طاقت دستیاب ہوگی۔ اس لیے تعلیمی نمونے کو ان بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔ یہ مطابقتیں سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی ہو سکتی ہیں۔

1. سیاسی

ہندوستان ایک جمہوریہ ہے۔ اس میں جمہوری نظام حکومت ہے یعنی ایسی حکومت جس میں فیصلہ کن رائے عوام کی ہوتی ہے۔ ایسی حکومت کی کامیابی کا انحصار خود عوام کی مناسب طور پر سوچنے کی صلاحیت اور خود غرض جماعتوں کی گمراہ کن رہنمائی سے گریز کرنے پر ہوتا ہے۔ چونکہ دونوں جنس کے ہر بالغ کو رائے دینے کا حق ہوتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس رائے کا استعمال مناسب طور پر ہو۔ صحیح طور پر سوچنے کی کلید، تعلیم ہے اور دوسروں کی صحیح رہنمائی کرنا تعلیم یافتہ شخص کی خاص ذمہ داری ہے۔ ''اس کو چاہیے کہ ہر پرانی چیز کو محض پرانا پن کے باعث رد نہ کرے اور نئی چیز کو صرف نیا پن دیکھ کر قبول نہ کرے بلکہ ٹھنڈے دل سے دونوں کا جائزہ لینا چاہیے اور جسارت کے ساتھ اس چیز کو رد کر دینا چاہیے جو انصاف اور ترقی کو روکنے والی ہو۔''[4] اس میں رواداری، ضبط، تعاون اور سچی وطن پرستی کا احساس ہونا چاہیے یہ سیاسی مطابقت ہے۔

(ب) اقتصادی

اقتصادی مطابقت میں ایک فرد کے فطری میلان خاطر کے مطابق سماج کی سرگرمیوں میں اس کے کھپ جانے کی تربیت شامل ہے۔ ہماری تعلیم اتنی عالمانہ اور نظریاتی رہی ہے اور اب بھی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے ملک کے قدرتی وسائل کی ترقی میں کوئی قابل لحاظ حصہ لینے یا قومی دولت کے اضافہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ بڑی حد تک ملک کی اقتصادی زندگی میں غیر موزوں تھے اور اب بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متنوع نصابات مثلاً زراعتی، صنعتی، تجارتی اور دوسرے عملی نصابات کو ثانوی مدارس میں جاری کیا گیا ہے۔ اس کا بہر حال یہ مطلب نہیں کہ ہم تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ برخلاف اس کے ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ ایسی بنیادی لبرل ایجوکیشن ہے جس میں پیشہ ورانہ رجحان ہو۔

(ج) تہذیبی

دراصل تہذیبی مطابقت کا مطلب طالب علم کی شخصیت کا بھرپور فروغ ہے تاکہ وہ اپنے ملک کے تہذیبی ورثہ کی وقعت کرنے کا اہل بن سکے اور بعد کو زندگی میں اس کی ترقی میں حصہ لے سکے۔ سردست تعلیم کا زیادہ تر تعلق مدرسہ کے بعض مضامین کا صرف علم حاصل کرنے اور امتحانات پاس کرنے سے ہے۔ لیکن حقیقی تعلیم، طالب علم کی شخصیت، اس کی جذباتی زندگی، اس کے سماجی رجحانات، اس کی تعمیری ذہانت اور اس کے افکارانہ ذوق کو تیز تر کرتی ہے۔ وہ مشاغل اختیار کرے گا اور فرصت کے وقت کو عقلمندی سے اور کارآمد طور پر گذارے گا۔ اس لیے تو تنظیم تعلیمی نصاب میں فنون لطیفہ اور حرفے، موسیقی اور رقص اور مشاغل کو اہم مقام دیا گیا ہے۔

حوالے

1. ایچ آر بھاٹیا، بنیادی تعلیم کے کہتے ہیں۔ What Basic Education means. ص، 40
2. ایضاً
3. ایضاً
4. رپورٹ ثانوی تعلیم کمیشن ص 23

The Report of Secondary Education Commission.

■

ماخذ: اصول تعلیم اور عمل تعلیم، **مصنف:** ڈی ایس گورڈن، **مترجم:** ڈاکٹر خلیل الرحمن سیفی پریمی، **تیسری اشاعت:** 2016، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

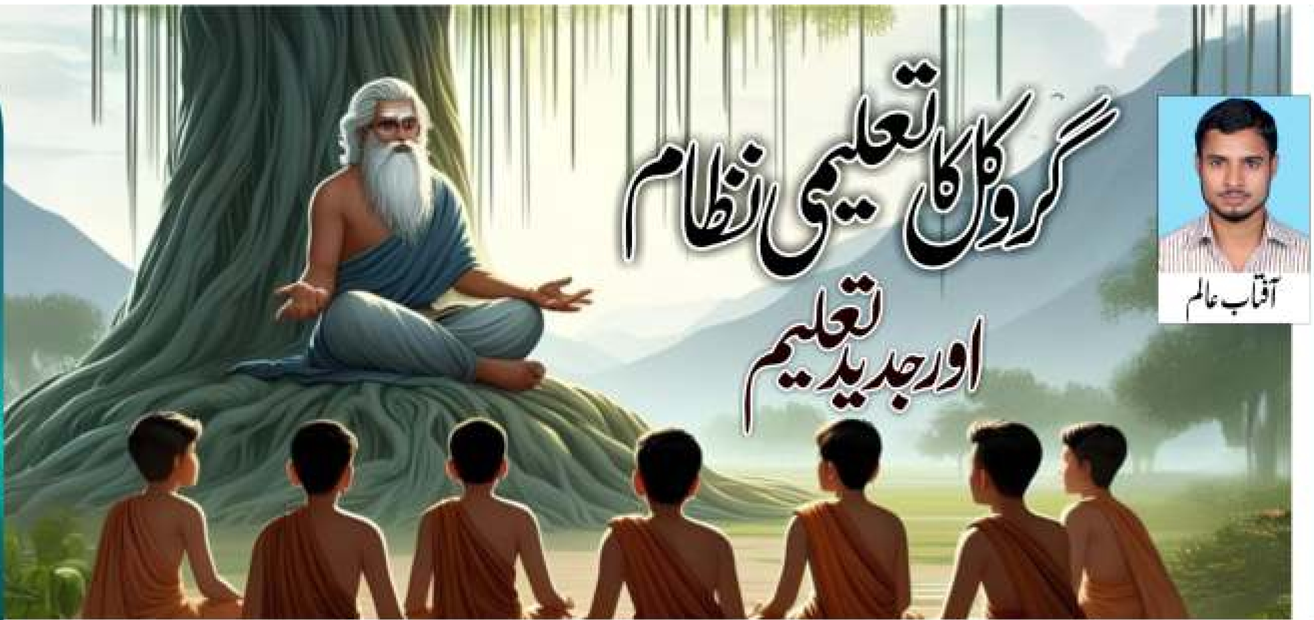

گروکل کا تعلیمی نظام اور جدید تعلیم

آفتاب عالم

ہندوستان کا قدیم تعلیمی نظام ہزار سالوں کا سفر طے کرنے کے بعد معرض وجود میں آیا ہے جو علم کے ایک وسیع اور کثیر شعبہ جاتی نظام پر مشتمل ہے، جس میں فلسفہ، سائنس، طب، لسانیات اور تعلیم جیسے شعبے شامل ہیں۔ اس قدیم تعلیمی نظام نے اپنی بیش قیمتی وراثت اور فلسفیانہ گہرائی کے ذریعہ دنیا کے تعلیمی نظام کی رہنمائی کی ہے اور مفید و ضروری تعلیمی نمونوں کو تشکیل دیا ہے۔ گروکل نظام، تعلیم نظام کا ایک قدیم نمونہ ہے جس کی بنیاد جامع تعلیم، ہمہ جہت ترقی، اخلاقیات اور استاد اور شاگرد کے قریبی اور مضبوط رشتے پر ہے۔ گروکل نظام نے اقدار، ذاتی نظم و ضبط اور تجرباتی اکتساب پر زور دیا، جدید تعلیمی نظام جو کہ نو آبادیاتی اور عالمی اثرات کے تحت تشکیل پایا ہے، بڑی حد تک معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اس علمی روایت کا مرکز گروکل ہے جو درس و تدریس اور باہمی اکتساب کا ایک رہائشی ماڈل ہے جس نے قدرتی اور اقدار سے بھرپور ماحول میں طالب علم کی جامع ترقی پر توجہ مرکوز کیا ہے۔ اس نظام نے نہ صرف رسمی تعلیم پر زور دیا ہے بلکہ زندگی کی مہارتوں، اخلاقیات اور روحانیت کو بھی پروان چڑھایا ہے۔ اس کے برعکس، ہندوستان میں جدید تعلیمی نظام بڑی حد تک برطانوی نو آبادیاتی دور میں، خاص طور پر 1835 کے لارڈ میکالے منٹس کے ساتھ معرض وجود میں آیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ فروغ پایا، جس کا مقصد انگریزی اور مغربی طرز کی تعلیم کو فروغ دے کر حکومت کے لیے ملازمین اور کارندے پیدا کرنا تھا۔ آزادی کے بعد کی اصلاحات میں تعلیمی نظام کو مقامی بنانے کی کوشش شامل ہے۔

گروکل کا تعلیمی نظام: بنیادیں اور خصوصیات

گروکل نظام تعلیم ایک قدیم ہندوستانی طریقہ ہے جہاں طلبا اپنے استاد (گرو) کے ساتھ فطری ماحول میں رہتے ہیں، تعلیمی، اخلاقی اور روحانی تعلیم کے امتزاج کے ذریعہ اپنی ہمہ جہت ترقی پر زور دیتے ہیں۔ ویدک روایات کی پیروی کرتے ہوئے، گروکل نظام نے ایک علمی برادری کو فروغ دیا، جس نے ذاتی رہنمائی، تجرباتی اکتساب اور احترام، خود انحصاری اور خدمت جیسی اقدار کو جنم دیا۔

گروکل نظام تعلیم کے اہم پہلو

1. رہائشی ترتیب: طلبا اپنے استاد (گرو) کے ساتھ قدرتی ماحول میں رہتے تھے، عام طور پر ایک جنگل یا آشرم میں زندگی بسر کرتے ہوئے آپس میں قریبی تعلق اور برادری کے احساس کو فروغ دیتے تھے۔
2. نشوونما اور ہمہ جہت ترقی: نصاب میں سماجی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ فلسفہ، ادب، سائنس، ریاضی اور یہاں تک کہ جنگ جیسے مضامین کا ایک وسیع دائرہ شامل تھا۔
3. استاد-شاگرد کی روایت (گرو-شیشیا پرمپرا): اس نظام نے استاد-شاگرد کے درمیان مضبوط رشتہ (بندھن) پر زور دیا ہے، جس میں استاد ایک سرپرست، رہنما اور مثالی نمونہ (رول ماڈل) کے طور پر کام کرتا ہے۔
4. تجرباتی تعلیم: اکتساب صرف نصابی کتب تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کا عملی استعمال، روزمرہ کے کام اور سماجی سرگرمیوں میں شمولیت و مشغولیت شامل تھی۔
5. کردار سازی: تمام گروکلوں کا مقصد طلبا میں اخلاقی اقدار، نظم و ضبط اور بزرگوں اور اساتذہ کا احترام پیدا کرنا تھا۔
6. اقدار پر زور: اس نظام نے خود پر قابو پانے، سماجی بیداری، ثقافت اور علم کے تحفظ پر زور دیا۔
7. زبانی ترسیل: گروکل میں علم کی تقسیم اور درس و تدریس کا عمل زبانی طور پر سرانجام دیا جاتا تھا۔ معلومات کے ازبر کرنے کے ساتھ اس کی تعلیمات کو سمجھنے پر زور دیا جاتا تھا۔
8. امداد اور عطیات: گروکلوں کو فیس پر انحصار کرنے کے بجائے عوامی عطیات سے تعاون حاصل تھا۔
9. نئے اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی: تجربہ کا اساتذہ اکثر نئے اساتذہ کو پڑھانے، قائدانہ صلاحیتوں کو فروغ دینے اور علم کی ترسیل میں مدد کرتے تھے۔

فلسفیانہ بنیادیں

گروکل نظام کی جڑیں تعلیم میں گہرائی سے پیوستہ تھیں، جس کا مقصد طلبا کی سماجی، فکری، جذباتی، جسمانی اور روحانی جہتوں کو پروان چڑھانا تھا۔ اس میں تعلیم صرف حقائق کو جمع کرنے تک محدود نہیں تھی بلکہ کردار، نظم و ضبط اور خود شناسی تک پھیلی ہوئی تھی۔ دھرم (فرض)، ارتھ (معیشت)، کام (خواہش) اور موکش (آزادی) کا انضمام اس درس گاہ میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اکتسابی رہنمائی اقدار پر مبنی ایک خاکہ کے ذریعہ کی جاتی تھی جس میں سماج کی فلاح و بہبود، خود کی تلاش اور عالمگیر ہم آہنگی پر زور دیا جاتا تھا۔ اس فلسفیانہ بنیاد نے تعلیم کو تجارت یا لین دین کے برعکس قوم و فرد میں مثبت تبدیلی اور اس کے فروغ و ترقی کا باعث بنا دیا تھا۔

ساخت اور تدریسی طریقہ کار

استاد-شاگرد کی روایت (گرو-شیشیا پرمپرا) گروکل نظام کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اس نظام میں استاد اور طالب علم کا رشتہ اعتماد، احترام اور عقیدت پر مبنی تھا۔ اکتساب تجرباتی اور زبانی تھا، جس میں حفظ، تلاوت، مباحثے اور قدرتی ماحول میں

تجرباتی سرگرمیاں شامل تھیں۔ ہدایت ذاتی نوعیت کی ہوتی تھی اور اساتذہ نہ صرف ایک ہدایت کار کے طور پر بلکہ طلبا کی پوری زندگی میں ایک روحانی اور اخلاقی رہنما کے طور پر کام کیا کرتے تھے۔ گروکل کی تدریسیات نے 'شاستر' (فلسفیانہ مباحث) جیسے مکالماتی طریقوں کے ذریعہ تجسس اور تنقیدی سوچ کو فروغ دیا اور طلبا کو گفتگو کی اور استدلال میں بھی رہنمائی بھی کی۔

نصاب اور روزمرہ کی زندگی

گروکل کا نصاب کثیر شعبہ جاتی تھا، جس میں وید، ریاضی، فلکیات، طب، موسیقی، فلسفہ، مارشل آرٹس اور دیگر مضامین شامل تھے۔ اکتساب کا ماحول سادہ تھا جو فطرت پر مبنی زندگی، خود انحصاری، ماحولیاتی شعور اور ذہن سازی کو فروغ دینے پر زور دیتا تھا۔

امتحان اور تشخیص

گروکل نظام میں تشخیص مسلسل، غیر رسمی اور تشکیلی تھی۔ اساتذہ ہر ایک طالب علم کی ترقی کا مشاہدہ طور پر کیا کرتے تھے اور اسی کے مطابق منصوبہ بناتے اور اکتساب کی راہ تیار کیا کرتے تھے۔ اس نظام میں کامیابی کا پیمانہ امتحانات یا درجات نہیں بلکہ کردار، فہم اور اخلاق تھا۔

استاد-شاگرد کی روایت (گرو-شیشیا پرمپرا) گروکل نظام کی ریڑھ کی ہڈی تھی. اس نظام میں استاد اور طالب علم کا رشتہ اعتماد، احترام اور عقیدت پر مبنی تھا. اکتساب تجرباتی اور زبانی تھا، جس میں حفظ، تلاوت، مباحثے اور قدرتی ماحول میں تجرباتی سرگرمیاں شامل تھیں. ہدایت ذاتی نوعیت کی ہوتی تھی اور اساتذہ نہ صرف ایک ہدایت کار کے طور پر بلکہ طلبا کی پوری زندگی میں ایک روحانی اور اخلاقی رہنما کے طور پر کام کیا کرتے تھے.

جدید تعلیمی نظام: ساخت اور چیلنجز

آزادی کے بعد، ملک میں تعلیم کو جمہوری بنانے اور تہذیب وتمدن کے موافق کرنے کا عمل جاری ہے۔ دستوری طور پر ملک میں تعلیم کو ریاست کے زیر اہتمام رکھا گیا پھر دستور ہند میں 42 ویں ترمیم کے ذریعہ 1976 میں مشترکہ فہرست منتقل کیا گیا اور اس طرح مرکزی حکومت بھی اس کے فروغ کے لیے اس میں سرمایہ کاری کرنے لگی۔ تعلیم کو عالمی اور معیاری بنانے کے لیے مشترکہ طور پر مختلف پروگرام چلائے گئے اور آج بھی چلائے جا رہے ہیں۔ اس بات کو یقینی بنایا جا رہا ہے کہ نصاب عالمی معیار کا ہو اور بچے باہر کی دنیا کے لیے تیار کیے جائیں۔ نیز تعلیم کو ٹیکنالوجی کے ساتھ ملا کر اکیسویں صدی کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

کلیدی خصوصیات

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ آج کا تعلیمی نظام ادارہ جاتی اور معیاری ہے، جس کی خصوصیت کمرہ تدریس میں ہدایات، درس وتدریس، مقررہ نصاب اور نصابی کتب پر مبنی تعلیم ہے۔ تشخیص بنیادی طور پر ایسے امتحان پر مبنی ہوتی ہے، جس میں حقائق اور معلومات کا حفظ و یادداشت کی جانچ پر توجہ دی جاتی ہے۔ یہ نظام اخلاقی یا جذباتی ترقی پر محدود توجہ کے ساتھ ذاتی نوعیت کی تعلیم کی کم حمایت کرتا ہے۔

خوبیاں اور خامیاں

جدید نظام تعلیم کی خوبیاں درج ذیل ہیں:

1. ہر فرد کی تعلیم تک رسائی
2. سائنسی مزاج کا فروغ
3. آن لائن پلیٹ فارم اور ای۔لرننگ جیسی مربوط تکنیکی اختراعات کا فروغ۔
4. عالمی معیار
5. عالمی شہریت

تاہم اسے کچھ خامیوں کا بھی سامنا ہے جیسے:

1. طلبا کی کثیر تعداد کی وجہ سے ذاتی توجہ کا فقدان۔
2. اخلاقی اور اقدار پر مبنی تعلیم کی کمی۔
3. نمبرات، گریڈز اور مقابلے پر زیادہ زور،

مذکورہ خامیوں کے نتیجے میں طلبا کو تناؤ، برن آؤٹ اور تخلیقی صلاحیتوں کا محدود ہونا جیسے حالات کا سامنا ہے۔

تقابلی تجزیہ: گروکل بمقابلہ جدید تعلیم

مندرجہ ذیل تقابلی تجزیہ ہندوستان میں گروکل نظام اور جدید تعلیمی نظام کے درمیان کلیدی فلسفیانہ، ساختی اور تدریسی تفاوت کو بیان کرتا ہے:

پہلو	گروکل نظام	جدید تعلیمی نظام
اکتسابی نقطہ نظر	جامع اور تجرباتی، زندگی اور اقدار پر مرکوز	نظریاتی اور ساختی، نصابی کتب اور امتحانات پر مبنی
استاد اور طالب علم کا رشتہ	گہرا ذاتی اور روحانی؛ تاحیات سرپرستی	رسمی، درجہ بندی، تعاملی
نصاب	اخلاقیات، فطرت اور کثیر شعبہ جاتی مضامین کے ساتھ مربوط	موضوع کے لحاظ سے مخصوص، بکھرے ہوئے اور معیاری
تشخیص کا طریقہ	تشکیلی، مشاہداتی اور مسلسل	تکمیلی، متواتر، اور درجہ بند
بنیادی ڈھانچہ	سادہ، ماحول دوست، اور فطرت سے مربوط	ادارہ جاتی، شہری، اور ٹیکنالوجی پر مبنی
اخلاقیات	تعلیمی عمل میں اخلاقیات کا مرکزی کردار	اختیاری ماڈیول کے طور پر

اس تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید نظام تعلیم وسعت اور تکنیکی انضمام میں سبقت رکھتا ہے، لیکن اس میں اخلاقیات واقدار پر مبنی، ذاتی نوعیت اور جامع جہت کا فقدان ہے جو گروکل روایت میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔

گروکل علمی نظام سے حاصل کردہ اسباق

گروکل علمی نظام لازوال تعلیمی اصول پیش کرتا ہے جو اکیسویں صدی میں بھی اہم ہیں۔ اس نظام کے درج ذیل اسباق جدید تعلیم میں اپنائے جا سکتے ہیں:

اقدار پر مبنی تعلیم

اخلاقیات، نظم وضبط اور روحانیت کو مرکزی دھارے کی تعلیم میں شامل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ گروکل کے تعلیمی نظام اور روایت میں بنیادی خصائص کے طور پر ضابطہ، اخلاقی کردار اور ہمدردی پر زور دیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی نظام اور موجودہ اسکولوں میں اقدار پر مبنی تعلیم کو بنیادی طور پر شامل کیا جانا چاہیے۔

ایک سرپرست کے طور پر استاد کا کردار

جدید نظام میں اساتذہ کے تدریسی کردار کے برعکس، گروکل نظام میں استاد

ایک سرپرست اور رہنما ہوتے تھے جو نہ صرف ذہنی صلاحیتوں بلکہ طالب علم کی جذباتی اور اخلاقی ترقی پر بھی زور دیتے تھے۔ اسکولوں میں ذاتی مشورے کو فروغ دینا طلبا کی مصروفیت کو بہتر بنا سکتا ہے اور اضطراب کو کم کر سکتا ہے۔

مجموعی ترقی پر مرکزی توجہ

گروکل کے تعلیمی نظام میں طلبا کی ہمہ جہت (جسم، دماغ اور روح) ترقی پر زور دیا جاتا تھا۔ یوگا، موسیقی، مارشل آرٹس اور مراقبہ جیسے مضامین کو بغیر کسی رکاوٹ کے مربوط کیا گیا تھا۔ جدید نصاب کو ذہنی تندرستی، جسمانی صحت اور جذباتی ذہانت کو مجموعی طور پر فروغ دینا چاہیے۔

تجرباتی اور ہنر پر مبنی تعلیم

قدیم ہندوستان میں اکتساب کی جڑیں حقیقی زندگی کے کاموں، عملی مظاہروں اور باہمی تعاون پر مبنی تھیں۔ آج کی تعلیم میں نظریہ اور عمل کے درمیان فرق کو ختم کرنے کے لیے پروجیکٹ پر مبنی اکتساب، انٹرنشپ اور پیشہ ورانہ مہارتوں کو شامل کیا جانا چاہیے۔

فطرت کے مطابق اکتساب

گروکل نظام تعلیم نے ماحولیات کے مطابق طرز زندگی اور ماحولیاتی بیداری کی حوصلہ افزائی کی۔ جدید تعلیم میں ماحولیاتی مطالعات اور فطرت پر مبنی اکتساب کو شامل کرنے سے موسمیاتی بحران پر قابو پانے اور ذمہ دار شہری پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستانی تعلیمی نظام کی تجدید نو

ملک کی نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 ہندوستانی تعلیمی نظام کی تجدید نو اور عصری تعلیم میں گروکل جیسی اقدار کو شامل کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے:

گروکل اقدار کے مطابق قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں دفعات

- کثیر شعبہ جاتی اور تجرباتی تعلیم: یہ پالیسی ایک آزاد، وسیع اور جامع نصاب کی وکالت کرتی ہے، جس میں آرٹس، سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم کا امتزاج ہوتا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اس امتزاج کی وکالت گروکل کے نظام تعلیم کی یاد دلاتا ہے۔
- ہندوستانی زبانوں اور ثقافت کا فروغ: قدیم درس گاہوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے یہ پالیسی مادری زبانوں میں درس وتدریس، کلاسیکی زبانوں اور ہندوستان کے خوبصورت اور زرخیز تہذیبی ورثے کو محفوظ کرنے پر زور دیتی ہے۔
- نصاب میں ہندوستانی تعلیمی نظام: آیورویدا، یوگا، فلکیات اور سنسکرت کو اسکول اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل کرنے کے ساتھ، یہ پالیسی ہندوستانی تعلیمی نظام کے انضمام کو فروغ دیتی ہے۔

ہندوستانی تعلیمی نظام کو مربوط کرنے میں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کا کردار

SWAYAM، NPTEL اور Vidyadaan جیسے ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے تمام مضامین میں ہندوستانی علمی نظام سے متعلق مواد تک رسائی کو سہل بنا دیا ہے۔ یہ اقدامات ویدک ریاضی، ہندوستانی فلسفہ، کلاسیکی فنون اور سنسکرت کے آن لائن کورسز پیش کرتے ہیں۔ یہ قدیم حکمت کی تکنیکی طور پر فعال احیاء کی نمائندگی کرتے ہیں، جو عالمی قارئین کے لیے قابل رسائی ہے۔

عصری تعلیم میں گروکل کے اقدار کے احیاء کے چیلنجز

اگرچہ گروکل نظام کی فلسفیانہ اور تدریسی خوبیاں ان اقدار کے احیاء کی ضرورت واہمیت پر زور دیتی ہیں اور آج اس سمت میں کوششیں بھی کی جارہی ہیں لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود عملی نفاذ میں مختلف قسم کے چیلنجز درپیش ہیں جیسے:

ٹیکنالوجی اور جدید معیار کے ساتھ قدیم روایات کو متوازن کرنا

جدید تعلیم تکنیکی ترقی، معیاری تشخیص اور عالمی معیارات کے ساتھ گہرائی سے جڑی ہوئی ہے۔ جدید اور قدیم تعلیمی روایت سے سمجھوتہ کیے بغیر قدیم اقدار کو یکجا کرنے کے لیے ایک صحت مند توازن کی ضرورت ہے۔ اس کو یقینی بنانے کے لیے کہ ایک محتاط منصوبہ بندی کی ضرورت ہے تاکہ قدیم روایات عصری معیار سے متصادم ہونے کے بجائے اس کی تکمیل کر سکے۔

ہندوستانی تعلیمی نظام پر مبنی درس گاہ میں اساتذہ کی تربیت

آج بھی ملک میں اساتذہ کی تعلیم کے پروگرام بڑی حد تک مغربی تعلیمی ماڈلز پر مبنی ہیں، جن میں ہندوستانی تعلیمی نظام کی اقدار اور روایات کی کمی ہے۔ اساتذہ کے تربیتی اداروں میں صلاحیت سازی اور نصاب میں اصلاحات کی فوری ضرورت ہے تاکہ ایسے اساتذہ تیار کیے جاسکیں جو گروکل کے طریقوں سے متاثر ہو کر اقدار پر مبنی اور تجرباتی تعلیم فراہم کر سکیں۔

بنیادی ڈھانچے کی حدود اور نصاب کو دوبارہ تیار کرنے کی ضرورت

جامع اور فطرت سے ہم آہنگ اکتسابی ماحول تیار کرنے اور اسے نافذ کرنے کے لیے نصاب کو دوبارہ تیار کرنے، سیاق وسباق کے لحاظ سے حساس تدریسی مواد کی ترقی اور بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ان تبدیلیوں میں ضروری سرمایہ کاری اور پالیسی کی حمایت شامل ہے۔

نوآبادیاتی اثر ورسوخ یا مغربی ماڈلز کی وجہ سے مزاحمت

نوآبادیاتی اثر ورسوخ والی دو تین صدیوں نے ملک میں ایسے عوامی تاثرات کو تشکیل دیا ہے کہ جدید تعلیم ہی سائنسی تعلیم ہے۔ اس کی وجہ سے قدیم تعلیمی نظاموں کے خلاف شکوک وشبہات یا مزاحمتیں پیدا ہونے لگیں، جنھیں بعض اوقات فرسودہ یا غیر متعلقہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس ذہنیت پر قابو پانا ضروری ہے۔

خلاصہ کلام

گروکل نظام اور جدید تعلیم کے درمیان موازنہ دونوں کی انفرادی خوبیوں اور قابل ذکر حدود کو ظاہر کرتا ہے۔ گروکل نظام تعلیم نے اخلاقیات، فطرت، رہنمائی اور ذاتی نوعیت کی تعلیم پر زور دینے کے ساتھ جامع، اقدار پر مبنی تجرباتی نقطہ نظر کو فروغ دیا ہے۔ جدید تعلیمی نظام کے اندر بے مثال رسائی، وسعت اور تکنیکی انضمام پایا جاتا ہے۔ اس میں اخلاقی، روحانی اور جذباتی ترقی کی گہرائی کا فقدان ہے۔ آج کے تناظر میں، یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ کوئی بھی نظام مکمل نہیں ہے۔ ایک مخلوط ماڈل جو گروکل نظام کی فلسفیانہ گہرائی اور اخلاقی اقدار کو جدید تعلیم کی رسائی، ساخت اور تکنیکی آلات کے ساتھ شامل کرتا ہو وہی عصر حاضر کے طلبا کی متنوع ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں ایک تصور پیش کیا گیا ہے کہ ہندوستانی تعلیمی کا مستقبل ہندوستانی علمی نظام کو زندہ کرنے اور سیاق وسباق سے جڑے ہوئے جامع تعلیمی نظام کی تعمیر میں مضمر ہے جو ماضی اور حال دونوں سے رہنمائی وقوت حاصل کرتا ہے۔ قدیم حکمت اور جدید اختراع کے درمیان ہم آہنگی کو اپناتے ہوئے، ہندوستان ایک مفید و مستحکم اکتسابی ماحول تیار کر سکتا ہے جس سے نہ صرف کیریئر بلکہ کردار اور شعور کی پرورش بھی ہوگی۔

■

Dr. Aftab Alam
Asst. Professor, MANUU, College of Teacher Education
Ilyas Ashraf Nagar, Chandanpatti, Laheriasarai
Darbhanga- 846002 (Bihar)
Mob.: 8285835517 | aftabalameflu@gmail.com

1857 سے قبل کے فارسی اخبارات اور ان کے غیر مسلم مدیران

عامر فہد

برطانوی استعمار کے زیرِ سایہ ہندوستان میں جن فکری اور تہذیبی تبدیلیوں نے جنم لیا، ان میں صحافت کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم، تمدن، اور حکومت، سب پر ایک نئے زاویے سے روشنی پڑنے لگی تھی۔ انہی عوامل نے ہندوستانی معاشرے میں ایک ایسی فکری فضا پیدا کی جہاں اظہارِ رائے، احتجاج، اور قومی شعور کے لیے صحافت ایک ناگزیر ذریعہ بن کر ابھری۔ اس صحافت میں جہاں انگریزی اور بعدازاں اردو اخبارات نے اپنا اثر چھوڑا، وہیں فارسی صحافت بھی ایک خاموش مگر پراثر روایت کے طور پر قائم رہی۔ اس روایت میں غیر مسلم مدیران، اسکالرز کا کردار تحقیق کا ایک اہم اور نسبتاً کم دریافت شدہ باب ہے۔

جب ہندوستان میں جدید صحافت نے قدم رکھا تو اُس وقت ملک میں مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے ایسے گروہ ابھر رہے تھے جن کے خیالات، طرزِ زندگی، اور معاشرتی مقام میں تبدیلی آرہی تھی۔ مغربی تعلیم اور نئے ذرائع ابلاغ، جیسے چھاپہ خانہ، خطوط، ریل، ڈاک اور تار نے لوگوں کو نہ صرف قریب لانا شروع کیا بلکہ اُن کے افکار کو نئے سانچوں میں ڈھالنا بھی شروع کیا۔ رفتہ رفتہ، اس باہمی ربط نے ایک ایسی ہندوستانی رائے عامہ کو جنم دیا جو منظم انداز میں اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے لگی۔ اس رائے عامہ کی تشکیل اور اظہار میں اخبارات نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ابتدائی صحافتی سرگرمیاں بنیادی طور پر انگریزی زبان میں تھیں، جن کا مخاطب ایک مخصوص طبقہ تھا۔ تاہم، بہت جلد فارسی زبان، جو اس وقت تک ہندوستان کے علمی، عدالتی، اور ادبی حلقوں میں مستعمل تھی، بھی اس صحافتی دھارے میں شامل ہوگئی۔ فارسی اخبارات، نہ صرف عوامی شعور کی ترجمانی کرنے لگے، بلکہ انھوں نے برطانوی حکومت کی پالیسیوں پر تنقید، سماجی اصلاح، اور مذہبی رواداری جیسے موضوعات کو بھی اپنایا۔ ان فارسی مطبوعات میں کئی ایسے غیر مسلم مدیران شامل تھے، جنھوں نے نہایت سنجیدگی اور جرات مندی کے ساتھ اس زبان کو صحافت کے لیے استعمال کیا۔

فارسی زبان میں نکلنے والے ابتدائی اخبارات صرف اطلاعات یا خبررسانی کے لیے مخصوص نہ تھے، بلکہ وہ قومی شعور، تہذیبی شناخت، مذہبی رواداری، اور فکری آزادی جیسے موضوعات کا بھی احاطہ کرتے تھے۔ ان رسائل و جرائد میں جن غیر مسلم مدیروں نے خدمات انجام دیں، وہ نہ صرف زبان کے ماہر تھے، بلکہ اس تہذیبی روایت سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے جس میں فارسی ایک زندہ علمی زبان تھی۔ ان میں کئی ایسے افراد بھی شامل تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود فارسی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور اس زبان میں وہ سماجی اور سیاسی مکالمہ قائم کیا جو وقت کی ضرورت تھا۔ برطانوی دور میں فارسی اخبارات کے غیر مسلم مدیران نے صرف ایک زبان کو زندہ نہیں رکھا، بلکہ ایک فکر، ایک تہذیب، اور ایک شعور کو بھی باقی رکھا۔ ان کی تحریریں اس دور کی نہ صرف ترجمانی کرتی ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ کس طرح ہندوستانی سماج کے مختلف طبقے، زبان و مذہب کی تفریق سے بالاتر ہوکر آزادیِ اظہار اور فکری تعمیرِ نو کے مشترکہ سفر میں شریک تھے۔ آئندہ سطور میں ہم اس خاص پہلو کا جائزہ لیں گے جس کے تحت فارسی زبان میں جاری ہونے والے ان اخبارات کا تعارف پیش کیا جائے گا جن کے مدیران کا تعلق غیر مسلم طبقے سے تھا یہی وہ گوشہ ہے جو اس تحقیقی مطالعے کا مرکزی محور ہے۔

مرآۃ الاخبار

مرآۃ الاخبار کو فارسی زبان کا پہلا ہندوستانی اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اور یہ محض اتفاق نہیں، بلکہ فکری ارتقا، تہذیبی بیداری اور صحافتی شعور کے اس سفر کا پہلا شعوری قدم ہے جو ایک ہندوستانی، راجہ رام موہن رائے جیسے مردِ آزاد خیال کے ہاتھوں اٹھایا گیا۔ اس اخبار کو فارسی زبان کا پہلا ہندوستانی اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کی اس امتیازی حیثیت کی گواہی خود اُس زمانے کے معروف انگریزی پرچے کلکتہ جرنل میں شائع ہونے والے اشتہار سے بھی ملتی ہے۔ اس اعلان میں واضح طور پر اس کی اولیت کا دعویٰ کیا گیا، جو اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اس سے پہلے ہندوستان میں کسی فارسی اخبار کی اشاعت کا سراغ نہیں ملتا۔ اشتہار یوں ہے:

''اڈیٹر (مرآۃ الاخبار) عوام کو مطلع کرتا ہے کہ اس ملک میں اخبار بین طبقے کے لیے بہت سے اخبار شائع ہوتے ہیں لیکن اب تک فارسی کا کوئی اخبار شائع نہیں ہوا، جس سے ان لوگوں کو عموماً جو انگریزی سے ناواقف ہیں اور شمالی ہند کے رہنے والوں کو خصوصاً خبریں معلوم ہوسکیں۔ چنانچہ وہ (اڈیٹر مرآۃ الاخبار) ایک فارسی اخبار کے اجرا کا کام شروع کررہا ہے۔''[1]

یہ اخبار 12 اپریل 1822 (مطابق 29 شعبان 1237ھ) کو کلکتہ سے 'مرآۃ الاخبار' کے عنوان سے راجہ رام موہن رائے کی ادارت میں منظرِ عام پر آیا۔ راجہ رام موہن رائے نے اس اخبار کو محض ایک اشاعتی عمل نہیں بلکہ ایک تہذیبی پیغام کے طور پر بھی پیش کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب 1229 بنگلہ کلینڈر کا نیا سال طلوع ہوا، تو انھوں نے 'مرآۃ الاخبار' کو ایک فکری تہنیت کے

طور پر پیش کرتے ہوئے محبانِ وطن کو نیا سال مبارک کہا۔ مگر یہ مبارکباد عام معنوں میں نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی صدا تھی جو دلوں کو بیدار کرتی، ذہنوں کو جھنجھوڑتی اور ضمیروں کو سوال کرنے پر آمادہ کرتی تھی۔ یہ اخبار محض روزمرہ خبروں یا سرکاری اعلانات تک محدود نہ تھا۔ اس میں ملکی اور بین الاقوامی حالات، مذہبی ہم آہنگی، معاشرتی اصلاحات، عقلی مکالمہ، اور آزادیٔ رائے جیسے موضوعات کو بیباکی اور وقار کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ ہر شمارہ گویا ایک فکری دستاویز تھا، جو محض وقت کی خبر نہیں بلکہ تاریخ کا دھارا بدلنے کی تمنا رکھتا تھا۔ راجہ صاحب کی تحریروں میں جو حکمت، دوراندیشی اور فلسفیانہ گہرائی تھی، وہ مرآۃ الاخبار کے صفحات پر منعکس ہو کر ایک نئی صحافتی تہذیب کی بنیاد رکھتی گئی۔

مرآۃ الاخبار کی سب سے اہم اور امتیازی خصوصیت اس کا زبان و اسلوب تھا۔ اخبار کا بنیادی مقصد اصلاحِ معاشرہ تھا، اور جیسا کہ مسٹر بیلی نے نشاندہی کی، وہ نہ صرف عیسائی مشنریوں کی تعلیمات پر جرات مندانہ نکتہ چینی کرتا تھا بلکہ توہم پرستی، تباہ کن رسوم و رواج، اور سماجی جمود کے خلاف ایک فکری مزاحمت کی صورت میں بھی سامنے آیا۔2 راجہ رام موہن رائے نے اپنے پہلے اداریے میں جس وضاحت سے مقاصد بیان کیے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اخبار صرف خبروں کا مجموعہ نہ تھا بلکہ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ہندوستانی سماج اپنی کمزوریوں، امیدوں اور ممکنات کو دیکھ سکتا تھا۔ اپنے اداریہ میں وہ لکھتے ہیں:

''خدا کا شکر ہے کہ انگریزوں کی سلطنت میں کلکتے کے رہنے والوں کو وہ آزادی اور تحفظ حاصل ہے جس کو معقولیت پسند اور مدنی الطبع انسان مذہبی اور مدنی اداروں کا مقصد وحید قرار دیتے ہیں۔ افراد اور ان کی ملکیت کی حفاظت کے لیے قانون انگلستان کے مطابق اس شہر میں بھی ان گنت قوانین بنائے گئے ہیں جن کے مطابق انصاف کیا جاتا ہے اور سزائیں دی جاتی ہیں۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ معمولی حیثیت کا آدمی اپنے حقوق کے مطالبے میں نہ صرف اونچے درجے کے کسی بھی آدمی کے برابر سمجھا جاتا ہے بلکہ بڑے سے بڑے سرکاری افسر کے مقابلے میں بھی اس کو وہی برابری کی حیثیت حاصل رہتی ہے۔ ہر شخص کو اپنے جذبات ہی کے اظہار کی آزادی نہیں ہے بلکہ دوسروں کے افعال پر بھی نکتہ چینی کی جاسکتی ہے اگر اس سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔ ان حالات کے ماتحت اس قوم (انگریز) کے کچھ افرادِ عوام کے فائدے کے لیے اس ملک کی اور دوسرے ملکوں کی خبر میں چھاپتے ہیں۔ لیکن ان سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جو انگریزی سے نابلد ہیں وہ یا تو انگریزی دانوں سے اخبار پڑھوا کر سنتے ہیں یا خبروں سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر مجھ حقیر ترین انسان کو فارسی میں ایک ہفتے وار

> برطانوی دور میں فارسی اخبارات کے غیر مسلم مدیران نے صرف ایک زبان کو زندہ نہیں رکھا، بلکہ ایک فکر، ایک تہذیب، اور ایک شعور کو بھی باقی رکھا۔ ان کی تحریریں اس دور کی نہ صرف ترجمانی کرتی ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ کس طرح ہندوستانی سماج کے مختلف طبقے، زبان و مذہب کی تفریق سے بالاتر ہو کر آزادیٔ اظہار اور فکری تعمیرِ نو کے مشترکہ سفر میں شریک تھے۔

اخبار جاری کرنے کی خواہش ہوئی ہے۔ دیسی برادری کے سب باعزت افراد اس زبان سے واقف نہیں۔ یہ اخبار ان سب لوگوں تک پہنچے گا جو اس کے خواہش مند ہوں گے۔ اخبار جاری کرنے سے میری غرض نہ تو امیروں کی یا اپنے دوستوں کی مدح سرائی کرنا ہے اور نہ عزت و جاہ اور سلطنت و عنایت کا حصول ہی میرے پیش نظر ہے۔ مختصر یہ کہ اس اخبار کی ذمہ داری لینے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کے سامنے ایسی چیزیں پیش کی جائیں جن سے ان کے تجربوں میں اضافہ اور ان کی سماجی ترقی ہو سکے۔ اربابِ حکومت کو بھی رعایا کا صحیح حال بتلایا جائے اور رعایا کو ان کے حکمرانوں کے قانون اور رسم و رواج سے آگاہ کیا جائے تاکہ حکمرانوں کو اپنی رعایا کی تکلیفیں دور کرنے کا موقع ملے اور رعایا کی دادرسی ہو سکے۔''3

مرآۃ الاخبار نے اپنی قلیل اشاعتی مدت میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اخبار نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا کے ممالک میں بھی ارسال کیا جاتا تھا۔4 داخلی خبروں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل پر بھی مساویانہ توجہ دی جاتی تھی، جس کا ثبوت پہلے شمارے میں شائع شدہ خبروں، تبصروں اور مضامین کے عنوانات سے ملتا ہے۔

راجہ رام موہن رائے آزادیٔ اظہار کے پرجوش علمبردار تھے اور برطانوی استبداد کے زیرِ سایہ سخت صحافتی پابندیوں کے باوجود اپنے خیالات کا اظہار بے باکی، حکمت اور فکری استقامت کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ مرآۃ الاخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں آئرلینڈ کی سیاسی بے چینی اور وہاں برطانوی ظلم و استبداد پر کھل کر تنقید کی گئی تھی۔ یورپ میں برطانیہ کی پالیسیوں پر راجہ رام موہن رائے کی بے باکانہ رائے نے بعض انگریزوں کو ناخوش کیا، مگر اس وقت ہندوستان میں پریس کو جزوی آزادی حاصل تھی، جس کے باعث حکومت براہِ راست مداخلت نہ کر سکی۔ تاہم 1823 میں جب جان ایڈمز (John Adams) نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا، تو اس نے فوری طور پر پریس آرڈیننس (Press Ordinance) جاری کیا۔ اس حکم نامے کا مقصد ایسے مضامین اور اخبارات کو کچلنا تھا جو حکومت کے خلاف نفرت، تنقید یا بدظنی پیدا کرتے ہوں یا جن سے امنِ عامہ کے متاثر ہونے کا خطرہ ہو۔ اس آرڈیننس کے تحت ہر اخبار کے لیے سرکاری لائسنس لازمی قرار دیا گیا، اور حکومت کو کسی بھی اخبار کو بند کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہو گیا۔5 اس اقدام نے ہندوستانی پریس کی آزادی پر پہلی بڑی کاری ضرب لگائی اور مرآۃ الاخبار جیسے جرات مند صحافتی ادارے شدید دباؤ کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ اس فیصلہ پر اظہارِ رنج کرتے ہوئے راجہ رام موہن نے 14 اپریل 1823 کے خصوصی شمارے کے ساتھ اس اخبار کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ راجہ رام موہن رائے نے مرآۃ الاخبار کے ذریعے جو فکری و صحافتی تحریک محض ایک سال کی قلیل مدت میں اٹھائی، اس کے اثرات وقتی نہ تھے بلکہ دیرپا اور گہرے ثابت ہوئے۔ اس اخبار نے جس جرات، بصیرت اور اصلاحی جذبے کے ساتھ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی، وہ بعد کی فارسی صحافت کے لیے سنگِ بنیاد بنی۔ مرآۃ الاخبار کی مقبولیت اور اس

کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں سے دیگر فارسی اخبارات کا اجرا اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ راجہ رام موہن رائے کی یہ صحافتی کاوش محض وقتی ردِعمل نہ تھی، بلکہ ایک فکری روایت کی ابتدا تھی جس نے ہندوستانی فارسی صحافت کی تاریخ کو ایک نئی سمت دی۔

جام جہاں نما

مرآۃ الاخبار کی بندش کے بعد اگرچہ ہندوستانی فارسی صحافت کو شدید دھچکا پہنچا، تاہم یہ روایت یہاں ختم نہ ہوئی۔ صحافت کے اس تسلسل کو برقرار رکھنے والا اگلا اہم سنگِ میل جامِ جہاں نما تھا، جو کلکتہ سے شائع ہونے والا دوسرا باقاعدہ فارسی اخبار قرار پاتا ہے۔ اس کی اشاعت نہ صرف فارسی صحافت کی بقا کی علامت تھی، بلکہ ایک نئے صحافتی مزاج کی ابتدا تھی جس میں معلومات، ترجمہ اور خبروں کی ترسیل کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ جامِ جہاں نما کے اجرا کا بنیادی مقصد انگریزی اخباروں میں شائع ہونے والی خبروں کو فارسی زبان میں منتقل کرنا تھا تاکہ وہ وسیع حلقہ قارئین، جو انگریزی زبان سے ناآشنا تھا، ملکی و بین الاقوامی حالات سے باخبر رہ سکے۔ اس کے علاوہ یہ اخبار کمپنی کے زیرِ انتظام علاقوں سمیت ہندوستان کے دیگر خطوں کی خبریں بھی قارئین تک پہنچانے کی سعی کرتا تھا، جو اس کے مشمولاتی دائرے کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جامِ جہاں نما کی ادارت غیر مسلم افراد کے ہاتھوں میں تھی۔ اخبار کے اجرا سے متعلق جو سرکاری دستاویزات نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ ہیں، ان سے ہمیں اس اشاعتی منصوبے کی مکمل تصویر ملتی ہے۔ ان دستاویزات کے مطابق، جامِ جہاں نما کی اشاعت کے لیے 20 مارچ 1822 کو باقاعدہ درخواست دی گئی، جس پر ہری ہردت بنگو کے دستخط ثبت ہیں۔ اس ابتدائی درخواست سے ہمیں ایڈیٹوریل اور ادارتی انتظامیہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ اخبار کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے، جو اس وقت کے ایک موقر فارسی نویس اور معتبر اہلِ قلم مانے جاتے تھے۔ اخبار کا ناشر کلکتہ کی معروف انگریزی تجارتی کمپنی ولیم پیئرس ہاپ کنس اینڈ کمپنی تھی،[6] جو اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس دور کی صحافت صرف فکری یا اصلاحی مقصد تک محدود نہ تھی، بلکہ اس میں تجارتی مفادات اور ادارہ جاتی سرپرستی بھی شامل ہونے لگی تھی۔ یہ پہلو فارسی صحافت کے ارتقائی سفر میں ایک نئی جہت کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں زبان، ترجمہ، تجارت اور خبر کا امتزاج ایک نیا صحافتی چہرہ سامنے لاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ پہلو بھی اس بات کا مظہر ہے کہ فارسی زبان اس دور میں محض مذہبی اظہار کا ذریعہ نہ تھی، بلکہ ایک مشترکہ تہذیبی سرمایہ تھی جس میں ہندو، مسلم، پارسی، اور دیگر طبقات نے یکساں دلچسپی لی۔ غیر مسلم مدیران کا فارسی صحافت میں نمایاں کردار اس بات کا ثبوت ہے کہ فارسی زبان نے ہندوستان میں ایک بین المذاہب علمی و فکری پل کا کام کیا، جس پر تمام قوموں اور عقائد کے افراد نے اعتماد کے ساتھ سفر کیا۔

اخبار کی ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت کسی محدود طبقے یا صرف ہندوستانی قارئین کے لیے مخصوص نہ تھی، بلکہ اسے یورپی حلقوں تک رسائی کے پیشِ نظر سوچ سمجھ کر ترتیب دیا جاتا تھا۔ ہر شمارے کے پہلے صفحے پر، دونوں جانب ایسٹ انڈیا کمپنی کے شاہی نشانات یعنی تاجِ برطانیہ کی تصویری علامتیں نہایت نمایاں انداز میں چھاپی جاتی تھیں، جن کے درمیان اخبار کا نام جامِ جہاں نما درج ہوتا تھا۔ اس کے نیچے شمارہ نمبر، تاریخ اور دن واضح کیے جاتے، اور ان کے نیچے ایک مختصر انگریزی اپیل درج کی جاتی تھی جو اخبار کی قیمت سے متعلق معلومات فراہم کرتی تھی۔[7] یہ انگریزی اپیل درحقیقت اخبار کا اشتہاری بیان بھی تھا، جو ہر شمارے میں شامل رہتا تھا۔ اس بات سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اخبار کے مخاطب صرف مقامی قارئین نہ تھے بلکہ یورپی ناظرین بھی اس کے اہم قاری تھے۔ یہ بات مزید پختگی اختیار کر جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اخبار کی زبان فارسی ہونے کے باوجود یورپی طبقہ اس سے واقفیت رکھتا تھا، بلکہ اسے باقاعدگی سے پڑھتا بھی تھا۔ یورپی قارئین کی اس دلچسپی کا ذکر اس وقت کے برطانوی اعلیٰ حکام کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔

1827 میں جب لارڈ ولیم بینٹک نے ہندوستانی اخبارات کے اثرات اور دائرۂ اثر کا جائزہ لینے کی خواہش ظاہر کی، تو مسٹر اے۔ اسٹرلنگ نے 1824 سے 1827 تک کی تمام قابلِ ذکر تفصیلات پر مشتمل رپورٹ پیش کی، جس میں جامِ جہاں نما کا بھی خصوصی تذکرہ کیا گیا۔[8] یہ اقدام اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ یہ اخبار نوآبادیاتی حکومت کی نظروں میں بھی اہمیت رکھتا تھا اور اس کے اثرات کو سنجیدگی سے دیکھا جاتا تھا۔

اخبار کے پہلے صفحے پر نہ صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی علامات چھاپی جاتی تھیں بلکہ کمپنی کی داخلی سرگرمیوں، پالیسیوں، اشتہارات اور عہدیداروں کی حرکات و سکنات کو بھی بڑی وضاحت اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ اس امر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار کو سرکاری پشت پناہی حاصل تھی اور غالب امکان یہی ہے کہ اس کا اجرا کمپنی کی مصلحتوں کے تحت کیا گیا تھا۔[9] اس کے ذریعے کمپنی ایک طرف مقامی طبقے کو اپنی سرگرمیوں سے واقف رکھنا چاہتی تھی، تو دوسری جانب فارسی خواں طبقے پر نرم اقتدار کا نفسیاتی اثر بھی قائم رکھنا چاہتی تھی۔ یہی نہیں، بلکہ اخبار میں کمپنی کے وفادار امرا، جاگیرداروں اور انگریز افسران کی سرگرمیوں کو خاص طور پر نمایاں کیا جاتا تھا، جس سے اس کی سیاسی وابستگی اور ادارتی جھکاؤ مزید عیاں ہوتا ہے۔

اس اخبار کی ہیئت میں 27 اگست 1828 کے بعد ایک قابلِ ذکر تبدیلی رونما ہوئی۔ 3 دسمبر 1828 کے شمارے سے کمپنی کا سرکاری نشان اچانک غائب ہو گیا، اور اس کے ساتھ ساتھ ان خبروں کا سلسلہ بھی بند ہو گیا جن میں صاحبانِ والا شان کی تقرری و تبدیلیوں کی اطلاع گزٹ کے انداز میں دی جاتی تھی۔ اخبار نے اس اچانک تبدیلی کی کوئی باضابطہ وضاحت تو فراہم نہیں کی، لیکن دستیاب تاریخی شواہد سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ جامِ جہاں نما نے اپنے چھٹے سال میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک تنقیدی مضمون شائع کیا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کو سخت ناگوار گزرا۔ اس مضمون کی اشاعت کے نتیجے میں اخبار کی مالی امداد بند کر دی گئی گویا کمپنی بہادر نے اس ادارتی خودمختاری کی ہلکی سی جھلک پر سخت ناراضی کا اظہار کیا۔[10] یہ واقعہ اگرچہ اخبار کے مالی وسائل کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا، مگر صحافتی آزادی کے لیے ایک مثبت موڑ بن گیا۔ اخبار پر اب وہ دباؤ نہ رہا جو پہلے تھا، اور اس کے اداریے نیم سرکاری روش سے ہٹ کر ایک خالص اخباری رنگ اختیار کرنے لگے۔ خبروں کے انتخاب میں جو سرکاری احتیاط جھلکتی تھی، وہ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی، اور جامِ جہاں نما نے ایک آزاد شناخت کی جانب قدم بڑھایا۔

اخبار سیرام پور

فارسی صحافت کی تاریخ میں سیرام پور کے مسیحی

مبلغین کا کردار بھی بہت نمایاں ہے، جنھوں نے انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں نہ صرف فارسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا بلکہ ہندوستان میں اخباری اشاعت کے تجربے کو بھی نئی جہت بخشی۔ سی رام پور وہ خطہ ہے جہاں مشنریوں نے تعلیمی و مذہبی خدمات کے تحت ایک مرکزِ تبلیغ اور بعدازاں سی رام پور کالج کی بنیاد رکھی۔

اس منصوبے کے روحِ رواں ڈاکٹر جوشا مارش مین تھے، جو اس سے قبل ڈگ درشن (1818) نامی بنگالی و انگریزی زبان کے دولسانی رسالے اور فرینڈ آف انڈیا جیسے مذہبی رسالے کے اجرا کا تجربہ رکھتے تھے۔ فارسی زبان کے اس اخباری منصوبے سے قبل مارش مین نے حکومتِ برطانیہ سے باقاعدہ مالی تعاون کی درخواست کی۔ گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ کے چیف سکریٹری نے یہ درخواست فارسی شعبہ کے افسر مسٹر اسٹرلنگ کے حوالے کی، جو فارسی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔[11] اسٹرلنگ کی ہمدردانہ رائے کے نتیجے میں حکومت نے اخبار سیرام پور کے اجرا کی منظوری دی۔

ابتدا میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اخبار کے نسخے دہلی، آگرہ، بنارس اور کلکتہ کے اہم تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں ارسال کیے جائیں گے تاکہ اس کی رسائی علمی اور افسرانہ طبقے تک ہو۔

تاہم، یہ صحافتی سلسلہ صرف دو سال جاری رہ سکا۔ مئی 1828 میں حکومت نے مالی معاونت بند کردی، جس کی سرکاری توجیہ مالی تنگی تھی، مگر درپردہ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت فارسی زبان میں شائع ہونے والے ایک غیر سرکاری اور مذہبی رنگ رکھنے والے اخبار کی اعانت جاری رکھنے سے گریزاں تھی۔ اس کے برعکس، مشنریوں نے اپنی توجہ بنگالی زبان پر مرکوز کردی اور سماچار درپن جیسے اخبارات کو کامیابی سے جاری رکھا،[12] جو زیادہ وسیع دائرہ اثر رکھتے تھے اور عوامی زبان ہونے کے ناتے اُن کے تبلیغی مقاصد کے لیے زیادہ موزوں تھے۔

اخبار سیرام پور کی اشاعت کی بندش لارڈ امہرسٹ کے دورِ اقتدار کے آخری ایام میں ہوئی۔ جب لارڈ ولیم بینٹک جولائی 1828 میں گورنر جنرل بنے، تو مارش مین نے دوبارہ اخبار کی اشاعت کے لیے درخواست دی، لیکن سابقہ حکومتی موقف برقرار رکھا گیا۔ نہ مالی تعاون بحال کیا گیا اور نہ ہی ڈاک محصول میں نرمی دی گئی۔

بنگال ہیرالڈ

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا کہ ہندوستانی صحافت کی بنیاد اور اس کے ارتقائی سفر میں راجہ رام موہن رائے کا کردار سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1821 میں بنگالی ہفت روزہ سمبد کمودی کے اجرا سے لے کر 1822 میں فارسی اخبار مرآۃ الاخبار کی اشاعت تک، انھوں نے اخباری صحافت کو ہندوستانی عوام کی آواز بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس زمانے میں انگریز حکومت کی معاندانہ پالیسیوں، سنسرشپ، اور دباؤ کے باعث انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر ان کے جیسا مردِ میدان بھی وقتی طور پر دل برداشتہ ہو کر صحافت سے کنارہ کش ہو گیا۔ تاہم، جب لارڈ ولیم بینٹک کا نسبتاً اعتدال پسندانہ رویہ سامنے آیا، تو رام موہن رائے کو ایک بار پھر امید بندھی کہ شاید اظہار کی آزادی کا دائرہ کچھ وسیع ہو۔ اسی امید پر انہوں نے دوبارہ صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور ایک نئے طرز کا اخبار شائع کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ اس نئی کاوش کا نتیجہ 19 مئی 1829 کو بنگال ہیرالڈ کی اشاعت کی صورت میں سامنے آیا، جو نہ صرف ایک سیاسی، ادبی اور تجارتی نوعیت کا اخبار تھا بلکہ اپنے طرز کا منفرد تجربہ بھی تھا۔ یہ پہلا ایسا اخبار تھا جو تین زبانوں بنگالی، فارسی اور انگریزی میں بیک وقت شائع ہوتا تھا،[13] اور جس کی ادارت ایک ہندوستانی (نیل رتن ہلدر) اور ایک انگریز (رابرٹ گمری مارٹن) کی مشترکہ نگرانی میں انجام دی جاتی تھی۔[14]

بنگال ہیرالڈ کو ابتدا ہی سے کلکتہ کے بااثر اور روشن خیال حلقوں کی حمایت حاصل رہی۔ اس کے اجرا سے قبل مختلف مقامی اخبارات میں ایک اشتہار شائع ہوا، جس پر شہر کے چھ معزز شہریوں کے دستخط ثبت تھے۔ ان ناموں میں دوارکا ناتھ ٹیگور، پرسنا کمار ٹیگور، راجہ رام موہن رائے اور راج کشن سنگھ جیسے نامور افراد شامل تھے۔ ان شخصیات کی وابستگی نہ صرف اخبار کی فکری ساکھ کو مستحکم کرتی تھی بلکہ اس امر کی بھی علامت تھی کہ یہ اخبار محض خبروں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری تحریک کا پرچم بردار ہے۔ اخبار کے ابتدائی شماروں سے جو نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساخت دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں یورپ کی خبریں شامل کی جاتی تھیں اور دوسرے میں ایشیائی دنیا کی اطلاعات، جس پر واضح طور پر ایشیا ڈپارٹمنٹ درج ہوتا تھا۔ اسی اخبار میں ہم کو اُس وقت کے مختلف سالناموں اور اشاعتی اداروں کے اشتہارات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، جن میں بنگال اینول اور آرمی لسٹ نمایاں ہیں۔ یہ اشتہارات اس بات کی بھی گواہی دیتے ہیں کہ اخبار نہ صرف خبروں کی ترسیل کا ذریعہ تھا بلکہ علمی، ادبی اور تجارتی سرگرمیوں کا مظہر بھی تھا۔

اس اخبار کا بنیادی مقصد نہ صرف خبریں دینا تھا بلکہ قومی سطح پر ایک فکری بیداری پیدا کرنا بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار میں ان مسائل پر بھی توجہ دی گئی جو براہِ راست ہندوستانی عوام کی زندگیوں کو متاثر کرتے تھے۔ تاہم، افسوس کا مقام ہے کہ یہ روشن خیال تحریک زیادہ عرصے جاری نہ رہ سکی۔ 6 اگست 1829 کے شمارے میں ایک نوٹس کے ذریعے اعلان کیا گیا کہ رام موہن رائے، دوارکا ناتھ ٹیگور، پرسنہ کمار ٹیگور اور نیل رتن ہلدر اب اخبار کی ملکیت سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ اس اعلان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان افراد نے اپنے اصولوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور جب محسوس کیا کہ اخبار ان کی فکری ترجمانی سے ہٹ رہا ہے، تو انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس علیحدگی کے بعد اخبار کا زوال تقریباً یقینی ہو گیا۔ رابرٹ گری مارٹن کی انگلستان واپسی کے بعد جب کیپٹن ڈی ایل رچرڈسن کو ادارت سونپی گئی، تو اخبار کے مشن اور اس کی روح میں وہ حرارت باقی نہ رہی۔ بالآخر 1843 میں یہ اخبار بنگال ہرکارو اینڈ کرانیکل میں ضم ہو کر محض ایک ضمیمہ بن کر رہ گیا۔[15]

بنگودت

فارسی اور بنگلہ کے امتزاج سے وجود میں آنے والا اخبار بنگودت صرف ایک لسانی تجربہ نہ تھا، بلکہ نوآبادیاتی ہندوستان میں فکر و آگہی کی ایک ایسی شعاع تھی جو وقت کی گرد میں بھی مدھم نہ ہوئی۔ اس کی اشاعت کے لیے 10 اپریل 1830 کو باقاعدہ درخواست دی گئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب صحافت کو صرف خبر رسانی کا ذریعہ نہیں بلکہ بیداریِ شعور، اصلاحِ معاشرہ اور فکری آزادی کا ایک موثر ہتھیار سمجھا جانے لگا تھا۔ اس اخبار کی ادارت ایک ایسے شخص نے سنبھالی جس کا نام پہلے ہی صحافتی دنیا میں معتبر حیثیت اختیار کر چکا تھا— نیل رتن ہلدر، جو بنگال ہیرالڈ کے شریک مدیر رہ چکے تھے۔ بعد ازاں، بھولا ناتھ سین اور مہیش چندر رائے جیسے اہلِ قلم نے بھی اس اخبار کی ادارت کا فریضہ انجام دیا۔[16] یہ محض چند نام نہیں، بلکہ ان ناموں کے پیچھے وہ فکری و

تہذیبی منظرنامہ ہے، جس میں غیر مسلم اہلِ دانش نے فارسی زبان کی خدمت کو اپنی تمدنی ذمہ داری سمجھا، اور اپنی فکری وابستگیوں کو صحافتی اظہار کی صورت میں مجسم کیا۔

آگرہ اخبار

فارسی صحافت کے غیر مسلم مدیران میں ڈاکٹر ہنڈرسن کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے، جنھوں نے 1832 میں آگرہ اخبار کے اجرا کے ذریعے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ پورے ہندوستان میں فارسی صحافت کی ایک نئی راہ ہموار کی۔[17] آگرہ اخبار محض فارسی زبان کا ایک اخبار نہیں تھا، بلکہ یہ شمالی ہند کا پہلا اخبار تھا جس نے دیسی زبان میں منظم صحافت کی بنیاد رکھی۔ اس اخبار کا اجرا ڈاکٹر ہنڈرسن کے قائم کردہ آگرہ پریس سے ہوا، جو مطابع ہند کی تاریخ میں کان پور پریس اور میرٹھ پریس کے بعد تیسرا معروف چھاپہ خانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والا آگرہ اخبار دراصل ایک ایسی جرأت مندانہ علمی کاوش تھی جس کا مقصد فارسی زبان میں جاری صحافت کو نئی جہت دینا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی اپنی سرکاری حیثیت کھو چکی تھی اور اردو اور انگریزی تیزی سے زبانِ اقتدار بنتی جا رہی تھیں، ایسے میں ایک غیر مسلم یورپی دانشور کی جانب سے فارسی اخبار کا اجرا نہ صرف حیرت انگیز تھا بلکہ اس امر کا ثبوت بھی تھا کہ فارسی کو محض مسلم طبقے تک محدود زبان تصور کرنا علمی تنگ نظری ہوگی۔

ڈاکٹر ہنڈرسن نے ابتدائی ایک سال تک یہ اخبار فارسی رسم الخط میں جاری رکھا۔ تاہم، جب انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ فارسی رسم الخط میں قارئین کی تعداد محدود ہے اور اخبار کے پھیلاؤ میں رکاوٹ آ رہی ہے، تو نومبر 1832 میں اسے انگریزی زبان میں منتقل کر دیا۔[18] یہ تبدیلی صرف زبان کی نہیں تھی، بلکہ صحافت کی پیشہ ورانہ سمت کا تعین بھی تھا۔ آگرہ اخبار کے انگریزی ایڈیشن نے ابتدا میں اگرچہ کوئی خاص معیار پیش نہ کیا، مگر حالات اس وقت یکسر بدل گئے جب مسٹر ہنری ٹانڈے اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ ان کے زیر ادارت اخبار کی ظاہری ساخت، ادارتی معیار، اور مواد کا تنوع اس حد تک بہتر ہوا کہ یہ اخبار جلد ہی ہندوستان کے ممتاز جرائد میں شمار ہونے لگا۔ مسٹر ٹانڈے کی وفات کے بعد اخبار کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کی کوشش کی گئی، اور ان کے دو اعزہ مسٹر اے سانڈرس اور پی سانڈرس نے ادارت کی باگ ڈور سنبھالی، لیکن وہ بھی زیادہ دیر اس میدان میں نہ رہ سکے۔ بالآخر آگرہ اخبار بند ہو گیا، اور کچھ عرصہ بعد اسی چھاپہ خانے سے آگرہ کرانیکل کے نام سے ایک نیا اخبار شائع ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ مطبع دہلی گزٹ کے مدیران کے قبضے میں آ گیا، یوں ایک صحافتی ورثہ ایک اور بڑے ادارے کا حصہ بن گیا۔[19]

بہرکیف برطانوی ہندوستان میں فارسی زبان کی صحافت ایک ایسی فکری روایت تھی جس کی بنیاد صرف مسلمانوں کے قلمی اور ادبی ذوق پر قائم نہیں تھی، بلکہ اس کی تشکیل میں غیر مسلم دانشوروں، مصلحین، اور مدیران نے بھی ایک فعال، مؤثر اور قابلِ اعتراف کردار ادا کیا۔ یہ وہ عہد تھا جب فارسی، جو کبھی درباروں اور عدالتوں کی زبان تھی، آہستہ آہستہ صحافت کے شعبے میں داخل ہو کر عوامی مکالمے کا وسیلہ بننے لگی، اور اس تبدیلی میں مختلف مذاہب و طبقات کے اہلِ علم نے حصہ لیا۔ غیر مسلم مدیران کی خدمات کو اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان شخصیات نے صرف صحافت کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا، بلکہ اسے ایک تہذیبی فریضہ، تعلیمی وسیلہ، اور اصلاحی ہتھیار کے طور پر برتا۔ ڈاکٹر جوشا مارش مین، ڈاکٹر ہنڈرسن، نیل رتن ہلدر، بھولا ناتھ سین، مہیش چندر رائے اور مسٹر ہنری ٹانڈے جیسے افراد نے نہ صرف اخبارات کی ادارت کی بلکہ زبان، مواد، اسلوب، اور اشاعتی معیار میں بھی ایسی جہتیں متعارف کرائیں جو اس وقت کے مسلم مدیران سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ اخبار سیرام پور، آگرہ اخبار، بنگودت اور بنگال ہیرالڈ جیسے اخبارات غیر مسلم مدیران کی فکری وسعت، لسانی مہارت، اور صحافتی بصیرت کے زندہ شواہد ہیں۔ ان کے ذریعے نہ صرف مذہبی، تعلیمی اور اصلاحی پیغامات کو عام کیا گیا بلکہ سماجی اور سیاسی شعور کو بھی مہمیز دی گئی۔ بعض اخبارات نے اپنی اشاعت کے لیے فارسی کو ترجیح دی، تو بعض نے اسے بنگلہ اور انگریزی کے ساتھ جوڑ کر سہ لسانی صحافت کو فروغ دیا۔ ان مدیران کی کوششوں سے فارسی صحافت کو جو وقار، وسعت اور معنویت ملی، وہ برصغیر کی صحافتی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی عہد کی فارسی صحافت کی تاریخ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے غیر مسلم مدیران کے کردار کا اعتراف محض تحقیقی انصاف نہیں بلکہ تہذیبی دیانت داری کی علامت بھی ہے۔

حواشی

1. محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبارنویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1957، ص 149
2. گربچن چندن، جام جہاں نما، اردو صحافت کی ابتدا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلی، 1992، ص 141
3. محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبارنویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1957، ص 150
4. ایضاً، ص 151
5. بیجندر لال گھوش، راجہ رام موہن رائے، اردو ترجمہ انعام الحق، ترقی اردو بیورو، نئی دلی، 1973، ص 69
6. ڈاکٹر تارا چند، تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد دوم، اردو ترجمہ غلام ربانی تاباں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2001، ص 190
7. محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبارنویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1957، ص 154
8. J Natrajan, History of Indian journalism, Publication Division, 1955, P 48
9. انور علی دہلوی، اردو صحافت، اردو اکادمی دلی، ص 144
10. محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبارنویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1957، ص 158
11. ایضاً، ص 122
12. ایضاً، ص 170
13. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول، حسن زماں کلکتہ، 1967، ص 54
14. محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبارنویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1957، ص 200,201
15. Mrinal Kanti Chanda, Hiatory of English Press of Bengal 1780 to 1857, Calcutta, 1987, P 35
16. Samarjit Chakrabarti, The Bengal Press(1818-1868) Firma KLM Pvt.Ltd, Calcutta, 1976, P 192
17. محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبارنوسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1957، ص 229
18. ایضاً، ص 229
19. ایضاً، ص 229

■

Amir Fahad
H-20, Flat No: 103
Jogabai, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.:8376027216
fahadamiramu@gmail.com

ماہنامہ نیا دور کا ادبی اور صحافتی سفر

رفیق احمد

مرکز علم وفن، شہر شعر وادب اور علمی وتہذیبی تمدن کے گہوارے سرزمین لکھنؤ کو اردو زبان و ادب کے فروغ میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اس شہر سخن نے علمی وادبی دنیا میں جو شہرت ومقبولیت اور پذیرائی حاصل کی ہے اس کے اعتراف سے چشم پوشی ممکن نہیں خصوصاً اردو صحافت کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں یہاں کے ادبا وشعرا اور دانشوران اردو نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اس سے انکار کی گنجائش نہیں، خالص علمی وادبی صحافت کو پروان چڑھانے میں یہاں کے اردو صحافیوں کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، جمہوریت کا چوتھا ستون کہی جانے والی صحافت نے اردو زبان وادب کے حوالے سے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ہر عہد میں قابل تعریف رہے ہیں۔ پورے ملک کی اردو صحافت اور خاص طور سے لکھنؤ کی سرزمین کی علمی وادبی صحافت نے ملک وقوم کی ترقی میں جو رول ادا کیا ہے وہ بہر حال لائق تعریف ہے۔ علم وادب اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ کہی جانے والی سرزمین لکھنؤ سے جو علمی وادبی رسائل وجرائد اور مجلات شائع ہوتے رہے ہیں ان میں ماہنامہ 'نیا دور' کو بڑی اہمیت اور انفرادی حیثیت حاصل رہی ہے غالباً یہ ہندوستان کا واحد سرکاری رسالہ ہے جو اپنے خصوصی نمبروں یا شماروں کی وجہ سے اپنی الگ ادبی شناخت رکھتا ہے۔ اس رسالے نے اردو زبان وادب کی جو قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں اسے آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ملک کے نامور اہل قلم اور دانشوران اردو کی تخلیقات 'نیا دور' میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ رسالہ اپنے شروعاتی دور میں 'نیا دور' کے نام سے نہیں شائع ہوا کرتا تھا بلکہ حکومت اترپردیش نے آزادی کے بعد اپنی سرکاری اطلاعات منصوبے اور مقاصد کو اردو داں طبقے تک پہونچانے کے لیے جو پرچہ جاری کیا اس کا نام 'اطلاعات' رکھا جو پندرہ روزہ کی شکل میں شائع ہوا کرتا تھا شروعاتی دور میں اس میں صرف سرکاری پریس نوٹ اور اطلاعات وغیرہ شائع ہوا کرتی تھیں اس زمانے میں اس کے ایڈیٹر محترم علی جواد زیدی صاحب تھے جن کا شمار نامور اہل قلم میں ہوتا ہے ان کی انتھک کوششوں سے 'نیا دور' کو جو علمی وادبی مقام ومرتبہ حاصل ہوا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ جب 'اطلاعات' جاری ہوا تھا اس زمانے میں محترم ڈاکٹر سمپورنانند صاحب اترپردیش کے وزیر اعلیٰ تھے جن کو اردو زبان وادب سے کافی دلچسپی تھی موصوف کا علمی وادبی خلوص تسلیم شدہ ہے ان کی ادب نوازی اور علم دوستی عوام میں کافی مشہور ہے علی جواد زیدی صاحب نے موصوف کے سامنے 'اطلاعات' نام تبدیل کر کے رسالہ کا نام 'نیا دور' رکھنے کی تجویز پیش کی جسے منظوری بھی مل گئی اس طرح سے یہ رسالہ 'نیا دور' کے نام سے جاری ہونے لگا۔ آزادی سے پہلے 'نیا دور' نام کا ایک رسالہ ممتاز شیریں اور صمد شاہین کی ادارت میں بنگلور سے شائع ہوا کرتا تھا۔ حکومت اترپردیش سے پندرہ روزہ 'اطلاعات' کی جگہ ماہنامہ 'نیا دور' کی شکل میں باقاعدہ طور سے پہلا شمارہ اپریل 1955 میں منظر عام پر آیا جو آج بھی جاری ہے، شروعاتی دور کے ماہنامہ 'نیا دور' کے اہم نمبروں اور خصوصی شماروں میں 'جمہوریت نمبر'، 'آزادی نمبر'، 'گاندھی جینتی نمبر' اور 'تعمیری ادب نمبر' جنوری 1957 کو بڑی اہمیت اور شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔

محترم علی جواد زیدی صاحب کے زمانے میں ماہنامہ 'نیا دور' پر ایک آزمائشی دور بھی گزرا جسے موصوف نے اپنی دانشوری اور فہم وفراست سے اس صبر آزما مرحلے کو طے کیا اور 'نیا دور' کی اشاعت مفلوج ہونے سے بچتی رہی۔ انھوں نے صحافتی اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا وہ اردو زبان وادب کے سچے شیدائی، بہی خواہ اور بے لوث خادم تھے جن کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی۔ شروعاتی دور کی فائلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف نے "نیا دور" میں نامور اہل قلم کی تخلیقات کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کے ادبی معیار ومقام کو بلند کرنے کے لیے ایک اہم اور منفرد کالم 'آپ سے ملیے' شائع کیا تھا یہ وہ مشہور زمانہ کالم ہوا کرتا تھا جس میں دانشوران اردو اور مشاہیر ادبا وشعرا کے خاکے شائع ہوا کرتے تھے۔

زیدی صاحب کے بعد محترم محمد فرحت اللہ انصاری 'نیا دور' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے موصوف نے اپنی کوششوں سے اس کے معیار کو بلند کرنے اور تخلیقات کے حسن انتخاب میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ قابل تعریف ہے، آپ نے 'نیا دور' کا ایک خصوصی شمارہ 'جمہوریت نمبر' کے نام سے شائع کیا تھا۔ ہر ادیب، صحافی اور مدیر کی اپنی الگ الگ ترجیحات ہوا کرتی ہیں، 'نیا دور' کی فائلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کے مدیر نے قلمکاروں کی عمدہ تخلیقات ہی کو 'نیا دور' کے قیمتی صفحات پر جگہ دی ہے۔ ماہنامہ 'نیا دور' کے تیسرے ایڈیٹر جناب صباح الدین عمر صاحب تھے موصوف نے "نیا دور" کو صوری ومعنوی طور سے خوبصورت بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے انھوں نے کتابت وطباعت اور املا پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ اس سلسلے میں صلاح الدین عثمانی صاحب اپنے مضمون صباح الدین عمر مرحوم، مطبوعہ 'ماہنامہ نیا دور نصف صدی نمبر' شمارہ مارچ تا مئی 1995 میں رقمطراز ہیں:

"یہ ممکن نہ تھا کہ رسالے کی اشاعت میں کتابت کی ادنیٰ سی بھی خامی رہ جائے اخبار ورسالے کے صفحات میں مضامین سجانے Lay out میں تو وہ ماہر تھے لکھنؤ کے اچھے کاتبوں کا کہنا ہے کہ ان کے بعد کتابت

اورصفحات کے سجانے کا ہنر جاننے والا کوئی نہ رہ گیا۔''

سابقہ مدیران نیا دور کی ادبی وثقافتی اور تہذیبی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے صباح الدین عمر صاحب نے بھی چند معلوماتی اور دستاویزی نوعیت کے خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جن میں گاندھی جی، شاستری جی اور پنڈت نہرو جی کی علمی شخصیت پر تین خصوصی شمارے اسی طرح مرزا غالب اور احتشام حسین صاحب کے فکر وفن پر دو خصوصی شماروں کے علاوہ افسانہ نمبر اور جون 1969 میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بارے میں ایک خصوصی گوشہ 'نذر ذاکر حسین' کے نام سے شائع کیا۔ اردو کی علمی وادبی صحافت میں کالم نگاری کی طرح اداریہ نویسی بھی بڑی فنکاری کا کام ہے، رسالے کی پالیسی سے اداریے کا گہرا ربط ہوتا ہے عمدہ اور بہترین معلوماتی اداریے رسالے کے معیار ووقار کو بلندی عطا کرتے ہیں۔

صباح الدین عمر صاحب کی اداریہ نویسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نیا دور کی صحافتی تاریخ میں سب سے طویل اداریہ بھی صباح الدین عمر کا لکھا ہوا ہے جو 26 جنوری 1960 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ اداریہ بہت باریک کتابت کے ساتھ 'نیا دور' کے پانچ مکمل صفحات پر مشتمل ہے جو 'نیا دور' کی موجودہ کتابت یا کمپیوٹر کی ٹائپنگ کے لحاظ سے کم از کم بیس صفحات کے برابر ہے یہ پورا اداریہ قومی اور بین الاقوامی طور پر جمہوریت کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔''

(سہ ماہی 'روح ادب' ویسٹ بنگال اردو اکادمی، کلکتہ، شمارہ جولائی تا ستمبر 2022 صفحہ 15)

اردو کی ادبی صحافت میں 'نیا دور' کے ذریعہ شہرت ومقبولیت پانے والے مدیروں میں خورشید احمد صاحب کا شمار ایک نمائندہ اور تجربہ کار صحافی کی حیثیت سے ہوتا ہے انھوں نے 'نیا دور' کی ادارت کے دوران نامور ادبا وشعرا اور کچھ دیگر موضوعات پر کل آٹھ خصوصی شمارے اور چار ادبی گوشے شائع کیے جن میں امیر خسرو، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا عبدالماجد دریابادی پر خصوصی نمبر اور ڈاکٹر ذاکر حسین، علامہ اقبال، سلام مچھلی شہری اور شمیم کرہانی پر خصوصی گوشے شامل ہیں۔

ترتیب کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو امیر احمد صدیقی ماہنامہ 'نیا دور' کے پانچویں مدیر کی حیثیت سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں انھوں نے 'نیا دور' کے معیار ووقار کو اپنی انتھک کوششوں سے بلندی عطا کی ہے ان کی مدت ادارت کے وقفے/دورانیے میں مختلف علمی و ادبی شخصیات پر خصوصی شمارے شائع کرنے کی روایت برقرار رہی بلکہ موضوعات اور فکر وخیال کے اعتبار سے کچھ ترقی بھی ہوئی موصوف نے مختلف موضوعات پر کل ایک درجن خصوصی شمارے اور دو خصوصی گوشے شائع کیے جن میں محترمہ اندرا گاندھی، بہادر شاہ ظفر، منشی دیانارائن نگم، فراق گورکھپوری، عثمان عارف، منشی نول کشور اور دیگر موضوعات پر خصوصی نمبر اور نامور شاعر نسیم انہونوی اور جمیل مہدی پر خصوصی گوشے قابل ذکر ہیں، میرے خیال میں صدیقی صاحب کی مدت ادارت کا اہم اور ادبی کارنامہ 'یادرفتگاں نمبر' حصہ اول ہے جس میں اردو ادب کے پانچ اہم ستون خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، صباح الدین عبدالرحمٰن، فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا کے فکر وفن پر گراں قدر مضامین ومقالات شامل ہیں یہ تاریخی اور دستاویزی حیثیت کا حامل شمارہ اپریل تا ستمبر 1988 میں شائع ہوا تھا جس کے جوائنٹ ایڈیٹر محترم شاہنواز قریشی صاحب تھے یہ خصوصی شمارہ 244 صفحات پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالہ 'فکر تونسوی کی ادبی وصحافتی خدمات' مطبوعہ اپریل 2021 کی تیاری میں مذکورہ خصوصی شمارے سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔

ماہنامہ 'نیادور' کے ادبی اور صحافتی قافلے کو آگے بڑھانے والے مدیران کی فہرست میں ایک اہم اور نمایاں نام محترم شاہنواز قریشی صاحب کا ہے جن کی مدیرانہ صلاحیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے آپ کی ولادت 16 مارچ 1948 میں کلکتہ میں ہوئی اور وفات لکھنؤ میں 23 جون 2023 کو ہوئی۔ آپ 1959 میں اپنے والدین کے ساتھ لکھنؤ آگئے یہیں پر آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، صحافتی زندگی کا آغاز 1969 میں ہفت روزہ 'ندائے ملت' سے ہوا، سرکاری ملازمت کی شروعات محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ لکھنؤ میں انفارمیشن افسر کی حیثیت سے ہوئی اس اہم پوسٹ پر آپ کی تقرری 17 اگست 1947 کو ہوئی۔ اس جوائننگ کے ساتھ موصوف کو انفارمیشن بیورو کے علاوہ 'ماہنامہ نیادور' کی اضافی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی، انھوں نے 'نیادور' کے مدیر کی حیثیت سے اس عہدہ پر اگست 1990 سے جولائی 1991 تک خدمات انجام دیں۔ مستقل ایڈیٹر بننے سے قبل وہ جوائنٹ ایڈیٹر اور ایکٹنگ ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ قریشی صاحب 6 مارچ 1995 سے نومبر 1997 تک یوپی اردو اکادمی لکھنؤ میں بطور سکریٹری ڈیپوٹیشن پر بھی رہ چکے ہیں یہاں سے واپسی کے بعد آپ کو دوبارہ فروری 1998 میں 'نیادور' کے ایڈیٹر کی ذمہ داری سونپی گئی جسے انھوں نے جون 2003 تک بحسن وخوبی انجام دی انھوں نے کسی وجہ سے جولائی 2003 ہی میں V.R.S لیتے ہوئے ملازمت سے سبکدوشی اختیار کر لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کی صحافتی خدمات کا سلسلہ جاری رہا، روزنامہ 'ان دنوں' اور روزنامہ 'صحافت' سے وابستہ رہے اور ان میں بطور ایڈیٹر ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔

شاہنواز صاحب کے متعلق رضوی صاحب لکھتے ہیں:

''نازک مزاجی، نفاست پسندی، وضع داری اور لکھنؤ کی زبان کی چاشنی ان کے مزاج میں رچی بسی تھی، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ عصری دور میں لکھنوی تہذیب وثقافت اور زبان وادب کی نمائندگی کرتے تھے۔''

''نیا دور کے مدیر محترم ریحان عباس صاحب لکھتے ہیں: قریشی صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ان کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ وہ سنجیدہ محفل میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے انھوں نے 'نیادور' کی ادارت کے علاوہ مختلف روزناموں، ماہناموں کی ادارت کا بھی فریضہ بخوبی انجام دیا ہے، اور یہ لکھنے میں قریشی صاحب ایکسپرٹ تھے وہ جو کہنا چاہتے تھے اس کو ایسے تحریر کرتے تھے کہ گویا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اداریہ نہ لکھ رہے ہوں بلکہ سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔''

ماہنامہ 'نیادور' کی علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے جن لوگوں نے اپنی مدیرانہ صلاحیت کا لوہا منوایا ہے ان میں ایک قابل ذکر اور گراں قدر نام سید امجد حسین صاحب کا ہے جن کا سب سے بڑا علمی وادبی کارنامہ 'نیادور' میں لکھنے والے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی ہے موصوف نے تخلیق کاروں کو دیے جانے والے اعزازیے یا معاوضے میں خاطر خواہ اضافہ کرایا ہے جو بہر حال ایک قابل تعریف اور لائق تحسین کام ہے جس سے 'نیادور' کے ادبی معیار میں بھی بلندی ہوئی اور اس کے لیے نامور اہل قلم حضرات کی خدمات حاصل کی گئیں۔ موصوف نے کل سات مختلف موضوعات پر خصوصی شمارے شائع کیے جن میں 'اودھ نمبر، گاندھی جی نمبر اور یادگار آزادی نمبر' کو کافی شہرت ومقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ آپ نے شیخ علی حزیں کے فکر وفن پر ایک گراں قدر ادبی گوشہ بھی شائع کیا ہے۔

مدیران 'نیادور' کی فہرست میں نجیب انصاری صاحب

کا نام بھی بہ حیثیت سب ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر انتہائی اہم اور قابل ذکر ہے انھیں بھی صرف نصف سال کی مختصر مدت کے لیے 'نیا دور' کی ادارت کی اہم ذمہ داری ملی جسے موصوف نے بحسن وخوبی انجام دیا۔

اردو کی ادبی صحافت خصوصاً رسائل وجرائد کی پوری علمی وادبی تاریخ میں میری ناقص معلومات اور محدود مطالعے کی حد تک شاید ہی اردو کا کوئی ایسا رسالہ یا ماہنامہ ہوگا جس نے اپنی طویل علمی وادبی اور صحافتی خدمات کے وقفے میں ماہنامہ 'نیا دور' کی طرح اتنی کثیر تعداد میں مختلف علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی موضوعات پر گراں قدر، قابل ذکر، لائق مطالعہ واستفادہ اور معیاری ودستاویزی نوعیت کے حامل خصوصی شمارے یا نمبر شائع کیے ہوں۔ خصوصی شماروں کی اشاعت کے لحاظ سے ملک گیر پیمانے پر شائع ہونے والے سرکاری وغیر سرکاری رسائل وجرائد کی طویل فہرست میں اس معاملے میں ماہنامہ 'نیا دور' کو سند افتخار حاصل ہے۔ اس کے لیے تمام مدیران 'نیا دور' خصوصی مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔

اس سلسلے کی ایک اہم اور ناقابل فراموش کڑی ڈاکٹر سید وضاحت حسین رضوی کی علمی وادبی شخصیت ہے جن کی ادارت میں 'نیا دور' کو علمی وادبی حلقوں میں کافی شہرت ومقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی اور 'نیا دور' کے خریداروں، قلم کاروں اور تخلیق کاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اس کے خصوصی شماروں کی حصولیابی کے لیے بہت سے نئے خریداروں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر وضاحت رضوی صاحب نے 2004 سے 2016 تک تقریباً 13 سال تک اپنی کل مدت ادارت میں پچیس خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جو مختلف علمی وادبی موضوعات پر مشتمل ہیں جن میں خاص طور پر نامور علمی وادبی شخصیات مثلاً مولانا محمد علی جوہر، علی برادران، علی جواد زیدی، قرۃ العین حیدر، رشید حسین خان، میر تقی میر، شکیل بدایونی، عرفان صدیقی، اسرار الحق مجاز، احتشام حسین رضوی، جاں نثار اختر، محمود الہی، میر انیس، خمار بارہ بنکوی، منشی دوار یکا پرساد افق اور وجاہت علی سندیلوی کے نام انتہائی اہم اور قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے 'نیا دور' میں نامور اہل قلم پر خصوصی گوشے بھی شائع کیے ہیں جن میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور عرفان صدیقی کے علاوہ دیگر اہم نام بھی شامل ہیں، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی صاحب نے اردو اصناف شاعری میں مرثیے کے حوالے سے ترتیب وار چار خصوصی شمارے 'رثائی ادب نمبر' کے نام سے دسمبر 2009 نومبر 2013، دسمبر 2014 اور اکتوبر 2015 میں شائع کیے ہیں جو موضوع اور فن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ماہنامہ 'نیا دور' کی علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی صاحب کی فعال اور علمی وادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔

اردو کی ادبی صحافت خصوصاً رسائل و جرائد کی پوری علمی وادبی تاریخ میں میری ناقص معلومات اور محدود مطالعے کی حد تک شاید ھی اردو کا کوئی ایسا رسالہ یا ماھنامہ ھوگا جس نے اپنی طویل علمی و ادبی اور صحافتی خدمات کے وقفے میں ماھنامہ 'نیادور' کی طرح اتنی کثیر تعداد میں مختلف علمی وادبی اور تھذیبی وثقافتی موضوعات پر گراں قدر، قابل ذکر، لائق مطالعہ و استفادہ اور معیاری و دستاویزی نوعیت کے حامل خصوصی شمارے یا نمبر شائع کیے ھوں۔

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی صاحب کی جوائنگ جولائی 1990 میں محکمۂ اطلاعات ورابطہ عامہ لکھنؤ میں ہوئی، 2004 میں موصوف جب ماہنامہ 'نیا دور' کے مدیر بنائے گئے تو انھوں نے ترجیحی طور پر تین اہم کارنامے انجام دیے۔ 'نیا دور' کے صفحات کی تعداد میں مختلف اوقات میں حسب ضرورت حذف واضافے ہوتے رہے ہیں، کچھ طویل مدت تک اس کے صفحات کی مجموعی تعداد 32 رہی ہے جس میں ایک خاطر خواہ اضافہ کرکے رضوی صاحب نے صفحات کی تعداد کو 48 تک کر دیا جو ایک اہم اور قابل ذکر کارنامہ ہے۔ عام طور پر ریسرچ اسکالر اپنی تحقیقات کی اشاعت کے لیے ISSN نمبر والے علمی وادبی میگزین یا رسالے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے وضاحت صاحب نے ایک اہم آسانی فراہم کردی ہے۔ موصوف کی علمی کوششوں سے اب 'نیا دور' بھی ISSN نمبر کے ساتھ اب شائع ہو رہا ہے جو ایک قابل تحسین عمل ہے۔ وضاحت صاحب کی ادب نوازی اور علم دوستی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے قلم کاروں کو دیے جانے والے اعزازیے یا معاوضے کی رقم کو بڑھا کر دوگنا کر دیا اس طرح 2015 سے موصوف نے تخلیق کاروں کا اعزازیہ بڑھا کر ایک اہم ادبی خدمات انجام دی ہے۔ ان کے زمانے میں 'نیا دور' کے خریداروں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے جو اس اہم رسالے کے لیے ایک خوش آئندہ بات ہے، ایک کامیاب مدیر اور صحافی کی حیثیت سے رضوی صاحب کا قد کافی بلند ہے۔

ماہنامہ 'نیا دور' کی علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے جن مدیران 'نیا دور' نے اس رسالے کی آبیاری کی ہے۔ ان میں رضوی صاحب کے بعد سہیل وحید کا نام بھی انفرادی حیثیت کا حامل ہے جنھوں نے اردو کے نامور طنز ومزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب پر خصوصی شمارہ ستمبر 2018 میں شائع کیا ہے۔ سہیل وحید کے بعد 'نیا دور' کی ادارت کی ذمہ داری سید عاصم رضا کے سپرد ہوئی جنھوں نے اسے بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے اپنی ادارت کا آخری شمارہ اکتوبر 2019 میں شائع کیا۔ ان کے بعد دو مرتبہ محترمہ غزال ضیغم کو نیادور کا مدیر بنایا گیا، ایک مرتبہ انجم نقوی صاحب 'نیا دور' کے مدیر منتخب ہوئے اور انھوں نے اپنے رٹائرمنٹ سے پہلے 'نیا دور' کا ایک شمارہ نومبر 2019 سے اکتوبر 2020 تک عام شمارے کی حیثیت سے شائع کیا۔ موصوف کے بعد جب غزال ضیغم کو دوسری بار مدیر بنایا گیا تو ان کی ملازمت سے سبکدوشی کا وقت بالکل قریب آگیا اور اس طرح محترمہ غزال ضیغم کو ماہنامہ 'نیا دور' کی واحد خاتون ایڈیٹر بننے کا شرف حاصل رہا، اس طرح ماہنامہ 'نیا دور' کا ادبی سفر جو اپریل 1955 سے محترم علی جواد زیدی صاحب کی ادارت میں شروع ہوا تھا مختلف مراحل ومدارج سے گزرتے ہوئے تقریباً ستر سال کی طویل مسافت طے کر کے آج بھی بڑی آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔ اب اس موقر ماہنامہ کے حالیہ مدیر محترم ریحان عباس صاحب ہیں جنھوں نے 'افسانوی ادب نمبر' شائع کرکے 'نیا دور' کی علمی وادبی وراثت کو جاری وباقی رکھا ہے۔ امید ہے کہ موصوف کی ادارت میں یہ رسالہ آسمان صحافت کا درخشندہ ستارہ بن کر نکلتا رہے گا اور اس کی ضیا پاش کرنوں سے شائقین اردو اور قارئین 'نیا دور' مزید استفادہ کرتے رہیں گے۔

■

Dr. Rafique Ahmad
Asst Prof. Department of Urdu
D.C.S.K (Post Graduate) College
Maunath Bhanjan, Mau- 275101 (UP)
Mob.:9236126977
rafique.mau@gmail.com

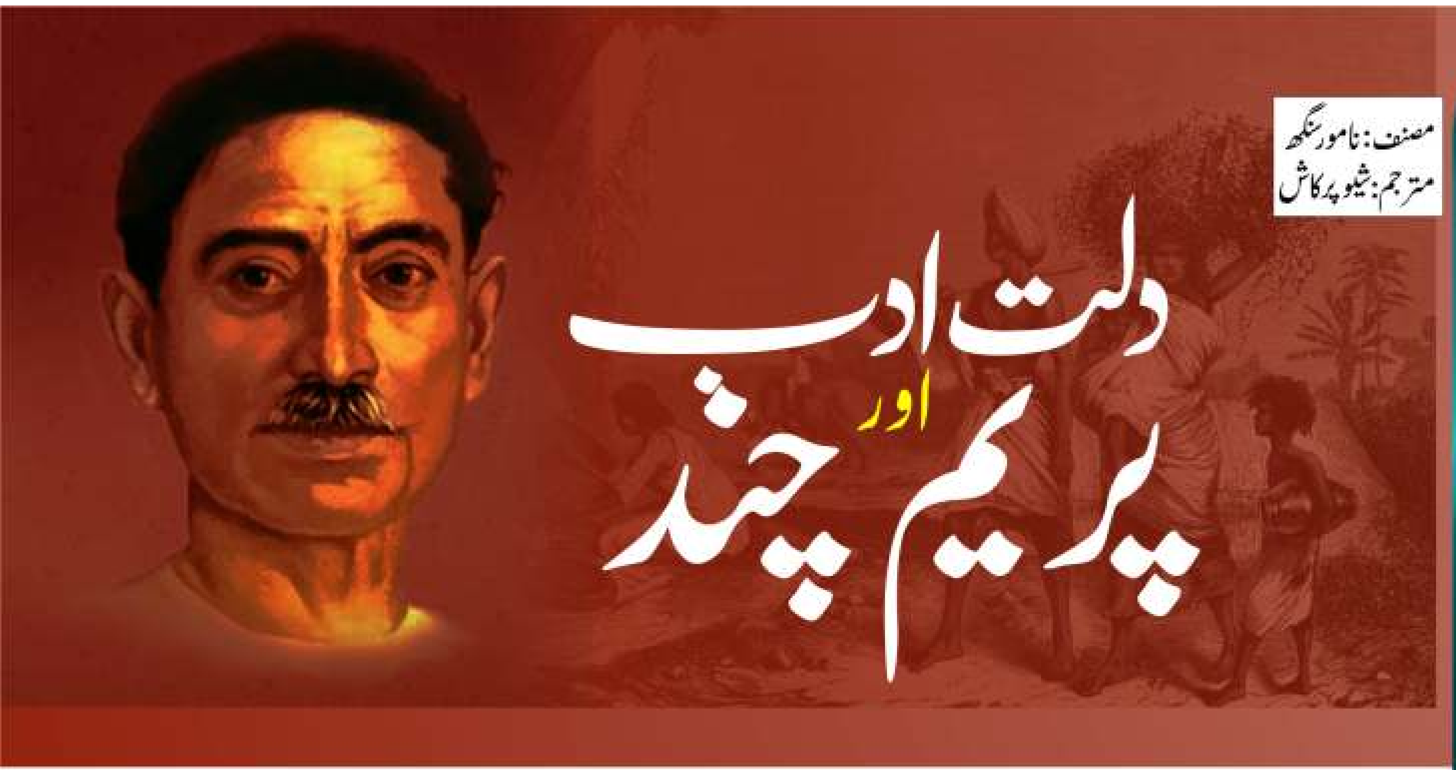

دلت ادب اور پریم چند

مصنف: نامور سنگھ
مترجم: شیو پرکاش

پریم چند کے سیاق میں دلتوں کے مسائل پر بحث ہوتی رہی ہے، آج بھی ہو رہی ہے۔ لیکن دلت ادب کے سیاق وسباق میں پریم چند پر بہت کم بحث ہوئی ہے۔ پریم چند کے ادب میں بھلے ہی دلتوں کے مسائل پر لکھا گیا ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ پریم چند دلت ادیب نہیں تھے۔ اس سے پریم چند کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ماننا چاہیے۔ دلت ادب کے تصور اور پریم چند کو گڈمڈ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ پریم چند کے ادب میں دلتوں کی زندگی کا جو بھی خاکہ ملتا ہے، اسے وضاحت سے پیش کرتے ہوئے دلت ادب جو اپنی آزادی اور خودمختاری حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس پر مصر ہے، اس کا پورا احترام کیا جانا چاہیے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے۔ فکر کے میدان میں گھپلا کرنے اور حقائق کو خلط ملط کرنے کے بجائے واضح طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ اس نکتے کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔

میں پریم چند کے ادب میں دلتوں کی زندگی اور اس کے تئیں پریم چند کے وژن کا مختصر جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری معلومات میں اس موضوع پر پہلی اور غالباً آخری کتاب ڈاکٹر کانتی موہن کی 'پریم چند اور اچھوت' نام سے ہے۔ یہ 1982 میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں پوری تفصیل ہے۔ اتفاق سے یہ کتاب ایک ایسے ادارے سے شائع ہوئی تھی جو خود مالی اعتبار سے کمزور تھا۔ اس لیے اس کتاب کی اتنی تشہیر نہیں ہوسکی، جتنی ہونی چاہیے تھی۔ بہت کم لوگوں کی نظر سے یہ کتاب گزری ہے، لیکن آج بھی اس موضوع پر یہ سب سے اہم اور مستند کتاب ہے۔ ڈاکٹر کانتی موہن دہلی یونیورسٹی کے ستیہ وتی کالج میں پروفیسر ہیں۔

یہ عجیب وغریب بات ہے کہ پریم چند کی پہلی تخلیق بھی دلتوں سے متعلق ہے اور آخری تخلیق بھی۔ انھوں نے جو پہلی کہانی لکھی تھی، وہ کھوگئی، جسے انھوں نے بہت دنوں بعد یاد کیا، 'میری پہلی تخلیق میں'۔ جب پریم چند بہت چھوٹے تھے اور بطور ادیب مشہور نہیں ہوئے تھے، تب ان کے خاندان میں ہوئے ایک واقعہ کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔

پریم چند نے خود لکھا ہے کہ بڑھاپا اکثر بچپن کا اعادہ ہوا کرتا ہے اور وہ کئی طرح سے ہوتا ہے۔ اس عمر میں آکر بچپن کی بہت سی پرانی باتیں اکثر یاد آتی ہیں۔ پریم چند کو گئودان لکھنے کے دوران اگر وہ واقعہ یاد آیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ پریم چند کی پہلی تخلیق کا تعلق اس بات سے ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ کس طرح دلتوں کی عزت لوٹتے ہیں، ان کی عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کے ظلم و استحصال کی شکل ہے۔ آخری مکمل ناول 'گئودان' میں بھی پریم چند نے لکھا ہے کہ اعلیٰ طبقے کی دلت عورتوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس لیے پریم چند کی کہانیوں میں دلتوں کے بارے میں اگر کچھ ملے تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک حساس اور باخبر ادیب کی بصیرت کی دین ہے۔

پریم چند کی زندگی اور ادب کا جو مقصد تھا اسے انھوں نے واضح لفظوں میں لکھا ہے: ''میری کوئی بہت بڑی خواہش نہیں ہے۔ سب سے بڑی خواہش ہے سوراجیہ۔ ہم آزاد ہوں اور وہ سوراجیہ مٹھی بھر لوگوں کا نہ ہو، بلکہ وہ سوراجیہ ہندوستان کے تمام عوام کے لیے سوراجیہ ہو، خوش حالی لے کر آئے، ان کی زندگی بہتر ہو۔'' یہ خاص مقصد پریم چند کی زندگی کا تھا۔ شاید آزادی کے دور میں لکھنے والے تمام باخبر مصنفین کا اہم مسئلہ تھا۔ سب سے باخبر مصنفین میں عموماً جن دو بڑے مصنفین کا شمار ہندی میں ہوتا ہے۔ ان میں ایک نرالا اور دوسرے پریم چند تھے۔ نرالا اور پریم چند کے سامنے قومی آزادی کا جو تصور تھا، اس کا گہرا تعلق عوام سے تھا۔ سماج میں جو سب سے زیادہ دبے کچلے، استحصال زدہ اور غریب لوگ ہیں، اور جنھیں سب سے زیادہ نظرانداز کیا گیا ہے۔ ان کے تئیں گہرا لگاؤ ہندی کے ان دو مصنفین میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

پریم چند کے ادب میں اور چیزیں چھوڑ دیجیے تو غالباً ہندی ادب کی تاریخ میں پہلی بار کسی ناول کا ہیرو ذات کا چمار 'سورداس' بنتا ہے۔ متعدد لوگوں نے بیان کیا ہے کہ سورداس ایک طرح سے فکشن میں گاندھی جی کی علامت ہے، طرح طرح سے لوگوں نے تجزیے بھی کیے ہیں۔ لیکن یہ فخر تو پریم چند کو جاتا ہے کہ جس ادب میں تقریباً تمام بڑے اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہوا کرتے تھے، پہلی بار ایک ناول کا ہیرو انھوں نے سورداس نام کے چمار کو بنایا۔ وہ گاندھی جی کی شبیہ دینے کے لیے سورداس چمار کی جگہ کسی برہمن، کسی ٹھاکر یا کسی کائستھ

یا کسی ویشیہ کو ہیرو بنا سکتے تھے۔ کسی نے نہیں روکا تھا لیکن پریم چند نے سورداس چمار کو ہیرو بنایا۔ باوجود اس کے یہ سچ ہے کہ 'رنگ بھومی' کا موضوع اچھوتوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ سورداس اس میں ایک کسان کی حیثیت سے آتا ہے۔ اگرچہ وہ ذات کا چمار ہے، لیکن اس کے پاس کافی زمین ہے، وہ لڑائی لڑتا ہے، اس میں اس کی زمین ہندوستان کی زمین کی علامت بن جاتی ہے۔ اس زمین پر اس کا اپنا حق ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے ہندوستانی عوام ہندوستان کو اپنی زمین سمجھتا ہے اور وہ حق نہیں دینا چاہتا کہ غیر ملکی آکر اس پر کارخانہ لگائیں۔ اس لیے رنگ بھومی کا ہیرو ایک دلت ضرور ہے، لیکن رنگ بھومی کا اہم مسئلہ دلت کی اصلاح یا دلت مکتی نہیں ہے۔

'رنگ بھومی' کا مسئلہ قومی آزادی ہے۔ یہ 1924 میں لکھا گیا ناول ہے اور 1925 میں شائع ہوا تھا۔ تب تک ہماری قومی تحریک آزادی میں دلت شامل نہیں ہوئے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک دلتوں کی تحریک نہیں تھی۔ 'چوری چورا کا واقعہ' دلتوں کو لے کر نہیں ہوا تھا۔ ہماری قومی تحریک میں تب تک مرکز میں دلت تحریک نہیں آسکی تھی۔ باوجود اس کے کہ ایک عرصے سے بابا صاحب امبیڈکر اپنی لڑائی لڑ رہے تھے، وہ قومی تحریک یا کانگریس کا سیاسی وسماجی منشور نہیں بن سکا تھا۔ یہ سچائی ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قومی آزادی کے خواب اور جدوجہد کے شعور کے دوران پریم چند 'رنگ بھومی' میں جو تصویر پیش کرتے ہیں، وہ حقیقت سے کتنی بعید ہے۔ مندر ہے جس میں پنڈا پروہت اور دوسرے اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی آتے ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر دلت بھی کیرتن بھجن کرتے ہیں۔ بھیرو پاسی اور سورداس چمار بھی دوسرے طبقوں کے ساتھ مل جل کر مندر میں بھجن کیرتن کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، سورداس کی موت کے بعد جو دعوت ہوئی، اس میں ایک ساتھ بیٹھ کر برہمنوں اور ٹھاکروں سمیت چمار اور پاسی، ڈوم ادنیٰ طبقے بھی ساتھ ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ پریم چند آخر میں لکھتے ہیں کہ یہ سورداس کی فتح ہے۔ کاہے کی فتح ہے۔ مندر میں بھجن اور کیرتن کرتے آپ پہلے ہی دکھا چکے تھے۔ جب سورداس مرے نہیں تھے۔ سورداس کے مرنے کے بعد اگر سب لوگ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں، پورے ناول میں یہ کہیں مسئلہ نہیں ہے اور آخر میں ایک جملہ جوڑ دیں کہ یہ سورداس کی فتح ہے۔ 1924 تک پریم چند کی یہی سوچ تھی۔ میرا خیال ہے کہ پریم چند کی سوچ وفکر اس دور قومی تحریک کے لیڈروں کے خیالات کا عکس تھی۔ یہاں لگ بھگ وہی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ایسا آدرش واد اس دور میں تھا۔

لیکن اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند کی تخلیقات میں، ان کی کہانیوں، ان کے ناولوں میں 1931 کے آس پاس ایک بنیادی تبدیلی ہوتی ہے۔ 1931 اور 1932 کا سال بہت اہم ہے۔ گول میز کانفرنس ہو چکی تھی۔ بابا صاحب امبیڈکر دلتوں کے لیے ایک علیحدہ سیاسی قیادت اور انتخاب کا سوال اٹھا چکے تھے اور انگریز سرکار آزادی دینے کے لیے آمادہ تھی۔ گاندھی جی نے یرودا جیل آمرن انشن کیا تھا اور آخر میں طویل بحث اور مفاہمت کے دوران 1932 میں پونا پیکٹ (معاہدہ) ہوا۔

میرا خیال ہے کہ پریم چند کے ادب میں جو مسئلہ 'رنگ بھومی' جیسے عظیم ناول کے مرکز میں نہیں آسکا، وہ 'میدان عمل' کے مرکز میں آیا۔ یہ مسئلہ 'میدان عمل' میں پہلی بار نظر آتا ہے۔ دلتوں کا مندر میں داخلہ اور اس مندر میں رکاوٹ ڈالنے والی طاقتیں۔ تب تک مہاراشٹر میں، غالباً ناسک میں، مندر میں دلتوں کے داخلے کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور پریم چند پر اس کا اثر تھا جس کا اظہار پریم چند 'رنگ بھومی' میں کر چکے تھے کہ مندر میں سب ایک ساتھ بھجن کیرتن کرتے ہیں، انھیں پہلی بار سچ کا احساس ہوا، وہ حقیقت سے ٹکرائے۔ کاشی میں رہتے ہوئے ان کی آنکھ کے نیچے وشوناتھ مندر تھا اور ان کا دھیان ہی نہیں گیا کہ وہاں دلت جاتے ہیں کہ نہیں جاتے۔ جب انھیں لگا تو انھوں نے لکھا۔ 'میدان عمل' میں بھجن کیرتن کرنے والے برہما چاری نے یکا یک دیکھا کہ ناظرین کے پیچھے کی قطاروں میں کچھ دلت بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اٹھے اور جوتا لے کر ان کی پٹائی کرنے لگے۔ خود جب بیان کنندہ پٹائی کر رہا ہو تو بھکت بھلا کیسے پیچھے رہ سکتا ہے۔ پیروکار بھی اٹھ کر پٹائی کرنے لگے۔ پریم چند نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آخر میں بابا جی لوگ آئے تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے والے ٹھاکر صاحب کیوں نہیں آئیں گے۔ زمیندار بھی آگئے۔ جب وہ ساتھ ہیں تو برطانوی حکومت بھی ان کے ساتھ ہوگی۔ پولس آتی ہے تو گولی چلاتی ہے۔ کئی لوگ مارے جاتے ہیں۔ ادھر سے شانتی کمار جیسے کچھ قومی خیال والے گاندھی جی کے نمائندہ لیڈران کے سامنے آتے ہیں اور روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ متعدد دلتوں کے مارے جانے اور گھائل ہونے کے بعد گولی باری روکی جاتی ہے اور آخر میں امر کانت کے باپ سمر کانت اعلان کرتے ہیں۔ اب مندر کا دروازہ دلتوں کے لیے بھی کھل گیا ہے اور اب چاہیں تو مندر میں جا سکتے ہیں۔ پریم چند نے آخر میں تنقید کی ہے کہ اس دن پجاری بہت خوش تھا کہ چڑھاوا بہت زیادہ چڑھا تھا۔ یہ جملہ پریم چند کا تھا۔ مندر میں جانے کے لیے دلتوں کا اصرار اور گولی باری کی رواداری دکھاتے ہوئے اعلیٰ طبقوں اور اشرافیہ کا مندر کا دروازہ کھولنا اور آخر میں یہ تنقید کرنا کہ اس دن پجاری بہت خوش تھا کیونکہ چڑھاوا سب سے زیادہ چڑھا تھا، یہ بتا دیا تھا کہ مندر میں تحریک داخلہ سے فائدہ کن کو ہوگا۔ یہ پریم چند نے سمجھ لیا تھا۔

1932 کے آس پاس وجود میں آئیں، پریم چند کی تخلیقات کو دیکھنے سے چند باتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ دلتوں کا مندر میں داخلہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ پریم چند بہت پہلے سے دلتوں کو یا تو مزدور کے طور پر دیکھتے تھے یا کسان کے طور پر۔ 'کایا کلپ' میں انھوں نے خود دلتوں کو مزدور کہا ہے۔ بنیادی مسئلہ ہے دلتوں کی معاشی ترقی اور سماجی مساوات کا۔ اگر یہ نہیں ملتا تو باقی اچھوت کی اصلاح والی چیزیں جو ہیں، وہ احسان کرنے جیسی چیزیں ہیں۔ یہ پریم چند سمجھ گئے تھے۔ پریم چند ایک عرصے سے مذہب کے

نام پر ہندو دھرم میں جو پاکھنڈ آ گیا تھا، اس کے خلاف تھے، اس پاکھنڈ کے راکشش پروہت طبقہ تھے۔ اس پاکھنڈ کے راکشش زمیندار بھی تھے جو اتفاق سے ذات میں یا تو راجپوت ہوتے تھے یا کچھ ساہوکار اور بنیا ہوتے تھے۔ سرمایہ، مذہب، سیاسی طاقت مل کر مذہب کا جو روپ بنتا تھا، وہ ذات پات کا زائیدہ تھا، پریم چند اسے پہچان گئے تھے۔ گاندھی جی سے پریم چند کا خیال الگ نظر آتا ہے۔ جب تک ذات پات کے نظام کو نہیں توڑا جائے گا، تب تک دلتوں کو آزادی نہیں ملے گی۔ اس کی بنیاد مذہبی پاکھنڈ ہے۔ مذہب کا دائرہ بڑھا ہے لیکن حقیقی مذہب نہیں رہ گیا ہے۔ اسی لیے جب تک حل کے طور پر قومی تحریک آزادی میں ایک واضح معاشی تبدیلی نہیں آتی، سماجی تبدیلی نہیں آتی یعنی سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے ڈھانچے کے ساتھ اس سے جڑے ہوئے قانون میں تبدیلیاں پیدا نہیں ہوتیں، تب تک یہ مسئلہ دور نہیں ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1931 سے 1936 کے مابین پریم چند ایک حقیقت نگار مصنف کے طور پر یہ تجربہ کرنے لگے تھے۔ اس کی جھلک ان کی کہانیوں اور ناولوں میں ہے۔

پریم چند کے اِن خیالات کو 'گئودان' کے ایک سیاق وسباق سے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب سے متعلق ان کے خیالات کیا تھے۔ جب پنڈت ماتا دین کی پٹائی ہوگئی تھی، انھوں نے سلیا سے منھ پھیر لیا تھا۔ آخر میں ایک دلچسپ بات ہوتی ہے۔ پریم چند دکھاتے ہیں کہ گھر کے لوگ بھی سلیا کو نکال باہر کرتے ہیں۔ ایسے میں حاملہ سلیا کو پناہ دیتی ہے پسماندہ طبقے کی ہوری مہتو کی بیوی دھنیا۔ پسماندہ طبقہ کی ایک عورت۔ کچھ دن بعد سلیا کا بچہ مر جاتا ہے اور آخر میں ماتا دین کا من بدلتا ہے۔ ان کا پرائشچت کرایا گیا تھا، ان کی شدھی ہوئی تھی، ان کو پھر سے برہمن بنایا گیا تھا۔ کاشی کے پنڈتوں نے کئی سو روپیہ لے کر، پنڈت جی کے منھ میں جو ہڈی وغیرہ ڈالی گئی تھی، اس پاپ سے انھیں مکتی دلائی تھی اور انھیں برہمن بنا لیا تھا لیکن ماتا دین نے دیکھا کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی میرے ہاتھ کا چھوا پانی کوئی نہیں پیتا۔ میرے ساتھ بیٹھ کر کوئی کھانا نہیں کھاتا۔ اگرچہ پنڈتوں نے سند نامہ دے دیا ہے۔ اسے عدم دلچسپی ہوئی ادھر سے بھی، ادھر سے بھی۔ آخر میں سلیا کے پاس آتا ہے۔

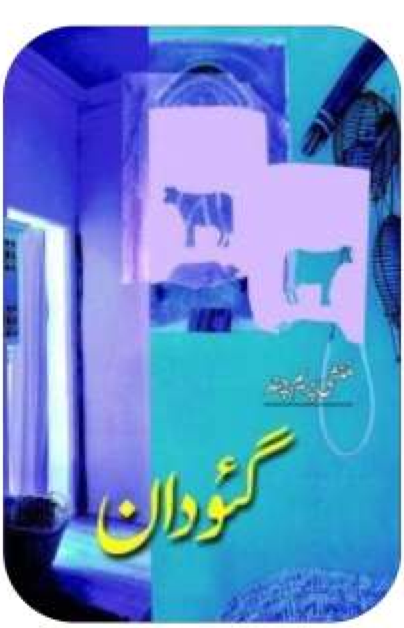

سلیا کو تعجب بھی ہوتا ہے، جب ماتا دین کہتا ہے۔ میں تمھارے ساتھ رہوں گا، تو وہ بولتی ہے تمھارا کھانا کون بنائے گا؟ بولے۔ تم بناؤ گی، میں کھاؤں گا۔ پہلے تو چماروں نے اس کا جنیو توڑا تھا اور منھ میں ہڈی ڈالی تھی۔ پریم چند لکھتے ہیں کہ اس دن سے اسے دھرم سے چڑھ ہوگئی تھی۔ اس نے جنیو اتار پھینکا اور پروہتی کو گنگا میں ڈبا دیا۔ اب وہ پکا کسان ہوگیا۔ ماتا دین سلیا سے کہتا ہے۔ میں برہمن نہیں، چمار ہی رہنا چاہتا ہوں جو اپنا دھرم پالے، وہی برہمن ہے، جو دھرم سے منھ موڑ لے، وہی چمار ہے۔" تو دھرم اور ذات پات کے بارے میں پریم چند کے خیال ایسے ہوگئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ پریم چند کے ادب میں دلت زندگی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کی حقیقی تصویر ناولوں سے زیادہ کہانیوں میں ملتی ہے۔ میرے ذہن میں یہ سوال بھی ہے کہ کیوں ناولوں میں دلت زندگی کی حقیقی تصویر کم ملتی ہے، کہانیوں میں زیادہ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول کی بڑی آئیڈیالوجی کے ساتھ اس بڑے بیانیہ کے ڈھانچے میں دلت زندگی کی کہانی خاموش ہوتی ہے۔ اس سیاق وسباق میں خصوصاً تین کہانیوں سدگتی، ٹھاکر کا کنواں اور دودھ کی قیمت کے ضمن میں بحث کروں گا۔ سدگتی 1931 میں، ٹھاکر کا کنواں 1932 میں اور دودھ کی قیمت 1934 میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ نہیں کہوں گا کہ جس ترتیب سے کہانیاں شائع ہوئی ہیں، اسی ترتیب سے اچھی ہیں۔ ادب میں ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تین کہانیاں تین زاویوں سے دلت زندگی کی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

'سدگتی' پر ستیہ جیت رے کی فلم آپ دیکھ چکے ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دو چیزیں ہیں۔ لکڑی کی گانٹھ چیرتے ہوئے دُکھی مر جاتا ہے۔ جب میں ستیہ جیت رے کی فلم میں اس گانٹھ کو توڑتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے بار بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گانٹھ محض گانٹھ نہیں ہے، وہ ذات پات کے نظام کی گانٹھ بھی ہے جسے توڑنے میں گاندھی جی بھی شہید ہو جاتے ہیں۔ اس گانٹھ کو توڑنے میں خود امبیڈکر کتنے کامیاب رہے، یہ آپ غور کریں۔ اسے توڑنا آج بھی باقی ہے۔ دوسری چیز پریم چند کی آئرنی ہے۔ "اگرچہ وہ مر گیا ہے لیکن پریت کی طرح منڈراتا رہتا ہے۔" اِدھر اس کی لاش کو گدھ اور کوے کھاتے ہیں، اُدھر ان کا مہا بھوج ہو رہا ہے۔ آخر میں پریم چند کہتے ہیں کہ "جیون بھر کی بھگتی اور نشٹھا" کا یہی انعام ہے۔ یہ گہرے درد سے پُر آئرنی ہے سدگتی کی۔ سدگتی اور ٹھاکر کا کنواں دونوں کہانیوں کو میں ساتھ ساتھ ملا کر پڑھنے کا مشورہ دوں گا۔ سدگتی ایک پروہت کے ظلم وستم کی کہانی ہے اور ٹھاکر کا کنواں ایک راجپوت زمیندار کے ظلم کی کہانی ہے۔ یہ دونوں کہانیاں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ صدیوں تک اس ملک میں مذہبی پاکھنڈیوں، برہمنوں اور حکومت کرنے والے چھتریوں نے مل کر باقی طبقوں کو لوٹنے اور ان کا استعمال کرنے کی کوشش کی۔ پریم چند کی ان دونوں کہانیوں کو ساتھ رکھ کر دیکھنے سے یہ منظر نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ آپ لوگوں کو یاد ہوگا۔ ٹھاکر کا کنواں میں جیسے ہی دروازہ کھلتا ہے، اس کے ہاتھ سے وہ کلش یا پانی کا گھڑا چھوٹتا ہے، اور کنویں میں گر جاتا ہے۔

پریم چند لکھتے ہیں کہ دروازہ کھلتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ شیر کا منھ بھی اتنا بھیانک نہ ہوگا۔ کہانی کی ٹریجڈی یہ ہے کہ گنگی کا پتی جوکھوں سڑا ہوا گندہ پانی پی رہا ہے۔ گنگی نے اس کو روک دیا کہ مت پیو، نہیں، بیمار تو تم ہو ہی، ٹھیک نہیں ہوگے۔ میں تمھارے لیے اچھا پانی لاؤں گی۔ کہانی ختم ہوتی ہے اور جب گنگی گھر لوٹتی ہے تو وہی سڑا ہوا پانی کا لوٹا اس کے منھ سے لگا ہوا ملتا ہے۔

تیسری کہانی ہے 'دودھ کی قیمت'۔ اس کہانی میں دودھ کی قیمت کچھ اس طرح دی جاتی ہے کہ زمیندار کو بیٹیوں پر بیٹیاں ہی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اتفاق سے

یہ حقیقت ہے کہ اس دوران خود دلت ادیبوں کی تخلیقات میں دلت سماج کی عکاسی نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ مراٹھی سے بھی ہندی میں کافی ترجمے ہوئے ہیں۔ ہندی میں نئی نسل سے متعدد نام سامنے آئے ہیں جن میں کچھ کہانی کار، شاعر اور مفکر ہمارے درمیان ہیں۔ان کی تخلیقات میں جسے کسی وقت ''بھوگی ہوئی حقیقت'' کہا جاسکتا تھا،نظر آتی ہے۔

بیٹا ہوا اور نار کاٹنے کے لیے بھنگن کو بلایا گیا۔ بچے کی ماں کو دودھ نہیں ہو رہا تھا۔ بڑے لوگوں کی عورتوں کو دودھ نہیں ہوتا کھانے پینے کے باوجود تو دودھ پلائی کا کام بھی اسی عورت کو کرنا پڑا۔خود اس کا اپنا بیٹا تھا،وہ بغیر دودھ کے پڑا رہا اور وہ مالکن کے بیٹے کو دودھ پلاتی رہی۔اس لڑکے کا نام منگل ہے۔وہ عورت ایک دن مرگئی اور منگل ان کے گھر میں ان کے ٹکڑوں پر پلتا رہا۔آخر میں منگل کو مار کر نکال دیا گیا۔پریم چند جانتے ہیں،ایسے وقت میں جب انسان ساتھ نہیں دیتا تو آدمی کا ساتھ کبھی کبھی آوارہ کتا دیا کرتا ہے۔ٹامی اور منگل دونوں بات کرتے ہیں۔یہیں پر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔پریم چند نے لکھا ہے:''منگل میں غیرت تو کیا تھی خوف ضرور تھا۔'' قابل توجہ بات ہے کہ دلت یا غریب آدمی کے ساتھ نظام کی سب سے بڑی حیوانیت ہے کہ اس میں غیرت یا احترام کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔کہہ سکتے تھے کہ احترام اتنا ہونا چاہیے تھا کہ جب کھانا نہیں دیا تو جو جھوٹھا پھینکا جارہا تھا اسے کھانے سے منع کر دیتا۔لیکن اس میں غیرت بھی ختم ہوگئی تھی۔منگل کہتا ہے،یہ لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے؟ ٹامی نے پونچھ ہلائی۔کہتا ہے سریش کو اماں نے پالا تھا۔ٹامی نے پھر پونچھ ہلائی۔ لوگ کہتے ہیں دودھ کی قیمت کوئی نہیں چکا سکتا اور مجھے دودھ کی یہ قیمت مل رہی ہے۔ٹامی نے پھر پونچھ ہلائی۔ پریم چند کی کہانی فن کے اس نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی جہاں بات تبصراتی یا تنقیدی زبان میں نہیں کی جاتی۔ ٹامی کی ہلتی ہوئی خاموش پونچھ کسی بڑے سے بڑے ادیب کی زبان سے زیادہ بولتی ہے اور قلم سے زیادہ لکھتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ان تین کہانیوں-سدگتی،ٹھاکر کا کنواں اور دودھ کی قیمت میں پریم چند کی حقیقت نگاری اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔دلت زندگی پر ایک غیر دلت ادیب کے ذریعے لکھی ایسی عمدہ کہانیاں ہندی میں نہ اس وقت تھیں اور نہ آج ہیں۔خود دلت ادیبوں نے ایسی عمدہ کہانی دلتوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو لے کر لکھی ہے یا نہیں،میں نہیں جانتا۔اس پر بحث ہونی چاہیے کہ کیا دلت زندگی پر لکھنے کی قوت و دسترس غیر دلت میں نہیں ہوسکتی؟ ادب میں کیا اس طرح کا خیال ممکن نہیں ہے۔اگر کوئی ادیب دلت نہیں ہے،جس نے خود اپنی زندگی میں وہ سب کچھ بھوگا نہیں ہے،لیکن اس میں احساس ہے،وہ ہمدردی یا گہرا لگاؤ محسوس کرتا ہے۔اس شناخت کی کیا طاقت ہے اور کیا حد ہے؟ پریم چند اپنے تخیل کی توسیع کر کے اس زندگی کے حقیقی خدوخال کی تفہیم میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں ہوئے تھے۔یہ ان کے فکری موقف اور اس کے تضاد کا سوال ہوسکتا ہے۔اگر کوئی کمی تھی تو وہ ان کے علم میں تھی، بھوگی ہوئی حقیقت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے تھی،اس پر غور کیا جانا چاہیے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس دوران خود دلت ادیبوں کی تخلیقات میں دلت سماج کی عکاسی نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ مراٹھی سے بھی ہندی میں کافی ترجمے ہوئے ہیں۔ ہندی میں نئی نسل سے متعدد نام سامنے آئے ہیں جن میں کچھ کہانی کار،شاعر اور مفکر ہمارے درمیان ہیں۔ان کی تخلیقات میں جسے کسی وقت ''بھوگی ہوئی حقیقت'' کہا جاسکتا تھا،نظر آتی ہے۔اس حقیقت سے ان لوگوں نے اپنے درد کے مابین ایک ادب پیدا کیا ہے۔اس میں جو طاقت ہے، جو تپش ہے، جو درد ہے،ساتھ ہی جو غصہ ہے اور جد و جہد کی ایک رفتار ہے۔اس سے پہلے ہندی ادب میں نہیں تھی۔ممکن ہے کہ نئی نسل کے ادیبوں میں وہ دلت ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ادب میں نئی نسل ہونے کی وجہ سے ہو۔جو ایک ناپختگی ہے۔کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ مسائل کے تئیں گہری واقفیت کے باوجود بھی تھوڑی خامی در آتی ہے۔معروضی اور مستحکم ہونے کے لیے تھوڑا صبر ضروری ہے کیوں کہ کبھی کبھی ہم جس صورت میں جی رہے ہوتے ہیں،اس میں ہو کر بھی ہم نہیں دیکھ پاتے۔اسے دیکھنے کے لیے ذرا دور جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ دونوں حالات ہوتے ہیں۔یہ وہ مسائل ہیں جو پریم چند کے ادب میں دلت زندگی کی تصویر پیش کرنے والے چیلنج کے طور پر سامنے آنے والے مسائل ہیں۔

بحث کا موضوع نہ یہ ہے اور نہ ہی وہ ہونا چاہیے کہ پریم چند ادب کو دلت ادب میں شامل کیا جائے یا نہیں۔اب تک دلت زندگی کو لے کر ادب میں غیر دلت ادیبوں نے جو لکھا ہے،وہ ہمارے ادب کا ایک باب ہے۔تاریخ ہے۔وہ تاریخ آج اس منزل پر پہنچی ہے،اب جو بیچ اور بڑا سوال ہے،انگریزی میں بھی جس کو لے کر نمائندگی کی۔ جہاں یہ سمجھا جارہا ہے کہ عورتوں کی نمائندگی عورتیں ہی کرسکتی ہیں،ان کی کوئی اور نمائندگی نہیں کرسکتا۔ضروری نہیں کہ ہماری نمائندگی ہمارے درمیان کا ہی آدمی کرے۔اگر ایسا ہوتا تو پوری قومی تحریک میں کسی اور کی کوئی اور نمائندگی کیوں کرتا رہا ہے؟ آج بھی جمہوریت میں ہمارے جو نمائندے ہیں،وہ کن لوگوں کے نمائندے ہیں،جن لوگوں کے نام پر وہ گئے ہیں،ان کی نمائندگی کرتے ہیں کہ نہیں کرتے ہیں۔ادب نمائندگی کا ذریعہ ہے اور اس نمائندگی کی علمیات کیا ہوگی،اس نمائندگی کی جمالیات کیا ہوگی؟ اس سے جڑا ہوا سوال ہے کہ کیا دلت زندگی کی تصویر پیش کرنے کا حق صرف دلتوں کو ہی ہے۔یہ انھیں تک محدود رہے یا دوسرے لوگوں کے لیے بھی یہ متبادل کھلا ہوا ہے اور کھلا ہونا چاہیے۔یہ ایک اہم سوال ہے۔اس مسئلہ پر دلتوں اور غیر دلتوں کے مابین مکالمہ ہونا نہایت ضروری ہے۔یہ دلت ادب کے لیے بھی ضروری ہے۔

■

Dr.Shiv Prakash
Assistant Professor
CIL, SLL&CS, JNU
New Delhi-110067
shivprakash44@gmail.com

محمد سہیل

انور جلالپوری کے منظوم اردو تراجم ایک مطالعہ

انور جلالپوری کا آبائی وطن قصبہ جلالپور ہے جو اجودھیا سے تقریباً 75 کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، جلالپور کی جغرافیائی نقطۂ نظر سے تاریخی، علمی اور ادبی حیثیت آج بھی مسلم ہے، اسی علمی قصبے میں انور جلالپوری نے 6 جولائی 1047 کو اپنی آنکھیں کھولیں، ان کا اصل نام انوار احمد تھا، ابتدائی تعلیم جلالپور میں حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں سے انھوں نے ایم اے انگریزی کی سند حاصل کی ،اس کے بعد اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے اردو میں ایم اے کیا، انھوں نے شاعری کا آغاز 1960 کی دہائی میں کیا، اور تقریباً نصف صدی تک تصنیف وتالیف کا سلسلہ چلتا رہا، انور جلالپوری کی تقریباً 24 کتابیں منظر عام پر آئیں، جن میں کھارے پانیوں کا سلسلہ، خوشبو کی رشتے داری، جاگتی آنکھیں، روشنائی کے سفیر، اپنی دھرتی اپنے لوگ، ضرب لا الہ، جمال محمدؐ، بعد از خدا، حرف ابجد، راہرو سے راہنما تک، توشۂ آخرت، اردو شاعری میں گیتا، اردو شاعری میں گیتانجلی، اردو شاعری میں رباعیات خیام اور سیریل 'اکبر دی گریٹ' قابل ذکر ہیں۔

انور جلالپوری کا مطالعہ نہایت وسیع ہے، ان کی شاعری میں فکر وفن کا حسین توازن اور امتزاج ملتا ہے، انور جلالپوری کی شاعری قومی یکجہتی، حب الوطنی، اخوت ومحبت، انسان دوستی ، قومی وملکی ترقی، ہندوستان کی ساجھی وراثت اور مشترکہ تہذیبی قدروں کی رفیق وپاسبان ہے، انور جلالپوری نے ہمیشہ منفی اور تخریبی شاعری سے گریز کیا، ان کو دور حاضر کا نظیر اکبر آبادی کہا جا سکتا ہے، انھوں نے سماج کے ہر طبقے کو متاثر کیا، ان کی شاعری کسی علاقے، کسی ملک کی ترجمان نہیں بلکہ پوری عالمی انسانی برادری کی ترجمان ہے، ان کی شاعری ماضی کی داستان، حال کا آئینہ اور مستقبل کی پیشن گوئی ہے۔

انور جلالپوری ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار تھے، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال کے حوالے سے ان کے مضامین نہایت اہمیت کے حامل ہیں، ان کی نثری تخلیقات غور وفکر کے در وا کرتی ہیں، جہاں انھوں نے تاثراتی، شخصی اور تنقیدی مضامین لکھے وہیں ایک مکالمہ نگار کی حیثیت سے بھی ادبی حلقے میں اپنی الگ شناخت قائم کی، ان کی افسانوی ورومانوی نثر ایک تاثراتی فضا ہموار کرتی ہے، ان کا مکالماتی لہجہ قاری کو دعوت فکر دیتا ہے، انور جلالپوری جس طرح کی علمی وادبی تقریر مشاعرے میں کرتے تھے ان کے ادبی وشعری مضامین میں اس کا عکس جا بجا نظر آتا ہے، وہ فطری طور پر ایک خطیب تھے، خطیبانہ صلاحیت ان کو خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔

منظوم تراجم کے حوالے سے بھی انور جلالپوری کا نام اہم ہے، ان کے منظوم اردو تراجم عصری معنویت کی روح سے لبریز اور قومی یکجہتی و ہندو مسلم بھائی چارے کی خوبصورت مثال ہیں۔

انور جلالپوری کے منظوم تراجم میں 'اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم وعمل)'، 'اردو شاعری میں گیتانجلی'، 'اردو شاعری میں رباعیات خیام' اور 'توشۂ آخرت' جیسے اہم ترجمے شامل ہیں، ذیل میں انھیں تراجم کی روشنی میں انور جلالپوری کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

1. اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم وعمل)

میدان جنگ میں بھگوان شری کرشن اور مہارتھی ارجن کے درمیان طویل گفتگو اور بھگوان شری کرشن کے احکام وارشادات کو مہارشی وید ویاس نے دیووانی سنسکرت کے ساتھ 18 ابواب اور 700 اشلوکوں میں قلم بند کیا جن کا اسم مبارک 'شریمد بھگوت گیتا' ہے، یہ انسانی بھلائی کا عظیم منشور ہے، گیتا آدمی کو ایک مثالی اور قابل تقلید انسان بنانے کا ایک عالمی دستاویز ہے، اس کو پڑھنے میں لذت ہے، سمجھنے میں سکون ہے اور عمل کرنے میں نجات ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں آدی شنکر آچاریہ نے بڑے عالمانہ انداز میں 'شانکر بھاشیہ' (سنسکرت میں 'بھگوت گیتا' کی تفسیر) لکھی، شنکر آچاریہ ایک اعلیٰ سنیاسی بزرگ تھے جن کی تشریحات کو سمجھنا معمولی آدمی کے بس سے باہر کی بات تھی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، ہندی کے علاوہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں اس مقدس کتاب کے ترجمے کیے جا چکے ہیں، ہندوستان کی اکثر علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

جہاں تک گیتا کے اردو ترجمے کا تعلق ہے تو اس کی ایک شاندار روایت موجود ہے، اردو میں اس کے کم از کم 50 ترجمے ہو چکے ہیں، جن میں نظیر اکبر آبادی، مولانا حسرت موہانی، یگانہ چنگیزی، رئیس امروہوی وغیرہ کے تراجم بہت معروف ہیں۔ انور جلالپوری نے

’شریمد بھگوت گیتا‘ کے مفہوم کو آزادانہ طور پر، کئی کئی شلوکوں کے مفہوم کو ایک ساتھ متعدد اشعار میں نظم کر کے مکمل بھگوت گیتا کے مفہوم کا اردو میں منظوم ترجمہ پیش کر دیا ہے، انھوں نے اس کے لیے بحر متقارب کا استعمال کیا ہے، جو ثقیل، دقیق اور بھاری بھرکم الفاظ کی متحمل نہیں ہوسکتی، یعنی ترجمہ سلیس ورواں، فصیح وبلیغ، آسان اور مترنم ہے، ترجمے کے شروع میں بھگوت گیتا سے لگاؤ، گیتا کی مختصر کہانی، گیتا کا مرکزی خیال، اس کے مخصوص پہلوؤں اور کرداروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب 18 ابواب پر مشتمل ہے، اور ہر باب کا تمہیدی خلاصہ پیش کیا گیا ہے جس سے اُس باب کے اشعار کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر گوپال داس نیرج رقمطراز ہیں:

’’میں نے گیتا کے ہندی وانگریزی بھاشاؤں کے کئی ترجمے پڑھے ہیں لیکن جیسا شری انور جلالپوری نے کیا ہے ویسا مجھے کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔‘‘1

شعبۂ پولیٹیکل سائنس لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر رمیش دکشت اس ترجمے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’جناب انور جلالپوری کا بھاشا پر غضب کا کنٹرول ہے، ان کی بھاشا کی روانی گیتا کے شلوکوں کے معنوں کی پرت در پرت کھولتی چلی جاتی ہے۔‘‘2

ہنومان پرشاد عاجز ماتوی اس ترجمے کی سلاست وروانی کے تعلق سے کچھ یوں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:

’’موصوف (انور جلالپوری) نے نہایت سادہ، سلیس، رواں اور عام فہم زبان میں منظوم ترجمہ کر کے اپنی دوراندیشی اور بالغ النظری کا ثبوت پیش کیا ہے، کم اردو جاننے والے اور ہندی داں طبقہ بھی اسے بآسانی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔‘‘3

انور جلالپوری نے شری کرشن جی کے پیغام جنگ وشجاعت کو جو انھوں نے ارجن کو دیا تھا، کتنے آسان انداز میں شعری حلاوت ولذت کے ساتھ پہنچانے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ ہو:

اے ارجن! ہواؤں کا رخ موڑ دے
یہ نامردی وبزدلی چھوڑ دے
یہ فطرت تمھیں زیب دیتی نہیں
ڈبو دے نہ تم کو یہ عادت کہیں

اٹھو جنگ کے واسطے اٹھ پڑو
لیے ہاتھ میں اسلحے اٹھ پڑو

ایک اور مثال دیکھیں کہ کس آسان اور فصیح وبلیغ انداز میں انور جلالپوری نے گیتا کے پیغام الوہیت ووحدانیت کی ترجمانی کی ہے، جسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گیتا نہیں بلکہ قرآن عظیم کا ترجمہ ہے۔

خدا ہے ازل سے ابد تک خدا
نہیں اس کی قدرت کی کچھ انتہا
وہ موجود ہے اور دیکھے سبھی
وہ اِک لمحے کو بھی نہ سوئے کبھی

انور جلالپوری نے ’شریمد بھگوت گیتا‘ کے مفہوم کو آزادانہ طور پر، کئی کئی شلوکوں کے مفہوم کو ایک ساتھ متعدد اشعار میں نظم کر کے مکمل بھگوت گیتا کے مفہوم کا اردو میں منظوم ترجمہ پیش کر دیا ہے، انھوں نے اس کے لیے بحر متقارب کا استعمال کیا ہے، جو ثقیل، دقیق اور بھاری بھرکم الفاظ کی متحمل نہیں ہوسکتی، یعنی ترجمہ سلیس ورواں، فصیح وبلیغ، آسان اور مترنم ہے۔

2. اردو شاعری میں گیتا نجلی

’گیتا نجلی‘ رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک شہرۂ آفاق تصنیف ہے، جو 1912 میں انگریزی میں شائع ہوئی، یہ ٹیگور کا 103 نظموں پر مشتمل وہ ادبی شاہکار ہے جس پر 1913 میں انھیں دنیا کے ممتاز ترین ’نوبل پرائز‘ سے نوازا گیا، گیتا نجلی کے موضوعات ہمارے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیے گئے ہیں، اس کے نغمے اور گیت موسیقیت، رمزیت اور حسن کی ایسی کیفیت رکھتے ہیں جن کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ گیتا نجلی کی شعری کائنات کا خمیر موسیقی، شاعری اور محبت کے ابرنیساں میں گوندھا گیا ہے، گیتا نجلی کی روحانیت سے بھرپور اور مادہ پرستی سے لاتعلق شاعری کی ہر طرف مقبولیت اور شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیگور کی شاعری کے مختلف زبانوں میں تراجم ہونے لگے، اردو میں بھی اس کے کئی منثور اور منظوم تراجم ہوئے ہیں، اردو میں ’گیتا نجلی‘ کا پہلا نثری ترجمہ نیاز فتح پوری نے کیا، اس کے بعد جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری نے بھی اس کے نثری تراجم کیے، ان نثری تراجم کے علاوہ کئی شعرا نے ’گیتا نجلی‘ کے منظوم تراجم کیے، ان میں عبد العزیز خالد، عبد الرحمٰن بجنوری، سہیل احمد فاروقی اور انور جلالپوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اردو شاعری میں گیتا نجلی دراصل ’گیتا نجلی‘ کے مفہوم کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ انور جلال پوری نے یہ ترجمہ کیوں کیا؟ خود مترجم کے الفاظ میں دیکھیے:

’’ٹیگور کی نظموں میں ایک خاص قسم کا روحانی نشہ ہے جو دماغ کی غذا بن جاتا ہے اور دل کے لیے شیرینی، ٹیگور کی ’گیتا نجلی‘ کو پڑھتے پڑھتے میرے شاعرانہ ذوق نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اردو شاعری میں ان نظموں کا ترجمہ کروں۔‘‘4

دلچسپ بات یہ ہے کہ انور جلالپوری کو بنگلہ زبان سے براہ راست کوئی واقفیت نہیں تھی، اس لیے انھوں نے گیتا نجلی کے ترجمے کے لیے انگریزی نسخے کا سہارا لیا، جس کو خود ٹیگور نے کیا تھا جو ڈبلیو بی ییٹس کے تعارف کے ساتھ 1912 میں شائع ہوا، انور جلالپوری نے لفظی ترجمے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا، ٹیگور کا اصل بنگالی متن تھا اور انور جلالپوری نے اپنے ترجمے کو گیتا نجلی کے مفہوم کا شاعرانہ ترجمہ قرار دیا ہے، ’گیتا نجلی‘ بنیادی طور پر ایک روحانی اور مذہبی دستاویز ہے، لیکن اس میں کسی ایک عقیدے کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

انور جلالپوری نے ’گیتا نجلی‘ کے ترجمے کا آغاز اس طرح کیا ہے۔

تری مرضی بنایا تو نے لامحدود مجھ کو بھی
یہ عزت بخش دی ہے اے مرے معبود مجھ کو بھی
مری ہستی تو سچ مچ اک بہت کمزور پیالہ ہے
اسی پیالے میں میری زندگی بھر کا نوالہ ہے

خداوند تعالی نے انور جلالپوری کو علمی اور ادبی بلندیوں کے ساتھ دل دردمند، نگہ بلند اور فکر ارجمند بھی عطا کی تھی، ذیل کے اشعار کو گنگناتے جایئے اور سوز وگداز کو محسوس کرتے جایئے۔

پہاڑوں، گھاٹیوں میں تو اسے لے کے جاتا ہے
یہ ہے وہ بانسری جس کا فضاؤں تک میں نغمہ ہے
جو اس کے سر، جو راگ اس کے، ہے کافی تازگی ان میں
نیا پن ہر طرح کا ہے، نئی ہے زندگی ان میں
جو تیری بخششیں ہیں وہ مرے ہاتھوں کو ملتی ہیں
ہزراوں سال تک یہ بخششیں مجھ پر برتی ہیں

ٹیگور کی شاعری کا اصل رنگ متصوفانہ ہے، جس میں ہجر ووصال کے ساتھ موت وزندگی کے لافانی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، جذب وسرمستی، شیفتگی ووارفتگی کی لڑی میں پروئے ہوئے الفاظ میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو فارسی کی شعری روایت سے در آمد کی گئی ہیں۔

مرے مالک میں کیا جانوں کہ نغمہ تیرا کیسا ہے
بڑی حیرت سے میرا دل ترا سنگیت سنتا ہے
مری خواہش ہے تیری لے سے اپنی لے ملاؤں میں
مگر جو کامیابی ہے اسے ہرگز نہ پاؤں میں

ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کے لیے دریا کی موجوں، لہلہاتے کھیتوں، اڑتے پرندوں، مٹی سے اٹھتی خوشبوؤں اور بدلتے موسموں اور وقت کے متنوع رنگوں کو سمجھنا اور پہچاننا ضروری ہے، انور جلالپوری کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے ترجمے کے لیے لفظوں کے لغوی معنی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ ان کی روح میں اترنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے کشتی کو اب دریا کی موجوں میں چلانا ہے
مجھے بھی آج اپنے حوصلوں کو آزمانا ہے
مجھے افسوس ہے ساحل پہ میں بیکار بیٹھا ہوں
کوئی میرا نہیں ہے میں یہاں بے یار بیٹھا ہوں
سنو ٹیگور! یہ کیسی خلا میں گھورتے ہو تم
کہاں پر ہے تمھارا ذہن، اور کیا سوچتے ہو تم

انور جلالپوری کے ترجمے میں 'گیتا تجلی' روحانیت سے زیادہ انسانیت کی داعی اور پیامبر معلوم ہوتی ہے، انور جلالپوری کا یہ بنیادی امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور مشاعروں کے توسط سے لوگوں کے درمیان دوریوں اور فاصلوں کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور اس طرح وہ برصغیر میں سیکولر روایات کے پاسبان، گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار اور ہندوستان کی ساجھی وراثت اور تہذیب کے ایک بڑے وکیل کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔

انور جلالپوری کا یہ بنیادی امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور مشاعروں کے توسط سے لوگوں کے درمیان دوریوں اور فاصلوں کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور اس طرح وہ برصغیر میں سیکولر روایات کے پاسبان، گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار اور ہندوستان کی ساجھی وراثت اور تہذیب کے ایک بڑے وکیل کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔

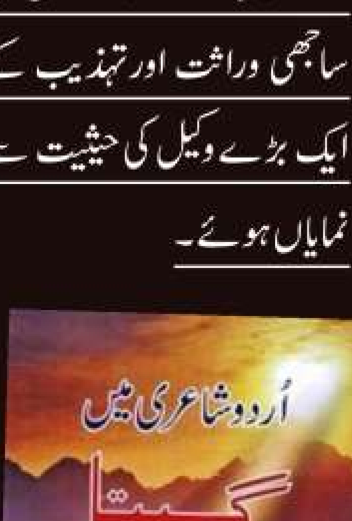

3 توشۂ آخرت (منظوم مفہوم پارہ عم)

قرآن ایک کتاب ہدایت ہے، دستور ربانی ہے، صحیفۂ آسمانی ہے، کتاب عمل ہے، منشور زندگی ہے، اس کا ایک ایک حرف شک وشبہ سے بالاتر ہے، یہ دنیا کی واحد مذہبی کتاب ہے جو علم ورحمت کے تذکرے سے شروع ہوتی ہے، یہ کتاب دنیا کو نہ تو براعظموں میں بانٹتی ہے نہ عرب وعجم میں کوئی امتیاز رکھتی ہے، اس کی تعلیمات ہر اس شخص کے لیے ہے جو کرۂ ارض کے کسی بھی سرد وگرم علاقے یا سبزہ زار وریگزار میں سانسیں لے رہا ہو۔

قرآن پاک کے اردو نثری تراجم کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد اردو کے منظوم ترجموں کی بھی ہے، انھیں میں سے قرآن کے تیسویں پارے کا ایک بہترین اردو منظوم مفہوم ترجمہ 'توشۂ آخرت' کے نام سے انور جلالپوری کا بھی ہے، اس کے حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں:

''میرے پاؤں میں سیاسی دلچسپیوں کی ایک زنجیر پڑی ہوئی تھی میں نے اسے ایک لمحے کے فیصلے میں توڑ دیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اب کچھ اس جہان دائمی کے لیے کرنا چاہیے جو ہمیشہ کے لیے ایک ٹھکانہ ہے، لہٰذا میں نے قرآن پاک کے تیسویں پارے کے منظوم ترجمے کا نیک اور پاکیزہ کام شروع کر دیا، رحمت باری میرے ساتھ رہی، اللہ کا شکر ہے کہ یہ مقدس کام میرے قلم سے مکمل ہوا۔''5

دیکھیے قرآن کریم کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ کی کس بلیغ اور آسان انداز میں ترجمانی کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے تعریف ساری خدا کے لیے
جو کن کہہ دے اور ساری دنیا بنے
وہی رب تو سارے جہانوں کا ہے
مکانوں کا ہے لا مکانوں کا ہے
رحیم اور رحمٰن بھی اس کے نام
چلائے وہی سارے جگ کا نظام
قیامت کے دن کا بھی مالک وہی
اسی کے اشارے سے دنیا بچی
تری ہی عبادت سے ہے واسطہ
مدد کے لیے ہے تجھی سے دعا

4 اردو شاعری میں رباعیات خیام

یہ مجموعہ عمر خیام کی 72 رباعیات کے مفہوم کے منظوم اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔

عمر خیام بادشاہ طغرل کے دارالحکومت نیشاپور میں 1039 میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں 1131 میں ان کا انتقال ہوا تھا، عمر خیام کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف مشرق میں بلکہ مغرب میں بھی بڑے ذوق وشوق کے ساتھ کیا گیا، بلکہ کچھ دانشوروں کا تو یہ ماننا ہے کہ عمر خیام کی شاعری کا مغرب زیادہ دیوانہ ہے، دنیا کی بے شمار زبانوں میں ان کی شاعری، علمی اور سائنسی کارناموں کا ترجمہ ہو چکا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ عوام انھیں صرف ایک شاعر سمجھتے ہیں اور وہ بھی جام و پیانہ میں ڈوبا ہوا شاعر۔

عمر خیام کی رباعیات کا پہلا نسخہ 1423 میں مرتب ہوا تھا جبکہ ان کا انتقال 1131 میں ہوا تھا، ان تین صدیوں میں ان کی شخصیت پر بڑے گرد و غبار جم چکے تھے۔

خیام کی رباعیات کو شہرت اس وقت ملی جب انگریز شاعر فٹز جیرالڈ نے 1859 میں خیام کی منتخب 75 رباعیات کا انگریزی زبان میں بہترین ترجمہ کیا، اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی 'رباعیات خیام' کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں، ان میں راجا مکھن لال، عبد الحمید عدم اور واقف مرادآبادی کے ترجمے قابل ذکر ہیں، ان کے ترجموں نے ہندوستان میں عمر خیام کو بہت مقبول بنایا، انھیں ترجموں میں ایک اہم ترجمہ 'اردو شاعری میں رباعیات خیام' کے نام سے انور جلالپوری کا بھی ہے، اپنے اس ترجمے کے حوالے سے انور جلالپوری لکھتے ہیں:

''میں نے عمر خیام کی رباعیات کا ہو بہو ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے مفہوم کا ترجمہ رباعیات یا قطعوں میں بھی نہیں کیا ہے، میں نے مفہوم کو اردو نظم میں پیش کر دیا ہے، اس کام کو میں نے بڑی شعری دلچسپی کے ساتھ کیا ہے، زبان اتنی آسان ہے کہ دیوناگری رسم الخط والے بھی پڑھ کر بے انتہا لطف اندوز ہوں گے، تقابلی مطالعہ طالب علمی کے زمانے سے میرا ذوق بھی تھا اور میرا شوق بھی، یہ ترجمہ اسی کا نتیجہ ہے۔''[6]

انور جلالپوری کے منظوم اردو تراجم عصری روح، زمانے کے تقاضوں اور اس کی ضروریات، زبان وبیان، معنی ومفہوم، احساس وخیال، غنائیت و موسیقیت، ندرت وجدت، فصاحت وبلاغت، سلاست وروانی، لطافت وشیرینی غرضیکہ ہر اعتبار سے اردو ادب کے سب سے کامیاب ومنفرد منظوم تراجم کی فہرست میں جگہ دیے جانے کے قابل ہیں۔

دیکھیے ذیل کے اشعار میں کس خوبصورت انداز میں انور جلالپوری نے جمشید کے دربار کا نقشہ کھینچا ہے۔

جہاں کل شام تک جمشید کا دربار لگتا تھا
جہاں پر میکدے کا اک ہنسی ماحول سجتا تھا
وہاں پر آ کے شیروں نے بھی اب مسکن بنایا ہے
وہاں کتوں نے بھی گھر جیسا اک آنگن بنایا ہے
وہاں بہرام جیسا شاہ جو مشہور عالم تھا
کبھی شعلہ تھی فطرت اور کبھی جو خود ہی شبنم تھا
وہ ساری طاقتیں لے کر کے زیر خاک سوتا ہے
وہ خر کے لات کھاتا ہے نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے

ایک مثال اور دیکھیں جو شعری لطافت وحلاوت سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی کو بیان کرتی ہے۔

یہ قصہ جو پینے پلانے کا ہے
گلاسوں سے آواز آنے کا ہے
تماشا یہ ہے مختصر وقت کا
بڑا عارضی ہے سفر وقت کا
سبھی بے خبر اس کے انجام سے
ڈریں اچھے اچھے اسی نام سے

اب راہ عشق کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

رہ عشق حد درجہ دشوار ہے
کہ اس رہ میں قربانی درکار ہے
در میکدہ سے ملے روشنی
تو بڑھ جائے انسان کی زندگی
اسی رہ پہ جلوے بھی قربان ہوں
عبادت کے رستے بھی قربان ہوں
در میکدہ عشق کا راستہ
یہیں سے ملے حسن کا فلسفہ

رباعیات عمر خیام کی اصل خوبی بیان کی تاثیر ہے جس نے ہمیشہ پڑھنے والوں کو مسحور کیا ہے، ان میں انسانی محبت کے معاملات سے لے کر فلسفیانہ افکار تک سب کچھ موجود ہے۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد پورے وثوق ویقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انور جلالپوری کے منظوم اردو تراجم عصری روح، زمانے کے تقاضوں اور اس کی ضروریات، زبان وبیان، معنی ومفہوم، احساس وخیال، غنائیت وموسیقیت، ندرت وجدت، فصاحت وبلاغت، سلاست وروانی، لطافت وشیرینی غرضیکہ ہر اعتبار سے اردو ادب کے سب سے کامیاب ومنفرد منظوم تراجم کی فہرست میں جگہ دیے جانے کے قابل ہیں، یہ ترجمے بلاشبہ انور جلالپوری کی دنیا کی متعدد زبانوں پر گرفت، مختلف انسانی تہذیبوں اور قوموں کی تاریخ وتمدن سے گہری واقفیت اور مختلف ادیان ومذاہب سے قلبی لگاؤ اور وابستگی کی شہادت دیتے ہیں۔

حواشی

1 انور جلالپوری، اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم وعمل) نعمانی پرنٹنگ پریس، گولہ گنج لکھنؤ، جولائی 2013، ص 10
2 ایضاً، ص 19
3 ایضاً، ص 25
4 انور جلالپوری، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، روشن پرنٹرس، دہلی، 2014، ص 13
5 انور جلالپوری، توشۂ آخرت (منظوم مفہوم پارہ عم)، ص 17
7 انور جلالپوری، اردو شاعری میں رباعیات خیام، ص 8

■

Mohd Suhail
Research Scholar, Department Of Urdu
Lucknow University, Lucknow
Mukarim Nagar, Daliganj,
Lucknow-226020 (UP)
Mobile: 8934069774
E-mail: sahilsayeed1990gmail.com

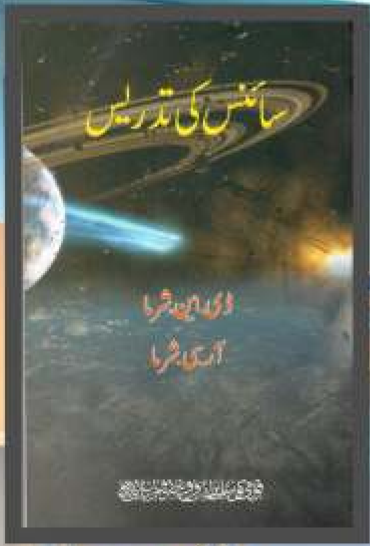

مصنف: ڈی این شرما، آر سی شرما
مترجم: غلام دستگیر

سائنس کی لائبریری

سائنس کی کتابوں کی ایک اچھی لائبریری ہر ایک اسکول کی اولین ضرورت ہے۔ یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے کہ سائنس کی لائبریری اسکول کی عمومی لائبریری سے الگ سائنس کے اُستاد کے تحت رہے یا جنرل لائبریری کا ایک جزو ہو۔ پہلا طریقہ بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں اُستاد کے لیے یہ آسان، سہولت بخش اور زیادہ مؤثر ہوگا کہ وہ طلبا کی توجہ کسی خاص کتاب یا کسی مخصوص موضوع کی طرف مبذول کرائے۔ وہ اس بات پر نظر رکھ سکتا ہے کہ طلبا کس حد تک غیر نصابی مطالعہ کی طرف راغب ہیں اور ان کی دلچسپی کے کسی خاص میدان کو نوٹ کر سکتا ہے۔ مزید برآں کتابی حوالہ کے لیے یا گھر پر پڑھنے کے لیے مستعار، وقت اور دلچسپی کو ضائع کیے بغیر فوراً مل جاتی ہیں تاہم عمومی دلچسپی والی سائنس کی کتابیں جنرل لائبریری میں بھی رکھی جاسکتی ہیں۔

تجربہ گاہ میں کوئی نئی سائنس کی لائبریری قائم کرنے سے پہلے سائنس کے استاد کو رقم اور جگہ کا جو میسر آسکتی ہیں، جائزہ لینا چاہیے۔ اسی کے مطابق اسے لائبریری کے قیام کا منصوبہ بنانا چاہیے۔ ایک حقیقی طور پر مفید لائبریری بنانے کے لیے کتابوں کا بہت دانشمندانہ انتخاب ضروری ہے۔ سائنس کا اُستاد سائنس کی کتابوں کے انتخاب میں تقریباً 2,000 کتابوں کی ایک درجہ بند فہرست سے رجوع کر کے بہت مدد حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سائنس ماسٹرس ایسوسی ایشن، لائبریری بکس سلیکشن کمیٹی کی شائع کردہ ہے اور اسکول لائبریری کے لیے سائنس کی کتابوں کے عنوان سے جان مرے کی شائع کی ہوئی ہے۔ لائبریری کے لیے تقریباً سو کتابوں کی ایک فہرست اس کتاب کے آخر میں دی ہوئی ہے۔

اُستاد کو طلبا میں مطالعہ کی خواہش اور حوالہ کی کتابوں کے استعمال کی صلاحیت پیدا کرنا چاہیے۔ طلبا سے کہا جائے کہ وہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں پر مختصر تبصرہ تحریر کریں۔ طلبا کی ایک مختصر سی کمیٹی اُستاد کے ساتھ لائبریری کے کام میں تعاون کرنے کے لیے منتخب کی جائے۔ ایک ایسا باہمی حوالہ جاتی انڈیکس رکھنا چاہیے جس میں کہ اساتذہ نے کتابوں میں دی ہوئی معلومات مختصراً نوٹ کر رکھی ہوں۔ یہ انڈیکس طلبا کو اپنے مطالعے میں مدد دے گا۔

سائنس کی لائیریری کو مختلف سیکشنوں میں تقسیم ہونا چاہیے اور ہر سیکشن میں مختلف ٹائپ کی کتابیں ہونا چاہئیں۔ سائنس لائبریری کی کتابوں کو ذیل کی شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. مجوزہ نصابی کتابیں
2. ضمنی مطالعہ کے لیے اور تشویق پیدا کرنے والی کتابیں۔

تالاب میں پائی جانے والی حیات کے عجائبات
سمندر سے حاصل کی جانے والی پیداوار
علیم کیمیا کا رومان
سوانح حیات وغیرہ

درحقیقت ایسی کتابوں کی بہت کمی ہے اور چند جو میسر آتی ہیں وہ انگریزی زبان میں ہیں۔ اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ ایسی کتابوں کا علاقائی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔

3. پس منظر والی کتابیں:

چاند کی کہانی — زمین کی کہانی — انسانی (جسم کی) مشین
پنیسیلین کی کہانی — دخانی انجن کی کہانی

4. حوالہ کی کتابیں:

عام طور پر پائے جانے والے پرندے — عام پیڑ پودے
سائنس کی ڈکشنری — سائنس کی انسائیکلوپیڈیا
تاریخ سائنس

5. عام پسندیدگی والے اور معیاری جرائد

اہم اور مفید جرائد سائنس کی لائبریری کا اہم جزو ہونا چاہئیں اور سائنس کے

استاد کو طلبا کے ذہن میں ان کی افادیت بٹھانی چاہیے۔

سائنس کی نصابی کتابیں

پڑھنے پڑھانے کے عمل میں کتاب اہم امدادی سامان میں سے ایک ہے اور اسکول کے بچوں کی تعلیم میں اس کا محوری کردار رہا ہے۔ بھارت کے بیشتر اسکولوں میں، اور بیرونی ممالک کے بھی، تعلیم کا عمل ایک فقرے میں ادا کیا جا سکتا ہے'' جیسی نصابی کتاب ویسی ہی تدریس اور تعلیم'' لیکن بدقسمتی سے جو نصابی کتابیں بے اس وقت لکھی جاتی ہیں معیار کے مطابق نہیں ہیں اور نصاب کی سختی سے پابند ہوتی ہیں اور اکائیاں یا اسباق کم ہی طلبا کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کے گرد منظم اور مرتب کیے جاتے ہیں۔ سائنس کی نصابی کتاب کو طلبا کی شخصیتوں کی نشوونما میں معاون ہونا چاہیے۔ اُن میں ذہنی کشادگی، تنقیدی انداز، جو ان کے لیے نئی معلومات کے انکشاف میں معاون ہو، فطرت کی قدر شناسی اور اُس کے فہم اور اُسے اپنی ضروریات کے لیے ساتھ بنانے کے عمل کی نشوونما کرنا چاہیے نہ کہ صرف حقائق ذہن میں ٹھونسنا۔

'' نصابی کتابوں کا سوال ہمارے ملک کے لیے سب سے اہم اور فوری ضرورت کا مسئلہ ہے۔ اسکوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی نصابی کتابیں تیار کرنے کے لیے ریاستی اور قومی بنیاد پر موثر اقدام درکار ہے۔

ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری

> پڑھنے پڑھانے کے عمل میں کتاب اہم امدادی سامان میں سے ایک ہے اور اسکول کے بچوں کی تعلیم میں اس کا محوری کردار رہا ہے۔ سائنس کی نصابی کتاب کو طلبا کی شخصیتوں کی نشوونما میں معاون ہونا چاہیے۔ اُن میں ذہنی کشادگی، تنقیدی انداز، جو ان کے لیے نئی معلومات کے انکشاف میں معاون ہو۔

مقاصد

سائنس کی ایک اچھی نصابی کتاب تدریس سائنس کے مقاصد کو پورا کرنے والی ہونا چاہیے۔ ان میں سے بعض نیچے دیے گئے ہیں:

1. ایک اچھی نصابی کتاب کو سائنس کے بنیادی تصورات اور اصولوں کے صحیح فہم میں معاون ہونا چاہیے۔ بیشتر کتابیں جو ابتدائی، وسطانی یا فوقانی درجات کے لیے تجویز کی جاتی ہیں صرف حقائق کو بیان کر دیتی ہیں اور اگر اُستاد ایسی ہی کتابیں لفظ بلفظ پڑھتا رہے، درجے میں کسی قسم کی سرگرمی پیدا کرے اور نہ نصابی کتابوں میں دیتے ہوئے حقائق کو صحیح تصورات اور اصولوں کی شکل میں ڈھال کے پیش کرے تو نصابی کتابوں کا مقصد اس کے ہاتھوں فوت ہو رہا ہے اور وہ تعلیم کے مقصد کے حصول کے لیے بالکل کوشاں نہیں ہیں۔

2. اسے طلبا میں سائنٹفک انداز فکر پیدا کرنا چاہیے اور سائنٹفک طریقہ کے فہم کی نشوونما کرنا چاہیے۔ اسے ذہنی کشادگی اور باہمی تعاون کا انداز پیدا کرنا چاہیے۔ کوئی بچہ جو کتاب کو سرسری طور پر دیکھے، سائنٹفک معلومات کے مال کی دُکان میں داخل ہونے پر راغب ہو جائے۔ اُسے اپنے چاروں طرف کی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہو جائے۔ اُسے دلچسپی کی راہیں کھولنا چاہیے، اور سائنس کے لیے مناسب انداز فکر اور اُس سے لگاؤ پیدا کرنا چاہیے۔ اُسے طلبا کو کسی مسئلہ کے حل کا طریقہ بتانا چاہیے۔ ہر بچہ کو روزمرہ کی زندگی میں کچھ مسائل پیش آتے ہیں۔ اگر بچہ، جب تک وہ اسکول میں رہتا ہے، کسی مسئلہ سے سائنٹفک انداز سے نبرد آزما ہونے کی عادت ڈال لیتا ہے تو وہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا سامنا بڑے اعتماد سے کرے گا۔ اس طرح تعلیم کا مقصد کہ نوخیز نسلوں کو زندگی کے لیے تیار کیا جائے، آپ سے آپ پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اُستاد کو پہلے سے منصوبہ بندی کرنی ہوتی ہے تاکہ وہ مضمون کے مواد کو اس تکنیک کے مطابق ڈھال سکے۔
سائنس کی نصابی کتاب کو، مناسب مشقوں کے ذریعے، بچے کو سائنٹفک معلومات سے اس کے وسیع اور متنوع انطباقات کے ساتھ روشناس کرانا چاہیے۔

3. اسے بعض مہارتوں کی نشوونما کے مواقع فراہم کرنا چاہیے۔ یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اگر استاد طلبا کو تجربہ گاہ میں آلات سے کام لینے کے مواقع مہیا کرے۔ ان مہارتوں کی مشق کے لیے بھی انتظامات ہونا چاہئیں۔

4. سائنس کا موجودہ نصاب اس قدر بھاری ہے کہ طلبا ہر کام تجربہ گاہ میں بالراست تجربہ سے نہیں سیکھ سکتے۔ پس یہ آج کے دور کی اولین ضرورت ہے کہ نصابی کتاب اُس بہت کم تجربی عمل کی تکمیل کرے جو درجہ میں کرنا ممکن ہے۔

5. اُسے درجہ میں ہونے والے مذاکرات کو صحیح نتائج تک پہنچانے میں رہنمائی کرنی چاہیے، اُسے گزشتہ دور میں ہونے والے انکشافات کے بارے میں بھی معلومات دینا چاہیے اور سائنسدانوں کے بعض سنسنی خیز تجربات کی روداد بھی۔ اُسے تجربے اور مسائل کے حل کے لیے ہدایات دینی چاہئیں۔

6. اُسے اُن اسباق کے سلسلہ میں جو طلبا ختم کر چکے ہوں اُن کے تیزی سے اور منظم انداز سے اعادہ میں معاونت کرنا چاہیے۔

سائنس کی ایک اچھی نصابی کتاب کی خصوصیات

ہم مستثنیات علاقائی زبانوں میں تمام اچھی نصابی کتابوں کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ چند مستثنیات کے علاوہ ہمیں بہت ہی پست معیار کی کتابیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ نہ صرف میکانیکی خصوصیات جیسے تیاری و تزئین، کاغذ طباعت وغیرہ کا معیار پست ہوتا ہے بلکہ مضمون سے متعلق مواد کو پیش کرنے کا اندازہ اور زبان کی روانی بھی ناقص ہوتی ہیں۔ اس سے مصنفین کی کسی قدر سرد مہری اور معاشرتی شعور کا فقدان ظاہر ہوتا ہے۔ بیشتر مصنفین کتابیں دولت کمانے کی غرض سے لکھتے ہیں اور بچوں کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ دوسرے کمیت کو کیفیت پر ترجیح دینے کا رجحان عام ہے۔ مزید برآں، مصنف کے پاس وقت کی بہت کمی ہوتی ہے۔ اسے بمشکل چند ماہ

نصابی کتاب لکھ کر پیش کر دینے کے لیے ملتے ہیں۔اس سے نصابی کتاب کی خوبی پر اثر پڑتا ہے۔ مصنفین ایک پیرا ایک کتاب سے چراتے ہیں اور دوسرا دوسری کسی کتاب سے۔ اُن میں اپج اور نئی فکر کی روح بازاری مقابلے نے بالکل فنا کر دی ہے۔حکومت کو چاہیے کہ وہ نصابی کتابوں کی غیر جانبدارانہ جانچ کے بعد ہی انھیں داخل نصاب کرے۔ بہر حال سائنس کی ایک اچھی کتاب کے لیے کچھ معیارات ہیں۔ان کی نیچے دی ہوئی شقوں کے تحت درجہ بندی کی جاسکتی ہے:

1. **مصنف: اس کی علمی لیاقت اور تجربہ**

صرف اسی مصنف کو، جو مضمون کی تدریس کا کچھ تجربہ رکھتا ہے۔ کتاب شائع کرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ تعلیمی صورت حال کو اُس کی حقیقی شکل میں اور طلبا کی دشواریوں کو سمجھ سکتا ہے۔مزید برآں وہ تدریس کے بدلتے ہوئے تصورات اور تکنیکوں سے واقف ہوتا ہے۔

مصنف کے لیے کچھ کم سے کم علمی لیاقت کا تعین بھی ہونا چاہیے۔ نامور مصنفین کے نام سے کتابیں لکھنے جانے کا طریقہ ختم ہونا چاہیے۔

2. **کتاب کے میکانیکی خدوخال**

(i) نصابی کتاب کی طباعت، استعمال ہونے والا کاغذ اور جلد بندی جاذب نظر ہونی چاہیے۔حروف یا ٹائپ کا سائز طلبا کی عمر کے مطابق ہونا چاہیے۔

(ii) کتاب کو شکلوں، خاکوں اور تصویروں وغیرہ سے اچھی طرح مزین ہونا چاہیے شکلیں، خاکے، تصویریں وغیرہ نصابی کتاب کا معیار بلند کرنے، اس کو زیادہ جاذب نظر اور مفید بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جیسا کہ ایک چینی مقولہ ہے: ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر قدر و قیمت رکھتی ہے۔ لیکن اسے مطلق صداقت کی حیثیت سے قبول نہیں کر لینا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ شکل یا تصویر کتاب میں اپنی مناسب جگہ پر ہو۔ تاکہ وہ جس مقصد کے لیے بنی ہے وہ پورا ہو سکے۔

3. **مضمون کا مواد: اُس کی نوعیت اور تنظیم و ترتیب**

(i) مضمون سے متعلق مواد جہاں تک ممکن ہو نفسیاتی ترتیب سے مرتب ہونا چاہیے۔طلبا کے ذہنی نشو و نما اور ان کی دلچسپیوں کا لحاظ بہت ضروری ہے۔

(ii) مضمون کے مواد میں تضاد فکری نہ پایا جائے اور نصابی کتاب تدریس سائنس کے مقاصد کو پورا کرتی ہو۔اس سے سائنٹفک انداز ہائے فکر، نظم و ضبط اور تمدنی اقدار حاصل ہونے چاہئیں اور طلبا کے لیے پروجیکٹ یا سرگرمیاں تجویز کرنی چاہئیں۔جن سے اصولوں اور تصورات کے فہم میں امداد ملے۔

(iii) ایمنی ہر باب ایک مختصر تمہید سے شروع ہو اور تلخیص پر ختم ہو۔

(iv) ہر باب میں اس کے اختتام پر تفویضات ہونی چاہئیں جو نیچے دی ہوئی ضرورتوں سے مطابقت رکھتے ہوں:

(a) زندگی میں پیش آنے والی صورت حال سے انطباقات

(b) خود اپنی پیمائش قدر کے لیے نئے ٹائپ کی جانچیں۔

(c) پروجیکٹ کے تجربی عمل کے لیے تجاویز

(d) مزید مطالعہ کے لیے تجاویز

(e) جہاں مناسب ہو حسابی مثالیں۔

(v) سرخیاں اور ذیلی سرخیاں جلی حروف میں ہونا چاہئیں۔ مواد کو مناسب انداز سے اور متنوع اور معیاری شکل میں پیش کرنا چاہیے۔

(vi) ہر نصابی کتاب میں ایک تفصیلی فہرست مضامین اور انڈیکس (اشاریہ) ہونا چاہیے۔

(vii) کتاب صاف، سادہ اور صحیح سائنٹفک زبان میں لکھی جانی چاہیے۔ سائنٹفک اور تکنیکی اصطلاحات کے لیے معیاری اصطلاحی الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ قوسین میں انگریزی کی متبادل اصطلاحات بھی دی جائیں۔ کتاب میں استعمال کردہ اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی اس میں دی جانی چاہیے۔اسے زبان کی اصطلاحات اور معلومات میں سے ہر قسم کے ابہام سے پاک ہونا چاہیے۔

(viii) اس میں پڑھنے کے کچھ اچھے طریقے تجویز کیے گئے ہوں۔

(ix) اس میں سائنس کے سامان کی تیاری اور اسے بہتر بنانے کے لیے مفید اور عملی تجاویز دی گئی ہوں۔

(x) بہتر ہو کہ کتاب میں مثالیں مقامی ماحول سے دی گئی ہوں۔ زور ان طریقوں اور موادوں پر دیا گیا ہو جو سماجی ذرائع اور اسکول کی سوسائٹی کے باہمی عمل سے لیے گئے ہوں۔

(xi) اس میں جنرل سائنس کو فن اور حرفے، سماجی ماحول اور طبعی ماحول سے مربوط کرنے کا مناسب انتظام ہونا چاہیے۔

(xii) ہر نصابی کتاب کے ساتھ ایک تجربہ گاہ کا کتابچہ یا مینول بھی ہونا چاہیے۔

متذکرہ بالا اصولوں کے علاوہ یونیسکو منصوبہ بندی کمیشن نے روس کی سوشلسٹ

گاندھی جی کی رائے تھی کہ نصابی کتابیں بالکل نہیں ہونا چاھئیں اور طلبا کو اُستاد کی مدد سے نصابی کتابیں خود مرتب کرنا چاھئیں۔ لیکن بچوں سے اس کی توقع بہت زیادہ ہوگی۔ سائنس کی اچھی نصابی کتابیں سائنس کی موثر تدریس کے لیے ناگزیر ہیں۔

جمہوریہ اور دوسرے ملکوں میں نصابی کتابیں لکھنے کے لیے کچھ اصول دیئے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں سفارشات کی ہیں کہ:

(i) اسے سب سے پہلے نصابی ضروریات معلوم ہونی چاہئیں۔ اُسے نصاب کو بہتر بنانے میں بھی معاون ہونا چاہیے۔

(ii) حقائق، تصورات وغیرہ جدید ہونا چاہئیں اور طلبا کے فہم کی حدود میں۔

(iii) اسے سائنس کو زندگی اور اس کے اعمال سے وابستہ کرنے والا ہونا چاہیے۔ طلبا کو مختلف سائنٹفک طریقوں کا عملی علم ہونا چاہیے اور روزمرہ کی زندگی میں اس علم کو استعمال کرنے کی صلاحیت۔

(iv) کتاب کے مافیہ میں نہ صرف مسلمہ حقائق ہونا چاہیے بلکہ وہ مسائل بھی جن پر تحقیق ہو رہی ہو اور اس طرح وہ طلبا میں ان مسائل کے لیے دلچسپی پیدا کرنے والی ہو۔

(V) کتاب کے مافیہ کا مقصد جدید یک جہت سائنٹفک عالمی نقطہ نظر پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ جس سے سائنٹفک معلومات کے حصول اور انتہائی اہم مسائل کے حل میں کامیابی مل سکے۔ مافیہ سادہ، مختصر، ٹھیک ٹھیک، متعین اور پڑھنے والوں کی رسائی کی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔

پس ایک اچھی نصابی کتاب کو، جہاں تک ممکن ہو، اوپر دیے ہوئے معیارات پر پورا اترنا چاہیے۔ تاہم اسے اُستاد کی جگہ نہیں لینی چاہیے بلکہ وہ کم سے کم معلومات فراہم کرنا چاہیے جو بنیاد کے لیے کافی ہوں۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ نصابی کتابیں بالکل نہیں ہونا چاہئیں اور طلبا کو اُستاد کی مدد سے نصابی کتابیں خود مرتب کرنا چاہئیں۔ لیکن بچوں سے اس کی توقع بہت زیادہ ہوگی۔ سائنس کی اچھی نصابی کتابیں سائنس کی موثر تدریس کے لیے ناگزیر ہیں۔

نصابی کتابوں کی پوزیشن

ابھی تھوڑے دنوں پہلے تک اسکولوں میں نصابی کتابوں کی صورت حال بہت ہی حوصلہ شکن تھی۔ نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (تعلیمی تحقیق وتربیت کی قومی مجلس) کے قیام کے ساتھ اچھی نصابی کتابیں تیار کرنے کا کام نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔ نیشنل کاؤنسل اپنی خاص ایجنسی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن (قومی تعلیمی ادارہ) اور چار علاقائی تعلیمی (تربیتی) کالجوں کے ذریعہ کام انجام دیتی ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے گیارہ شعبے ہیں جن میں سائنسی تعلیم کا شعبہ اور نصاب، طریقوں اور نصابی کتابوں کے شعبے شامل ہیں۔ یہ شعبے سائنس کی تدریس کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں عموماً اور نصابی کتابوں کے لیے خصوصاً اچھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تعلیمی لٹریچر کی مرکزی کمیٹی نے 13 اسکولی مضامین کے لیے ماہرین کی جماعتیں (پینل) اور ایڈیٹوریل بورڈ قائم کیے ہیں۔ یہ کتابیں انگریزی اور ہندی میں تیار ہوتی ہیں اور اس کے بعد ریاستی حکومتوں کے زیر اہتمام علاقائی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے ہیں۔ نیشنل کاؤنسل نے، تعلیمی لٹریچر کی مرکزی کمیٹی کے تحت، اسکولوں کے لیے نمونہ کی نصابی کتابیں اور ضمنی تعلیمی مواد تیار کرنے کے لیے ماہرین کی جماعتیں (پینل) اور ایڈیٹوریل بورڈ قائم کیے ہیں۔ بصورت موجودہ طبیعات، ریاضی اور کیمیا کے لیے تین ایڈیٹوریل بورڈ ہیں اور حیاتیات کے لیے ایک ماہرین کی جماعت۔ یہ بورڈ اور پینل اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین پر مشتمل ہیں اور نامور سائنسدانوں کے تحت کام کرتے ہیں۔ طبیعات، ریاضی اور کیمیا کے ایڈیٹوریل بورڈ علی الترتیب ڈاکٹر اے آر ورما، ڈائرکٹر آف نیشنل فزیکل لیباریٹری، ڈاکٹر ٹی آر سیشادری، ایف آر ایس پروفیسر ایمریٹس دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر جے این کپور، صدر شعبۂ ریاضی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کانپور کے تحت کام کرتے ہیں۔ حیاتیات کا پینل آنجہانی ڈاکٹر پی مہیشوری ایف آر ایس پروفیسر اور صدر شعبۂ نباتیات دہلی یونیورسٹی کے تحت کام کرتا تھا۔

ان ایڈیٹوریل بورڈوں اور پینلوں نے گزشتہ چند سالوں میں قابل لحاظ کام انجام دیا ہے۔ ہائر سیکنڈری درجات کے لیے حیاتیات کی نصابی کتاب انگریزی اور ہندی میں شائع کی جا چکی ہے۔ طبیعات، ریاضی اور کیمیا میں بھی کتابیں مل سکتی ہیں۔ اچھی طرح تجربہ میں آئی ہوئی کتابوں جیسے پی ایس ایس سی کی نصابی کتب، بی ایس سی ایس کی نصابی کتب اسکول میتھمیٹکس اسٹڈی گروپ (اسکولی ریاضی پر غور کرنے والا گروپ) وغیرہ کی نصابی کتابوں کے سستے ہندوستانی ایڈیشن شائع کیے گئے ہیں۔ یہ کتابیں خاصی سستی بھی ہیں اور جدید بھی، اور اس لائق ہیں کہ اُستاد اور اسکولوں کی لائبریریاں انھیں خرید کر کام میں لائیں۔ ■

ماخذ: سائنس کی تدریس، **مصنفین:** ڈی این شرما، آر سی شرما، **مترجم:** غلام دستگیر، **چھٹی طباعت:** 2011، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

غلام قادر

شاعری اور فکشن میں مجھے نئی تخلیقی توانائی نظر نہیں آتی ہے: خالد علوی

خصوصی گفتگو

ڈاکٹر خالد علوی اردو کے اہم نقاد اور دانشور ہیں۔ ان کی پیدائش20 جون 1962 کو ضلع بجنورقصبہ چاند پور میں ہوئی، ان کی ابتدائی تعلیم گلاب سنگھ کالج چاند پور میں ہوئی اور اعلی تعلیم کے لیے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور پھر وہیں درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ان کی بارہ سے زائد تصانیف ہیں جن میں 'غزل کے جدید رجحانات'، 'انگارے کا تاریخی پس منظر اور ترقی پسند تحریک' اور 'اصطلاحات ذوق' وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے مضامین بر صغیر کے معتبر رسائل و جرائد کے علاوہ اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

غلام قادر: آپ کا جس خطے سے تعلق ہے، ظاہر ہے کہ وہ بڑا مردم خیز علاقہ ہے۔ آپ کے بچپن اور جوانی کے دنوں میں وہاں کی سماجی اور تہذیبی صورت حال کیا تھی، خاص طور پر اردو معاشرہ کیسا تھا؟ کیا آپ اس میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟

خالد علوی: مغربی یوپی کے چھوٹے سے شہر بجنور کا ایک قصبہ چاند پور ہے، وہیں سے میرا تعلق ہے، آپ کو میں ایک واقعہ بتاؤں کہ نثار احمد فاروقی صاحب، ایک ہمارے قریب میں ریلوے اسٹیشن ہے گجرولہ، وہاں اپنی آوارگی کے دنوں میں ٹہلتے ہوئے میرے والد کو مل گئے تو میرے والد انھیں گھر لے آئے۔ کہیں سے واپس آرہے تھے تو میرے والد نے دیکھا کہ پڑھا لکھا آدمی ہے تو اپنے گھر لائے.. نثار فاروقی نے میری ایک کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے کہ اس گھر میں منشی نول کشور کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو وہاں نہ دیکھی ہو۔ اتنی کتابیں گھر میں تھیں، نگار کی فائلیں وہاں تھیں، ایک سمینار ہوا دہلی میں ذکاء اللہ پر... ذکاء اللہ کی تاریخ ہند میں جلدوں میں ہے، مجھے ایک جلد کی تلاش تھی، کسی لائبریری میں مکمل نہیں ملی، وہ مجھے اپنے گھر میں مل گئی۔ بعد میں وہ ساری کتابیں دیوبند کو دے دی گئیں، تو گھر کا ماحول اس قدر علمی تھا۔ میرے چچا بہت لکھتے پڑھتے تھے، میرے دادا بھی تھوڑی بہت شاعری کرتے تھے، والد صاحب بھی اردو، فارسی کی شاعری کرتے تھے۔ میرے چچا، والد صاحب اور تایا میاں جب تینوں لوگ بیٹھتے تھے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ ایک دوسرے کو فارسی کا شعر سناتے تھے، اس کے علاوہ تین چار شخصیتیں چھوٹے سے شہر میں ایسی تھیں جو بہت عالم تھیں۔ ان میں ایک پروفیسر شبیر صاحب تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے زمانے میں جب ایم اے او کالج تھا اس وقت یونیورسٹی نہیں تھی، ایم اے فلاسفی کیا تھا۔ ریٹائر ہوگئے، میرے دادا کے دوست تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پھر میرے والد کے دوست ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد مجھے اپنا دوست کہنے لگے تھے۔ انھوں نے مجھے فارسی، انگریزی اور اردو پڑھائی۔ زیادہ پریشانی یہ تھی کہ صبح کو مجھ سے پوچھتے تھے کہ آپ نے نماز پڑھی۔ میں ان سے جھوٹ بول نہیں پاتا تھا، اس لیے میرا رشتہ ان سے پڑھنے پڑھانے کا زیادہ دنوں تک چل نہیں سکا۔ اب میں سوچتا ہوں، اتنے عالم آدمی سے جس قدر استفادہ کرنا چاہیے تھا، نہیں کرسکا۔ کوثر چاند پوری بہت بڑے ادیب تھے پچاس ساٹھ کتابیں ہیں ان کی، وہ چاند پور سے بھوپال چلے گئے تھے پھر دہلی آئے۔ ان کے ایک بڑے بھائی حکیم علی اکبر صاحب تھے، وہ بعد میں نابینا ہوگئے تھے، لیکن وہ اردو کے مقبول رسائل جیسے شمع، بیسویں صدی وغیرہ بچوں سے پڑھوا کر سنتے تھے، باخبر رہتے تھے، اس کے بعد کے لوگوں میں بہت سارے ایسے لوگ تھے جو اردو، عربی اور فارسی وغیرہ کے عالم تھے۔ ہمارا ایک بھٹہ تھا اینٹوں کا، شہر سے باہر دس بارہ کلومیٹر دور، ایک بار میں اپنے دوست کے ساتھ گیا۔ وہاں ایک نمبر دار صاحب کہلاتے تھے، انھوں نے دیکھ کر کہا یک نہ شد دو شد۔ میرے دوست نے ان سے پوچھا آپ فارسی جانتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہم تو مولوی سلیم اللہ کے پڑھائے ہوئے ہیں ۔ چاند پور میں ایک سلیم اللہ علوی صاحب تھے جنھوں نے علاقے کے بہت سے ہندو مسلمانوں کو اردو فارسی پڑھائی تھی، اس زمانے میں آج کی طرح اسکول مدرسے تو تھے نہیں تو اس زمانے کے جو ہندو تھے وہ بھی اردو فارسی

سیکھتے تھے۔اب افسوس کی بات یہ ہے کہ نہ تو نئے لڑکے جانتے ہیں نہ پرانے کوئی بزرگ ایسے ملتے ہیں۔

شہر میں شاعری کا بہت چرچا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے،نشستیں ہوتی تھیں۔نشستیں اب بھی پانچ دس لوگ کرتے ہیں مگر پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ وہ پورا ماحول ختم ہوگیا ہے۔ جب تک میں نے ایم اے وغیرہ کیا، ادھر ہی رہتا تھا۔ دو دلت لڑکے ایک سنار شاعری کرتے تھے۔تو یہ نہیں کہ صرف مسلمان لوگ آتے تھے، اب وہ آہستہ آہستہ سب ختم ہو رہا ہے۔وہاں پر ایک ڈگری کالج ہے۔ میں نے اس میں اردو کی شروعات کرائی تھی، وہاں اردو چل رہی ہے مگر اب سب کچھ صرف برائے نام رہ گیا ہے، پہلے کی طرح اب اساتذہ نہیں ہیں۔

غ ق: آپ اپنے زمانے کے اساتذہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔

خ ع: ہمارے زمانے میں خواجہ احمد فاروقی صاحب، جاوید وششٹ صاحب یہ سب اساتذہ تھے۔ عبادت بریلوی صاحب،شبیہ الحسن صاحب،عسکری صاحب وغیرہ ہمارے زمانے میں نہیں تھے یہ سب لوگ بہت پہلے تھے لیکن ہمارے کالج میں تھے۔جو ذرہ جس جگہ تھا وہیں آفتاب تھا۔جاوید وششٹ صاحب پنڈت تھے،شاعری بھی عمدہ کرتے تھے اور دکنی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔انھوں نے مولوی عبدالحق سے دکنیات پڑھی تھی، جب میری تقرری ہوئی تو جاوید وششٹ صاحب ڈھونڈتے ہوئے مجھ سے ملنے آئے اور کافی دیر تک سمجھایا، وہ ہریانہ سے آتے تھے، ریٹائر ہوگئے تھے۔ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ وہیں اکاؤنٹ کھلوالیں، پیسے آتے رہیں گے تو انھوں کہا، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے مگر مہینے میں ایک بار آجاتا ہوں تو کالج نظر آجاتا ہے، لوگوں سے ایک بار ملاقات ہو جاتی ہے۔ ذکیہ انجم صاحبہ نے مجھے بتایا کہ جب ان کا اپائنٹمنٹ ماتا سندری کالج میں ہوا تو اگلے دن ان سے پہلے جاوید وششٹ صاحب وہاں پہنچ گئے اور دروازے پر کھڑے تھے۔ان سے کہا بیٹے آج پہلا دن ہے تمہارا، یہ نظم پڑھانا اور اس اس طرح پڑھا دینا اور کوئی دشواری ہو تو کالج کے بعد میرے پاس آجانا.. دیکھیے اپنے اسٹوڈنٹس کا کتنا خیال کرتے تھے، نہ صرف پڑھنے اور لکھنے کے معاملے میں بلکہ کالج کے باہر دیگر مسائل کو بھی حل کرتے تھے۔اب شاید تھوڑی سی دوری آگئی ہے۔استاد شاگرد کے رشتے کمزور پڑتے جا رہے ہیں، اگر ہمارے رابطے اچھے ہوں گے تو ہم زیادہ بہتر طریقے سے پڑھائیں گے بھی اور اسے قابل بنا پائیں گے، یہ سب چیزیں اردو کی صورت حال سے متعلق ہیں۔

اب ہم لوگوں کو تو بس نئے لوگوں سے امید ہے کہ خدا کرے جو خلا ہے اسے پر کریں اور اس کا تو صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ خوب پڑھیں، ہر طرح کی چیزیں پڑھیں، صرف اپنے موضوع پر نہیں پڑھیں، صرف اردو نہیں پڑھیں بلکہ اور بھی دوسری چیز پڑھیں جس سے ذہن کشادہ ہو۔

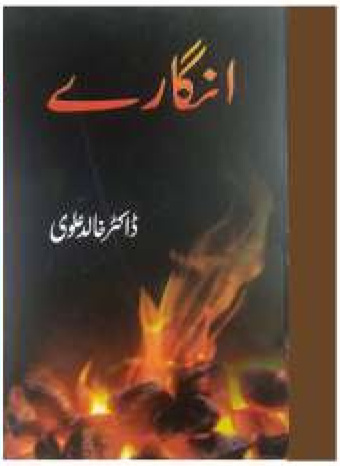

غ ق: موجودہ وقت میں اردو زبان کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟ آیا اردو ریڈرشپ کم ہوئی ہے یا اس میں اضافہ ہوا ہے؟ اور اگر اس میں خاطر خواہ اضافہ یا کمی واقع ہوئی ہے تو اس کے کیا اسباب ہیں؟

خ ع: دیکھیے بڑا عجیب سا مسئلہ ہے۔ اردو سے پیار کرنے والوں کی تعداد ہماری آبادی کے لحاظ سے ہی بڑھ رہی ہے، جو اردو رسم الخط ہے، اس کے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ ہم لوگ ذمے داری سرکاروں پر ڈال دیتے ہیں کہ سرکار اردو کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ کئی صوبوں میں اردو سرکاری زبان ہے، لیکن گھروں میں تو ہمیں ہی پڑھانی پڑے گی۔ اگر آپ دیکھیں بہادر شاہ ظفر مارگ سے لاتعداد اردو کے اخبارات نکلتے تھے وہ سب بند ہوگئے، پڑھنے والے کم ہوئے جبھی تو بند ہوئے۔شمع کی اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ بیسویں صدی، مجرم، ہما، محراب، خاتون مشرق، آستانہ، دین دنیا یہ سب وہ رسائل تھے جو چالیس پچاس برسوں سے نکلتے تھے، وہ سب ختم ہو گئے۔کھلونا بچوں کا رسالہ تھا، جس کی اشاعت بہت تھی اور میری جنریشن کے لوگ تو کھلونا پڑھ کر ہی بڑے ہوئے،اس لحاظ سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ریڈرشپ کم ہوئی ہے۔رسم الخط جاننے والے کم ہوئے ہیں، اردو لٹریچر اور زبان سے دلچسپی بڑھی ہے، دیکھیے آپ جشن اردو کے پروگرام میں جائیں، وہاں بڑی تعداد میں لوگ جاتے ہیں، وہاں اردو سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں مگر یہ جو جشن ہیں یا میلے ہیں یہ کوئی سنجیدہ لٹریری مسئلہ نہیں ہے، لیکن دلچسپی تو ہے، غزل سے، شاعری سے کسی طرح سے، اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان کا جو شاعری کے بارے میں شعور ہے، اسے ہم بہتر بنائیں، جو ہم نہیں کر رہے ہیں۔دلچسپی تو ہے لوگوں میں لیکن رسم الخط پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

غ ق: رسم الخط جاننے والوں کی کمی کے کیا اسباب ہیں؟

خ ع: اس کو آپ ایک مثال سے سمجھیں کہ ہٹلر نے اپنے زمانے میں عبرانی (Hebrew) زبان پر پابندی لگا رکھی تھی کہ کوئی نہیں پڑھے گا، تو جو یہودی عورتیں تھیں، انھوں نے اپنا پورا طریقہ بدل دیا، دوسری عالمی جنگ جاری تھی تو لائٹ نہیں جلا سکتے تھے، جسے بلیک آوٹ کہتے ہیں کہ اگر لائٹ جلے گی تو بمباری ہو جائے گی۔تو وہ صبح چار بجے موم بتی جلا کر اپنے بچوں کو عبرانی زبان سکھاتی تھیں۔ وہاں سرکار دشمنی کر رہی تھی، پڑھنے نہیں دے رہی تھی، یہاں تو کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے، ہم لوگ اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے ہیں۔ کچھ ایسے کام ہوتے ہیں جو اسکول کے ہوتے ہیں کچھ کام گھر کے ہوتے ہیں۔ ہم نے گھروں والا کام بند کر دیا ہے۔ میں اپنی مثال بھی آپ کو دے سکتا ہوں کہ میں سائنس کا طالب علم تھا، اردو کسی اسکول کالج میں نہیں پڑھی، ایم اے سے پہلے، مگر میں اوروں سے زیادہ جانتا تھا کیوں کہ گھر میں ویسا ماحول تھا، میں اپنی والدہ کے لیے اردو کتابیں لاتا تھا، وہ پڑھتی تھیں، پھر مجھے بھی وہ پڑھاتی تھیں۔ دراصل ہم نے بچوں کو

گھروں پر پڑھانا چھوڑ دیا ہے اور تہذیب بھی چھوڑ دی ہے۔ اس لیے اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے اور جہاں ایسا نہیں ہے وہاں کے حالات بہتر ہیں۔

غ ق: کہا جاتا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور اربنائزیشن نے کتاب کلچر کو ختم کر دیا ہے، کیا عام قاری کو کتاب کی طرف واپس لانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے؟

خ ع: دیکھیے میں سمجھتا ہوں کہ کتاب کلچر کبھی ختم نہیں ہوگا، فی الحال ایسا لگ رہا ہے۔ ہر زبان کی ریڈرشپ بڑھ رہی ہے۔ البتہ اتنی نہیں بڑھ رہی ہے جتنی آبادی کے اعتبار سے بڑھنی چاہیے۔ مگر اس ٹیکنالوجی کے با وجود بھی ہم کتابیں تو پڑھ ہی رہے ہیں، البتہ ان کی اشاعت اتنی تعداد میں نہیں ہو رہی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی، اے آئی (Artificial Intelligence) اور سوشل میڈیا کے دور میں امریکہ میں رسائل کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ حد یہ ہے Designing, driving, cooking اور مے نوشی پر رسائل شائع ہو رہے ہیں اور فروغ بھی پا رہے ہیں۔ انگریزی اور ہندی کے بہت سے رسائل ہمارے پاس آتے تھے مگر اب نہیں آ رہے ہیں کیونکہ وہ ساری اطلاعات جو ہمیں ایک مہینے بعد ملیں گی، وہ آج ہی انٹرنیٹ کے ذریعے فوراً مل جاتی ہیں۔

جہاں تک کتابوں کا معاملہ ہے تو اس کی ریڈر شپ کم ہو سکتی ہے مگر ختم نہیں ہوگی، یہ میرا خیال ہے۔ ضرورت تو ہمیشہ رہے گی کیونکہ کتابوں سے چیزیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ بہت ساری جگہوں پر اس کی موت کا اعلان ہو چکا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ کتابیں ضرور باقی رہیں گی۔

غ ق: اردو میں اس وقت لکھے جا رہے ادب کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

خ ع: دیکھیے ہندوستان میں ابھی جو ادب لکھا جا رہا ہے، اس سے میں کافی حد تک مایوس ہوں، نئی تخلیقی توانائی مجھے نظر نہیں آتی ہے۔ نہ شاعری میں اور نہ فکشن میں، میرے پاس روزانہ ڈاک سے کم از کم ایک کتاب آتی ہے۔ زیادہ تر شاعری کی کتابیں ہوتی ہیں لیکن ابھی تک تو کوئی نئی آواز نہیں آئی ہے۔ اس کا پیمانہ میں یہ بناتا ہوں جو کہ بہت ادبی پیمانہ نہیں ہے، عوامی پیمانہ ہے کہ ایک کتاب پڑھی شاعری کی آپ نے، تو آپ فوراً چاہیں گے کہ اس کے بارے میں بات ہو۔ آپ نے کوئی شعر اچھا یاد کیا تو آپ مجھے شعر سنائیں گے، وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ پچھلے دس سال سے میں نے کوئی اچھا شعر نہیں سنا ہندوستانی شاعروں کا۔ سرحد کے پار بہت تخلیقی کام ہو رہا ہے، نئے نئے لوگ بھی آ رہے ہیں اور سارا تنقیدی کام ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ اچھی تنقید بھی ہمارے یہاں ہو رہی ہے۔

آزادی سے پہلے اردو کا جو مرکز تھا وہ نہ دہلی تھا نہ لکھنؤ تھا نہ حیدرآباد تھا بلکہ لاہور تھا۔ لاہور بڑا مرکز تھا رسائل کا، ادبی سرگرمیوں کا، محاذ آرائی کا، معرکہ آرائی کا، تقسیم کے بعد بہت زیادہ اثر پڑا، اردو کے مراکز تبدیل ہو گئے۔

غ ق: جامعات میں اردو درس و تدریس کی صورت حال کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

خ ع: اگر ہم صرف اساتذہ کو دیکھیں، تو ہمارے زمانے میں شمیم حنفی صاحب تھے، ذاکر صاحب تھے، عنوان چشتی صاحب تھے، پروفیسر قمر رئیس صاحب تھے، تنویر احمد علوی صاحب اور شریف صاحب تھے، یہ لوگ اسٹال وارتھ تھے۔ ان لوگوں کا جو میدان تھا وہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا میدان ہے ان کا، ہر چیز کے متعلق اس قدر معلومات ہوتی تھیں، تنویر صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا کہ Persian, Arabic, History teacher in the department of Urdu۔ ان سے کوئی بھی سوال کیا جاتا فارسی، اردو، عربی اور تاریخ کا، تو وہ اس طرح جواب دیتے تھے کہ جیسے ابھی پڑھ کر آئے ہیں۔ عنوان چشتی صاحب کو دیکھیں، وہ عروض کے ماہر تھے، شمیم حنفی صاحب ماڈرن لٹریچر، ہندی میں بھی لکھتے تھے، انگریزی میں بھی لکھتے تھے اور اردو میں بھی لکھتے تھے۔ پروفیسر ذاکر صاحب جامعہ میں تھے۔ پروفیسر محمد حسن صاحب جے این یو میں تھے۔ تو ہمارے یہاں بہت سارے ایسے لوگ تھے جن کے علم کی قدر دوسرے شعبے کے لوگ بھی کرتے تھے، اب ایسے لوگ ناپید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب ہم جیسے لوگ آ رہے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس سے اثر پڑا ہے۔ اچھا پھر یونیورسٹیز ہی سب کچھ نہیں ہیں۔ اس کے باہر بھی بہت ایسے لوگ ہوتے تھے جیسے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، خلیق انجم صاحب، نثار فاروقی صاحب تھے، یہ سب بڑے عالم تھے۔ ان لوگوں نے نمایاں اور قابل قدر کام انجام دیے، جواب ہمیں نظر نہیں آتے۔ میں بار بار دیکھتا ہوں کہ ایک طرف وہ لوگ تھے، ایک طرف ہم لوگ ہیں اور اب نئے لوگ آ رہے ہیں تو اس میں زینہ جو ہے وہ نیچے ہی کی طرف جاتا نظر آ رہا ہے۔ اس میں ایسا نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ وہاں دس تھے تو یہاں ایک بھی آدمی اس معیار کا آ جائے تو کافی تسلی ہو، جو نہیں ہے۔ میر کا شعر ہے۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہو سکتا ہے نئے زمانے میں نئے لوگ آئیں، آپ لوگ آئیں تو ان سے بھی زیادہ آگے جائیں۔ خدا کرے ان سے بھی زیادہ کام کریں، تو بہت زیادہ مایوسی کی بات نہیں ہے مگر فی الحال جو تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی میدان میں صورت حال ہے وہ زیادہ حوصلہ افزا بھی نہیں ہے۔

غ ق: فکشن، شاعری یا تنقید میں کچھ ایسے نئے نام جن سے مستقبل میں بہتر امید کی جا سکتی ہو؟

خ ع: اس طرح کی پیش گوئی تو میں نہیں کر سکتا لیکن میں پر امید بہت ہوں۔ دیکھیے، اردو کے جو مراکز ہیں، وہ بدلتے رہتے ہیں۔ آزادی سے پہلے اردو کا جو مرکز تھا وہ نہ دہلی تھا نہ لکھنؤ تھا نہ حیدرآباد تھا بلکہ لاہور تھا۔ لاہور بڑا مرکز تھا رسائل کا، ادبی سرگرمیوں کا، محاذ آرائی کا، معرکہ آرائی کا، تقسیم کے بعد بہت زیادہ اثر پڑا، اردو کے مراکز تبدیل ہو گئے۔ سرحد کے اس پار جو ہو رہا ہے اس پر تو میں بات نہیں کرنا چاہتا اور وہاں کے رسائل اور کتابوں سے مکمل طور پر واقف بھی نہیں ہوں، ہمارے یہاں بھی جو جنوبی علاقہ ہے مثلاً کرناٹک، مہاراشٹر وغیرہ وہاں ایسے ایسے مدرسے اور اسکول ہیں، جن میں آٹھ آٹھ ہزار بچے اردو میڈیم میں پڑھتے ہیں۔ تو ظاہر ہے اتنی تعداد میں جب پڑھ کر نکلیں گے تو ان میں کچھ تخلیق کار، کچھ شاعر اور نقاد بھی ہوں گے، یہاں ماحول ابھی ہلکا ہے مگر مجھے امید ہے کہ کچھ بہتر ہوگا۔

■

Ghulam Qadeer
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.:8802164185
880glm@gmail.com

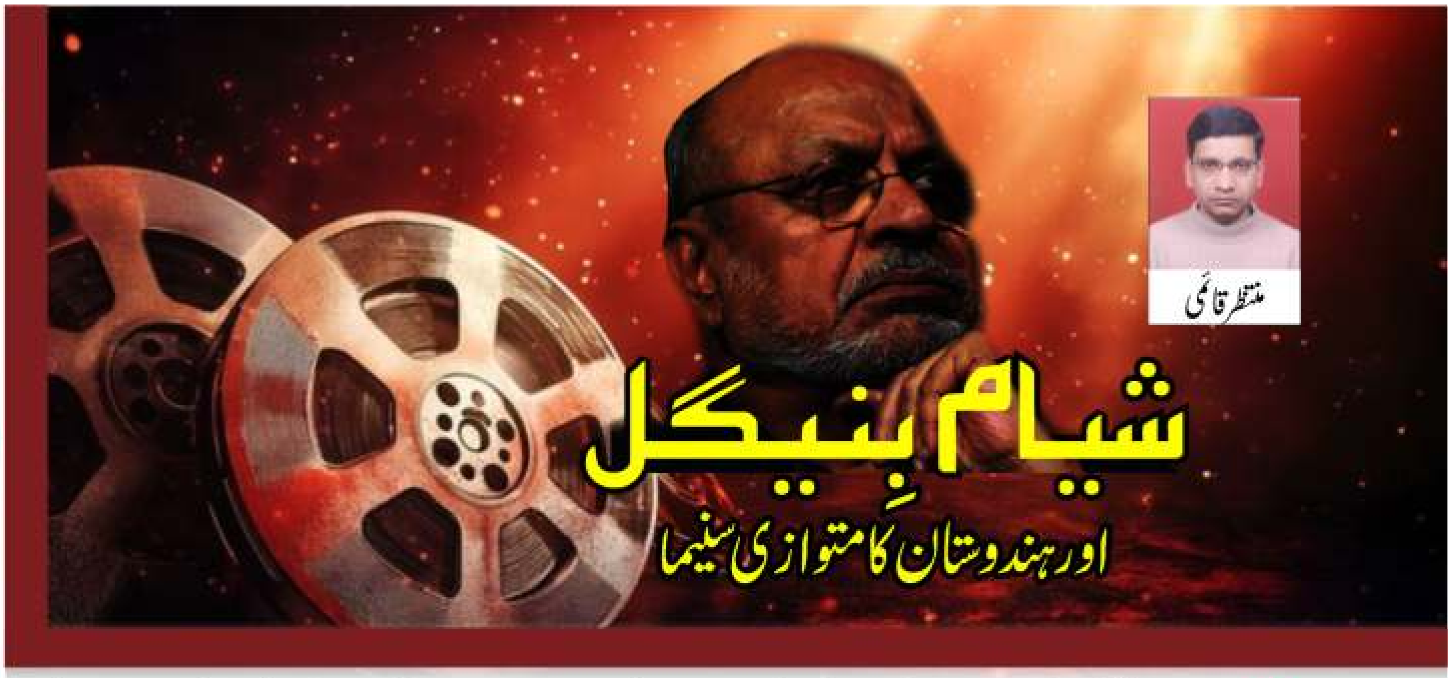

منتظر قائمی

شیام بینگل

اور ہندوستان کا متوازی سینما

شیام سندر بینگل کو ان کے مداح شیام بابو کے نام سے بلاتے ہیں جنھیں متوازی سینما (Parallel Cinema) کے پیش رو کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ نیا سینما یا متوازی سینما جس کا سرچشمہ یا گنگوتری بنگال کی سرزمین ہے جہاں سینما محض ایک فن یا آرٹ کے دائرے سے باہر نکل کر سماجی اقدار اور سماجی سروکار کو اپنے یہاں جگہ دینے لگا۔ بنگال میں ستیہ جیت رے جس وقت سینما سازی میں مصروف تھے ان کے ہمراہ مرنال سین، رتوِک گھٹک، ول رائے اور تپن سنہا جیسے ہدایت کار اور فنکار بھی اسی جانب اپنے اپنے قدم بڑھا رہے تھے۔ ان فلم سازوں نے اپنی فلموں میں انسانی اقدار کو بڑی اہمیت دی۔ متوازی سینما فرانس کے نیو ویو سینما (New wave Cinema) یا اٹلی کے نیو ریلزم (New Realism) کے جیسا حقیقت پسندانہ رنگ و آہنگ رکھتا ہے۔ سینما کے متعلق بھارت رتن اور آسکر ایوارڈ یافتہ ہدایتکار ستیہ جیت رے کا خیال ان کے ہم عصر فلم سازوں سے قدرے مختلف تھا۔ ان کی فلم سازی کا نظریہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ سینما کو دولت اور شہرت کی نگاہ سے نہیں بلکہ زندگی کی تلخ حقیقتوں، محرومیوں، ناکامیوں اور جدو جہد کی نگاہ سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ستیہ جیت رے کو اگر متوازی فلموں کا بنیاد گزار شمار کر لیں تو اس کی آخری کڑی شیام بینگل ہیں۔ ستیہ جیت رے اسکول کے پروردہ شیام بینگل کا جنم ویسے تو دکنی ریاست حیدرآباد میں 14 دسمبر 1934 کو ہوا لیکن ان کی فلم سازی کے شوق اور جنون نے انھیں حیدرآباد سے نکال کر بمبئی کی چمکتی دمکتی فلم نگری میں لا کھڑا کیا۔ وہ ایک خود ساز فنکار تھے جنھوں نے ہدایت کاری یا فنکاری کے لیے کسی اسکول یا ادارے کا رخ نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنی نظر اور نظریے کو اپنا رہنما یا استاد بنایا۔ جس طرح ستیہ جیت رے کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ان کے دماغ میں کسی بھی فلم کا ایک ایک منظر، کردار، لوکیشن، کاسٹیوم، سیٹ وغیرہ سب روشن رہتا تھا اور فلم سازی سے قبل کافی ہوم ورک کر کے تب میدان میں اترتے تھے اسی طرح شیام بابو بھی فلم سازی سے قبل کی تمام باریکیوں پر بہت قریبی نگاہ رکھتے تھے۔ اس قسم کے لوگ فقط اکہری صلاحیت یا فن کے ماہر نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ متعدد فنون کے پارکھ اور گوں ناگوں صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ سینما یوں بھی متعدد فنون کا مجموعہ کہلاتا ہے جس میں فوٹوگرافی، ویڈیوگرافی، موسیقی، مصوری، پینٹنگ، اسکرپٹ، اسکرین پلے، کاسٹیوم ڈیزائننگ، سیٹ ڈیزائننگ اور اداکاری جیسے فنون شامل ہیں۔ ان تمام فنون کو بڑی ہی باریکی سے ایک دھاگے میں پروتے ہوئے اسے جانچنا اور پرکھنا ہوتا ہے کہ سین اور سیٹ کے لحاظ سے کیا مناسب ہے اور کیا غیر مناسب۔

اپنی فلمی زندگی کی ابتدا انھوں نے اپنے والد کی فوٹوگرافی کی دوکان سے کی جس میں شیام کو بہت دلچسپی تھی۔ فوٹوگرافی بھی ایک آرٹ ہے جس میں کیمرے کے ذریعہ انسان، اشیا، چرند پرند کو کسی ایک خاص لمحے میں کیپچر (Capture) کرتا ہے۔ مثلاً انسان کے موڈ جیسے خاموشی، ہنسی، درد، بے قراری جیسی کیفیات کو کیمرے کے ذریعہ گرفت میں لینا ہوتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کرنے کے باوجود شیام بینگل کی دلچسپیوں نے اپنی منزل کا تعین کر لیا تھا کہ آگے انھیں کیا کرنا ہے۔ شیام بینگل اور مشہور ہدایت کار فنکار گرودت خالہ زاد بھائی تھے یعنی شیام بابو کی ماں اور گرودت کی ماں دونوں سگی بہنیں ہیں۔ اکثر گرمیوں کی چھٹیوں میں گرودت حیدرآباد آتے تھے تو ان سے فلمی دنیا کی باتیں سن سن کر شیام کے من میں بھی فلم سازی کا بھوت سوار ہو گیا اور ایک دن وہ اپنے خواب کو تعبیر بنانے کے لیے ممبئی آ گئے۔

ممبئی میں شیام بینگل نے ابتدا میں چند ایک ایڈورٹائزنگ یا اشتہاری فلمیں بنائیں جس سے ان کے ہدایتکاری کے فن کو سنورنے کا موقع ملا۔ اسی دوران شیام کو پونے میں واقع فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا (Film and Television Institute of India, FTTI) میں درس و تدریس کا بھی موقع ملا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں متعدد اور مختلف شعبوں میں کام کرنے والے فنکاروں کی ایک نئی پود سے آشنائی اور روشناسی ہوئی۔ شیام بینگل نے پونے میں فلم انسٹی ٹیوٹ میں اس وقت زیر تربیت طلبا جن میں نصیر الدین شاہ، شبانہ اعظمی، اوم پوری، کلبھوشن کھربندہ، اسمتا پاٹل، دویا دتا اور امریش پوری جیسے اداکاروں کو لے کر ان پر خوب محنت کی، اپنی فلموں کی اسکرپٹ اور کہانیوں کے مطابق ان کی تراش خراش کی اور انھیں سنوارا۔

ترقی پسند تحریک اور متوازی سینما کی تحریک میں بڑی یکسانیت نظر آتی ہے۔ متوازی سینما کی اساس جن مرکزوں اور نقطوں پر قائم کی گئی تھی ایسا لگتا ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد میں ترقی پسندی کا خون پسینہ لگا ہے۔ ہمارے یہاں ترقی پسند تحریک کی ابتدا باضابطہ طور پر لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس سے ہوئی جو کہ 'رفاہ عام کلب' میں 1936 میں ہوئی۔ جس

میں اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی اور اس کے منشور کو عیاں کیا گیا اور ادب کے مستقبل کی سمت و رفتار معین کر دی گئی۔ اس تحریک کے ایام شباب میں ہی بنگال میں نیو ویو سنیما یا متوازی سنیما کے لیے زمین ہموار کی جارہی تھی تا کہ سنہرے رنگ برنگے خوابوں اور دلکش خیالوں والے مین اسٹریم سنیما میں سماجی موضوعات پر بھی کم بجٹ میں سنیما سازی ہو سکے۔ ترقی میں حاشیے پر پہنچے عوام کے روزمرہ کے بنیادی مسائل پر بھی کیمرے کی نظر جائے اس لیے پچاس کی دہائی میں اس نظریے کے ہدایتکاروں نے سماجی سروکار پر مبنی فلمیں بنانا شروع کر دی۔ ہماری مین اسٹریم فلمیں جن کو عرف عام میں کمرشیل سنیما کہتے ہیں ان میں میلو ڈراما اور چکا چوند بہت ہوتی ہے اس کے میلوڈرامائی ذائقے کو بدلا گیا اور چمک دمک کو مدھم کیا گیا تا کہ وہ چہرے اور وہ حقیقتیں بھی نظر آنے لگیں جن کو ہمارے مین اسٹریم سنیما نے اپنی سنیمائی چکا چوندھ کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ یہاں ہر ایک شے کو اس کی حقیقت سے دور جا کر اس شے کو دلکش، جاندار، شاندار اور سحر آفریں بنا کر پیش کیا جاتا ہے خواہ وہ سیٹ ڈیزائن، اسٹوڈیو، انڈور لوکیشن، آؤٹ ڈور لوکیشن اور کاسٹیوم غرض کہ ہر ایک شے کے جمالیاتی پہلو کو خوب اجاگر کیا جاتا ہے۔ کہانیوں میں بھی مرکزی کردار کو اکثر زندگی سے بڑا بنا کر پیش کیا جاتا ہے یعنی انسان ایسی فلموں کو دیکھ کر اپنی زندگی کی تلخیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کو بھلا کر کچھ دیر ہی سہی خواب و خیال کی وادیوں میں کھو جاتا ہے جسے فنطاسی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑے بجٹ کی فلمیں ہوتی ہیں جن کا اپنا تجارتی اور کاروباری رجحان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس متوازی سنیما یا الٹرنیٹیو سنیما میں ہر ایک شے کو اس کے حقیقی پس منظر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے حد یہ ہے یہاں فلموں کے کردار بھی کھردرے، بے رنگ و بے کیف نظر آتے ہیں ورنہ سنیما میں تو فقط حسین و جمیل اور روشن چہروں کی ہی گنجائش ہوتی ہے کیونکہ فلم کے جمالیاتی پہلو کو ہر جگہ برقرار رکھا جاتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں جب ستیہ جیت رے نے پہلی فلم 'پاتھیر پنچالی' (راہ کا نغمہ) بنائی جس کا موضوع بنگال کے غربت زدہ ایک کنبے کی کہانی ہے جو نہایت ہی کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے فلم میں اپو اور اس کی بہن درگا اپنے غربت زدہ شب و روز کو کسی طرح گزر بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالات اس وقت تبدیل ہوتے ہیں جب ان کا باپ ہریہر نوکری کرنے کے لیے شہر جاتا ہے۔ اس فلم کو متوازی سنیما کی بنیاد کا پتھر تسلیم کیا جاتا ہے فلم کو نیشنل ایوارڈ ملا اور ستیہ جیت رے کو بعد میں ریلسٹک سنیما میں تعاون کی وجہ سے سنیما کا سب سے بڑا اعزاز 'آسکر ایوارڈ' ملا۔ وہ پہلے ایسے ہدایت کار ہیں جن کو حقیقت پسندانہ فلموں کے لیے سنیما کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا گیا۔ فلمی ناقدین کا کہنا ہے کہ ستیہ جیت رے نے ہندوستان کی غربت اور بدحالی کو دنیا کو دکھایا ہے جس کی وجہ سے ان کے حصے میں بہت سے انٹرنیشنل ایوارڈ آئے ہیں حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ بہت سارے ایسے قلم کار بھی اس الزام سے بچ نہیں پائیں گے جن کی کہانیوں اور ناولوں میں غربت، بدحالی، فاقہ کشی کی تصویر نظر آتی ہے تو کیا کہانی کار ان حقائق سے منھ موڑ لے اور صرف اور صرف ہماری آنکھوں کے سامنے خوبصورت مناظر ہی پیش کرے۔

وِمل رائے نے اس سے پیش تر 1954 میں 'دو بیگھہ زمین' بنائی جو کہ ایک غریب حال کسان شمبھو مہتو کی کہانی ہے جو اپنی دو بیگھہ زمین بچانے کے لیے اسی طرح جدوجہد کرتا ہے جیسے پریم چند کے ناول 'گئو دان' کے مرکزی کردار ہوری اپنے دو بیلوں کو بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ ہوری ایک گائے کا سپنا دیکھتا ہے لیکن قرض، غربت، تنگ حالی و تنگ دستی نیز مہاجنی نظام اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔ ہندوستان کی دیہی زندگی، زمیندارانہ اور مہاجنی نظام اور سماجی ناانصافی کی ایک جیتی جاگتی تصویر گئو دان میں نظر آتی ہے۔ شمبھو کی زندگی اس وقت اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے جب اس کی زمین پر ایک زمیندار قابض ہو جاتا ہے۔ فلم میں شمبھو کے کردار کو اپنے زمانے کے مشہور اداکار بلراج ساہنی نے ادا کیا جب کہ اس کی بیوی پارو کا کردار اپنے زمانے کی مشہور اداکارہ نروپما رائے نے ادا کیا۔ یہ فلم بھی ستیہ جیت کی فلم کے مانند لیبر مائیگریشن یعنی مزدوروں کی ہجرت کے کرب کو بیان کرتی ہے۔

جس وقت شیام بینگل سن شعور کو پہنچ رہے تھے اس وقت تلنگانہ میں کسان اور مزدور تحریک اپنے شباب پر تھی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ملک کے کاشت کاروں کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا مشاہدہ کیا اور ان کی آواز بننے کی کوشش کی۔ ان کسانوں کی زبوں حالی جو کہ زمیندارانہ نظام کے مارے ہوئے تھے اس نظام کی خامیوں اور کمیوں کو اجاگر کیا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان آزادی کے بعد کافی بدل چکا ہے لیکن کسان، مزدور اور محنت کش طبقے کے حالات نہیں بدلے۔ ہمارا سماج ذات پات، چھوا چھوت، اونچ نیچ، بے جا رسم و رواج، توہم پرستی کی زنجیروں سے ابھی تک آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ شیام بینگل ایک ایسے سماج کی آواز بننا چاہتے تھے جس کی آواز اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں 1973 میں انھوں نے اپنے کیرئر کی پہلی فلم 'انکر بنائی' جس کے معنی بیج سے پھوٹی ہوئی شاخ کے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ شیام بابو ایک ایسے فلم ساز ہیں جنھوں نے فلم کی تعبیر و تشریح ہی بدل ڈالی۔ ستیہ جیت رے، راج کپور اور گرودت کے بعد وہ ایک ایسے فلم ساز ہیں جنھوں نے اپنی شرطوں پر فلم بنائی، اپنی کہانی بنائی اور من پسند موضوعات کا انتخاب کیا۔ 'انکر' کی کہانی اور اسکرپٹ انھوں نے خود تیار کی اور اس کو اپنے انداز میں ناظرین کے سامنے پیش کیا۔

دنیا بھر کا تمام ادب اور فنون لطیفہ ہمیشہ اداروں، تحریکوں اور رجحانوں کے پرچم تلے پروان چڑھتا ہے جو فن پاروں کو پرکیف، پرلطیف، پرشعور اور روح پرور بناتے ہیں۔ تحریکیں اور رجحانات ہم عصر سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی، قومی، بین الاقوامی اور عالمی پیمانے پر رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے فیضان اور سبق حاصل کرتے ہیں اور اپنی بقا کے ساتھ ساتھ ترقی کا سفر جاری رکھتے ہیں۔ فرانس کا نشاۃ الثانیہ، فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، علی گڑھ تحریک سے لے کر ترقی پسند تحریک اور جدیدیت تک کا ہمارا ادبی سفر بڑا ہی دلچسپ اور روح پرور رہا ہے۔ ان سب کی رہنمائی اور مشعل برداری میں ہمارے ادب کا کارواں آگے بڑھتا رہا ہے۔ کچھ تحریکیں یا رجحانات کے اثرات فقط ادب تک ہی محدود رہے ہیں اور کچھ تحریکوں نے ادب کے ساتھ ساتھ ذریعۂ اظہار کے دیگر میڈیم یا فنون لطیفہ کی دیگر اقسام پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ ان میں سب سے منظم، توانا اور شعوری تحریک ترقی پسند تحریک رہی ہے جس نے نہ صرف یہ کہ ہمارے ادب کے سوچنے اور سمجھنے کی پرانی روش کو تبدیل کر ڈالا بلکہ اس تحریک کے اثرات سے فن کے دیگر شعبے جیسے ڈرامہ، تھیٹر، مصوری، پینٹنگ اور سنیما

پر بھی رونما ہوئے۔ ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد اور اس کے منشور کو مرکزی نقطہ بناتے ہوئے ہمارے ادبا اور شعرا نے ادب کے مزاج اور ذائقہ کو بدلا۔ اس طرح ادب محض ایک تفریح طبع کا سامان نہ ہو کر اس سے اور بھی کام اور پیغام لینے کی وکالت کی گئی۔ ادب جو ابھی تک درباروں، رنگ برنگی محفلوں، خانقاہوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور فرمارواؤں کے قصیدے پڑھنے کا عادی تھا اسے عام انسانی زندگی کی حقیقتوں، تلخیوں، ناکامیوں، محرومیوں، مجبوریوں، بغاوتوں اور انقلابوں سے روشناس کرایا گیا۔ ترقی پسند تحریک واحد ایسی تحریک رہی ہے جس نے بہ یک وقت نہ صرف یہ کہ ادب کی دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا بلکہ ہندی، انگریزی، تمل تیلگو، گجراتی، مراٹھی، بنگالی اور پنجابی سمیت دیگر زبانوں میں بھی اس کے اثرات شعوری طور پر دیکھے گئے۔ ان تمام زبانوں کے ادبا و شعرا نے اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو ادب میں اس طرح ڈھالا کہ ادب کی دنیا میں جو ایک جماد اور ٹھہراؤ کی کیفیت طاری تھی اس میں تازگی، ندرت اور شگفتگی کا احساس ہونے لگا۔ ڈرامے اور تھیئٹر کے متعلق بات کریں تو تحریک کے پرچم تلے حبیب تنویر، بھیشم ساہنی، بلراج ساہنی جیسے فنکاروں نے اس تجربے کو عام کیا وہیں پینٹنگ کے شعبے میں مقبول فدا حسین، ایف این ڈسوزا، جتن داس و دیگر نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔

سنیما میں بھی اس تحریک کے بھرپور اثرات مل جاتے ہیں۔ سنیمائی اداکاروں، قلم کاروں، کہانی کاروں، ہدایت کاروں اور دیگر فن کاروں کی پوری جماعت اس تحریک کے ذریعہ فلم کی کہانی، موسیقی اور نغمگی کی دنیا میں انقلاب برپا کر رہی تھی۔ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، اختر الایمان، راہی معصوم رضا، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر وغیرہ نے اپنی اپنی مہارت کے شعبوں میں اس تحریک کی آبیاری کی۔ اس سے قبل ہمارا مین اسٹریم سنیما اس قسم کی لذتوں اور ذائقوں سے ناآشنا تھا۔ جس وقت ہندوستان کی آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی ایسے میں بنگال جو کہ ادب، آرٹ، کلچر، ڈرامہ، سنیما اور فنون لطیفہ کا گہوارہ تھا وہ بھی سیاسی، سماجی اور شعوری طور پر متعدد تحریکوں سے دوچار تھا۔ جس وقت ہندوستان کا ایک نئے میڈیم یعنی سنیما کے سحر میں کھویا ہوا تھا اس وقت بنگالی فن کاروں نے اس طاقتور اور عمومی ذریعہ اظہار سے کچھ اور کام لینے کی ٹھان لی اور نیا تجربہ کرنے کا من بنا لیا۔ سیاسی اور سماجی انتشار نے بنگال کو مزید پسماندگی کی جانب ڈھکیل دیا۔ یہاں ایک بات جس کی جانب اشارہ بہت ضروری ہے کہ متوازی سنیما یا نیو ویو سنیما کا مطلب قطعی ایسا نہیں ہے کہ یہاں فقط اور فقط سنجیدہ اور غور و فکر کرنے والے مسائل ہی اٹھائے جاتے ہیں اور ان میں تفریح یا انبساط کا کوئی پہلو ہی نہیں ہوتا ہے کوئی گیت، سنگیت، سر تال، لے یا موسیقی جیسی کوئی روح پرور شے کا یہاں گزر نہیں ہوتا ہے بلکہ ایسی فلموں میں اصلیت یا اور تخیلیتی پر بہت زور دیا جاتا ہے اور یہ لو بجٹ کی فلمیں کہلاتی ہیں جن میں سرکاری و غیر سرکاری ادارے اور افراد پیسے لگاتے ہیں جس کا مقصد کامرشیل نہیں ہوتا ہے۔ ایسی فلموں میں شوٹنگ کے دوران برسات، بادل، پانی، ہوا، آندھی طوفان، چرند پرند کی متعدد آوازیں سب کو حتی الامکان ان کی اصلی شکل و صورت اور صوت میں کیمرے میں قید کرنا ہوتا ہے۔ کرداروں کے میک اپ، سیٹ کی خوبصورت ڈیزائننگ، دلفریب لوکیشن اور ڈریس اور پہناوے پر اتنی زیادہ جمالیاتی توجہ نہیں دی جاتی ہے جتنا کہ مین اسٹریم فلموں میں دی جاتی ہے۔ اپنی فلم سازی کے متعلق ایک سوال کے جواب میں متوازی سنیما کی تعریف شیام بینگل نے ناقدین کی آرا سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے انداز فکر کی وضاحت یوں کی ہے:

’’پیرلل (Parallel Cinema) سنیما کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مین اسٹریم سنیما سے ہی نہیں اور ایسی فلموں میں کوئی تفریح نہیں ہو سکتی ہے لیکن میں ایسا نہیں مانتا ہوں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ اسے Alternate Cinema کہہ کر پکاریں۔ یعنی مین اسٹریم سنیما کا ایک متبادل۔‘‘

اس قسم کی فلموں کی پروڈکشن کاسٹ یا لاگت مین اسٹریم فلموں کے مقابلے کم ہوتی ہے۔ ہماری حکومت نے سنیما کے معیاری اور امتیازی مقاصد کو نظر میں رکھتے ہوئے 1975 میں نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا قیام کیا تا کہ ہندوستانی سنیما کے معیار کو عالمی پیمانے پر پہچان دلائی جا سکے۔ اس مقصد کے تحت اس نے فلم میں مالی تعاون، پروڈکشن اور ڈسٹری بیوشن کو وزارت اطلاعات و نشریات کے تحت منظم کیا۔ حکومت کے اس اقدام کے سبب وہ لوگ بھی فلمیں بنانے لگے جو برسوں سے فلم سازی کے خواب سجائے ہوئے تھے کیونکہ مین اسٹریم سنیما میں فقط چند ہی لوگوں کی اجارہ داری ہے یعنی وہی ڈسٹری بیوٹر، فائنسر اور ڈائریکٹر و ایکٹر کا گروہ۔ اب ایسے میں سنیما سازی میں نئے قدم رکھنے والوں کے لیے کوئی جگہ کوئی مقام رہ ہی نہیں جاتا ہے۔ حکومت کا مقصد کسی بھی شعبہ میں کام کرنے والے خواہش مند کے لیے ایسے مواقع مہیا کرانا ہے تا کہ کسی بھی بیک گراؤنڈ کا آدمی یہاں اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکے۔

شیام بینگل کی پہلی فلم ’انکر‘ 1973 میں ریلیز ہوئی ایک ایسی فلم ہے جو پچاس کی دہائی میں آندھرا پردیس میں واقع ہوئی ایک حقیقی کہانی پر مبنی ہے۔ کہانی ایک زمیندار بیٹے اور ایک دلت خاتون کے درمیان عشق، محبت، ہوس، ذات پات اور جدوجہد کی کہانی ہے جس میں دلتوں کا استحصال، شراب خوری، ذات پات کی لعنت جیسے معاملوں سے اس فلم کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ دلت اور شادی شدہ عورت ’لکشمی‘ کا رول شبانہ اعظمی نے کیا ہے جب کہ اننت ناگ نے ’سوریا‘ نامی زمیندار بیٹے کا رول ادا کیا ہے اور سادھو مہر نے لکشمی کے گونگے بہرے شوہر کا رول ادا کیا ہے۔ شیام بینگل، شبانہ اعظمی اور اننت ناگ تینوں کی ہی یہ پہلی فیچر فلم ہے۔ ہندوستانی آرٹ فلموں کے متوازی سنیما تحریک کے ابتدائی نقش والی یہ ایک فلم جس کو عوام نے بھی پسند کیا۔ فلم تین کو نیشنل فلم انعامات سے نوازا گیا۔ اور اس فلم میں شبانہ اعظمی کو بیسٹ ایکٹر کا نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک سمیت 43 انعامات سے نوازا گیا۔

1976 میں بنی ’منتھن‘، فلم ہندوستان میں سفید انقلاب یعنی دودھ پروڈکشن کے انقلاب اور سہکاریتا آندولن یعنی آپسی تعاون کی تحریک سے بنی پہلی کراؤڈ فنڈیڈ یعنی عوامی تعاون سے بننے والی فلم ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ دنیا کی پہلی ایسی فلم ہے جس میں گجرات کے پانچ لاکھ کسانوں نے محض دو۔ دو روپے کا تعاون دے کر فنڈ جمع کیا اور اس فنڈ سے یہ فلم تیار کی گئی۔ یہ فلم سفید انقلاب کے بانی کورین ورگیز کے مشن پر مبنی ہے۔ جیسا کہ اس کا موضوع ڈیری کوآپریشن کی تحریک ہے جس میں دودھ اور اس سے بننے والی اشیا کا منافع سیدھے کسی کمپنی کو نہ مل کر کوآپریٹیو سوسائٹی کے ذریعہ بڑھایا جاتا ہے تا کہ اس کا براہ راست فائدہ

کسانوں اور مویشی پالنے والوں کو مل سکے لہٰذا کراؤڈ فنڈ بھی ایک قسم کا تعاون ہے۔ اس کہانی میں دودھ بیچنے والے کسانوں کے درمیان ایک آدرش وادی ویٹری ڈاکٹر راؤ (گریش کرناڈ) کے ذریعہ گاؤں میں ایک سہکاری سمیتی قائم کرنے کی جد جہد کو دکھایا گیا ہے یہاں پہلے روایتی انداز میں دودھ کی تجارت ہوتی تھی اور اس منافع کا ایک بہت بڑا حصہ زمیندار مشرا جی (امریش پوری) کی تجوری میں جاتا تھا۔ گجرات کے اس گاؤں میں ذات پات کا بھی بڑا دبدبہ تھا اور دودھ بیچنے والوں میں بندو (اسمتا پاٹل) اور بھولا (نصیرالدین شاہ) بھی شامل ہیں جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ فلم ایک ساتھ کئی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جن میں سے ایک دیہی علاقوں میں انسانی صحت کی دیکھ بھال کے لیے انسانوں کے ڈاکٹر موجود نہیں ہیں لیکن ایک واقعہ میں ڈاکٹر راؤ کے یہ کہنے کے باوجود کہ وہ بچوں کا ڈاکٹر ہے وہ اسی سے علاج کرنے کو مجبور ہیں۔ ڈاکٹر اپنے تھوڑے بہت تجربے کا استعمال کرتا ہے پھر لوگ جانوروں کے بجائے انسانوں کے علاج کے لیے اس کے پاس آنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر راؤ کہتے ہیں کہ اس علاقے میں تو پرائمری ہیلتھ سینٹر تک نہیں ہے۔ اس فلم نے بھی بہترین فلم کا نیشنل فلم ایوارڈ جیتا اس کے علاوہ شیام بابو کی یہ فلم اکادمی ایوارڈ میں شرکت کرنے کے لیے ہندوستان کی آفیشیل فلم بنی۔ اس کا ایک گیت آج بھی امول دودھ کمپنی اپنے اشتہاروں میں استعمال کرتی ہے۔

اس کے بعد شیام بابو نے ایک اور سماجی تانے بانے کو بکھیرنے والی کہانی پر فلم بنائی جس کا نام 'نشانت' ہے یہ بھی ہندوستان مین ایمرجنسی کے دنوں کی ہے مگر اس کے موضوعات دیگر ہیں۔ فلم میں ایک ایسے سماجی نظام کو دکھایا گیا ہے جس میں انصاف، اخلاقیات اور تعظیم کا فقدان ہے۔ اس نظام میں زمیندار اور حکمراں طبقہ اپنے سے کمتر طبقے کے لوگوں کا مالی، جسمانی اور ذہنی استحصال کرتا ہے۔ یہاں چار زمیندار بھائیوں سے پورا علاقہ پریشان ہے وہ کسی کی زمین پر قبضہ کر لیتے ہیں تو کسی کی عورت کو اس کے گھر سے اغوا کر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ گاؤں کے ایک استاد کی بیوی کا ہی یہ لوگ اغوا کر لیتے ہیں تبھی پورا گاؤں ان کا مخالف ہو جاتا ہے۔

1977 میں شیام بینگل نے 'بھومیکا' نام سے فلم بنائی جو بنیادی طور سے مراٹھی اداکارہ ہنسا واڈکر کی سر گزشت پر مبنی ہے۔ یہ ایک باصلاحیت خاتون کی کہانی ہے جس نے اپنے دم پر اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کی ٹھانی جو خود کی تلاش مسلسل ہے۔ اس میں عورت کے معاشرے میں روایتی قسم کے بنے بنائے رول سے انحراف کی کہانی ہے۔ مراٹھی زبان میں ہنسا واڈکر کی خودنوشت 'سنگتے آیکا' میں وہ ایک ایسے کردار کے روپ میں سامنے آئی ہے جو پدرانہ برتری نظام والے معاشرے میں اپنے وجود، خودی، وقار کے لیے جدو جہد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس فلم کو بھی نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

1983 میں طوائف پر مبنی فلم 'منڈی' میں شیام بینگل نے ہمارے سماج کی اس حقیقت سے رو بہ رو کرایا ہے جہاں معاشرہ سماج کی استحصال شدہ عورتوں سے جنسی لذت اور عیش کوشی تو کشید کرتا ہے مگر اس کو بنیادی سہولیات سے محروم رکھتا ہے جس میں دوا، علاج، صحت اور مکان جیسی ضرورتیں شامل ہیں۔ اردو زبان کے مشہور افسانہ نگار غلام عباس کی کہانی 'آنندی' پر مبنی فلم ایک طوائف خانے سے متعلق ہے جس کو سیاسی لیڈر اپنے نجی فائدے کے لیے اسے خالی کروانا چاہتے ہیں۔ فلم بنیادی طور پر شہری ترقی اور توسیع، سماجی و معاشرتی نظام اور سیاست پر ایک طنز ہے جس کی جائے وقوع حیدرآباد کا ایک پرانا طوائف گھر ہے۔ فلم میں شبانہ اعظمی طوائفوں کی مالکن کا رول ادا کرتی ہیں اور اسمتا پاٹل، نصیرالدین شاہ، امریش پوری اور کل بھوشن کھربندا شامل ہیں۔ یہ فلم اپنے موضوع اور مسائل کے اعتبار سے ایک بہت ہی بولڈ فلم ہے جس میں سماج کے ٹھکرائے ہوئے طبقے کی عورتوں کی داخلی زندگی، جدو جہد اور تمناؤں کے ساتھ ساتھ سماج اور سیاست کے کھیل کو اجاگر کرتی ہے۔ شیام بینگل نے اس کے علاوہ مسلم معاشرے کے نچلے طبقے سے لے کر اشرافیہ طبقے تک کے گوں ناگوں مسائل پر 'ہری بھری'، ممو، سرداری بیگم، زبیدہ جیسی فلمیں بنائیں۔ ویلکم ٹو سجن پور اور ویل ڈن ابا جیسی فلمیں بنائیں جن میں دیہی زندگی کی بے طرح بیہ اور ہلکے پھلکے موضوع کی فلم ہے جس میں بے روزگاری، تعلیم کی کمی جیسے مسائل کے ارد گرد کہانی بنی گئی ہے۔ اس میں جمہوریت اور سرکاری کام کاج کے طور طریقوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جہاں ہر ایک قدم پر رشوت، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ ہیرو شریاس تالپڑے (مہادیو) ایک ناول نگار بننا چاہتا ہے لیکن وہ قاصد اور محرر بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ سجن پور کے لوگوں کے خطوط پڑھنے اور ان کے جواب لکھنے میں اپنا وقت صرف کرتا ہے اور اس کے بدلے ان سے لکھنے اور پڑھنے کی قیمت وصول کرتا ہے۔ یہ ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ رومانی فلم ہے۔

فلم 'ویل ڈن ابا' (2010) سرکار کی جانب سے چلائی جانے والی فلاحی اسکیموں اور منصوبوں میں بدعنوانی کو اجاگر کرتی ہے۔ اس میں ارمان علی (بومن ایرانی) اور رحمان علی (بومن ایرانی) کی غربت و تنگ دستی کی داستان ہے ارمان علی پونے میں ایک امیر زادے کی گاڑی چلاتا ہے اور عزت کی زندگی جیتا ہے اس کے برعکس رحمان علی اور اس کی بیوی دن رات مرغی چوری، پانی چوری اور ادھار مانگ مانگ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ارمان علی ایک فوٹوگرافر کی دوکان میں جاتا ہے جہاں فوٹو کھنچوانے کے دوران اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی سے جوجھ رہے گاؤں میں باولی کے لیے لون لے گا۔ فلم کی کہانی جیلانی بانو کی کہانی 'نرسیا کی باوڑی' پر مبنی ہے جس میں سرکار خط افلاس کے نیچے زندگی گزار رہے لوگوں کو ایک اسکیم کے تحت باولی کے لیے یک مشت ڈیڑھ لاکھ مہیا کراتی ہے لیکن تحصیل دار، پٹواری، سرپنچ اور کلرکوں کی ملی بھگت سے وہ رقم خورد برد ہو جاتی ہے اور ارمان علی کا پانی کا خواب سرکاری کرپشن کی نذر چڑھ جاتا ہے۔ لیکن ارمان علی بھی اس نظام سے لڑتا رہتا ہے جس میں اس کی بیٹی مسکان (منیشا لامبا) اس کے شانہ بہ شانہ کھڑی رہتی ہے اور لڑتی ہے۔ اسی کے ساتھ فلم میں دیگر مسائل جیسے کم عمر میں عورتوں کی شادی، لڑکیوں کی تعلیم ادھوری چھوٹ جانا جیسے مسائل بھی نظر آتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ ایک پوری طرح تفریحی فلم ہے۔

وہ اپنی روایت کے آخری فلم ساز ہیں جنھوں نے ہر قسم کی کہانیوں اور کرداروں کے ساتھ نئے نئے تجربے کیے جو میل کے پتھر ہیں۔ انھیں 2005 میں ہندوستانی سینما کا سب سے بڑا اعزاز 'داداصاحب پھالکے ایوارڈ' سے نوازا گیا۔

■

Dr. Muntazir Qaimi
Department (Urdu)
FAA Govt. PG College
Mahmudabad (Awadh)
Sitapur- (UP)
Mob.: 8127934734
muntazirqaimi@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

مرزا غالب: ایک سوانحی منظرنامہ

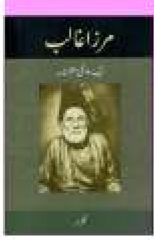

مصنف: گلزار

صفحات: 23+247، قیمت: 160 روپے،

سنہ اشاعت: دوسرا ایڈیشن: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: خوشتر زریں ملک، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مرزا غالب ایک سوانحی منظرنامہ گلزار کے قسط وار فلمی ڈرامے کی تحریری دستاویز ہے۔ غالب کی سوانح اور زندگی پر تحقیقی دنیا میں ایک مکتبہ وجود میں آچکا ہے۔ حالی، شیخ اکرام سے لے کر، کالی داس گپتا رضا، امتیاز الدین خان عرشی، مالک رام اور حنیف نقوی تک ایک طویل فہرست ہے۔ یہی حال غالب کے ناقدین وشارحین کا بھی ہے۔ لیکن گلزار کا یہ منظرنامہ ان تمام لوگوں سے مختلف ہے۔ یہ سوانحی منظرنامہ کئی اعتبار سے منفرد اور مختلف ہے۔ ایک تو یہ نری تحقیق پر مبنی نہیں ہے۔ یہ غالب کی زندگی کے معلوم گوشوں پر مبنی ضرور ہے لیکن اس میں ایک الگ میڈیم کے تقاضے بھی شامل ہیں جو جوں کے توں غالب پر موجود تحقیقی اور سوانحی مواد سے حاصل نہیں کیے جاسکتے تھے۔ انھیں لکھنے کے لیے تخلیق کار کا تخیل ناگزیر تھا۔ زیر تبصرہ سوانحی منظرنامے میں یہی تخیل کارفرما نظر آتا ہے۔ گلزار کے تخیل کی کارفرمائی ہمیں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ فرض کیجیے غالب اور ان کی بیگم کے درمیان نوک جھونک، بات چیت یا رائے مشورے کی کوئی سچویشن ہے تو یہ سچویشن ہمیں نہ تو غالب کے خطوط میں ملے گی اور نہ ہی ان پر لکھی گئی سوانحی کتابوں میں، ہاں اس حد تک رہنمائی مل سکتی ہے کہ وہاں سے کوئی اشارہ، کوئی واقعہ اور گفتگو کا کوئی طرز ہاتھ آجائے۔ تخیل اس کی مدد سے واقعے کو ایسے ترتیب دے کہ حقیقی معلوم ہو۔

ایسا نہیں ہے کہ غالب نے شاعری شروع کی ہو، آگرے سے دلی پہنچے ہوں اور انھیں فوراً مقبولیت مل گئی ہو۔ غالب نے اپنی تخلیقی شخصیت کو تسلیم کروانے کے لیے بہت جدوجہد کی اور آخر عمر میں کہیں جا کر انھیں لائق اعتنا جانا گیا اور وہ بھی خواص کے ایک طبقے میں۔ گلزار نے اس منظرنامے میں ایک جگہ ایسی سچویشن غالب کے جدوجہد کے دنوں کی بنائی ہے۔ غالب اور امراؤ بیگم کے درمیان ایک مکالمہ کروایا ہے۔ اس مکالمے سے گلزار کی تخلیقیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"میں کہتی ہوں آگرہ لوٹ چلیے دلی والے آپ کو یہاں مقبول نہیں ہونے دیں گے۔

غالب اٹھ کھڑے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور ٹہلتے ٹہلتے کہا:

ہندو مسلمان شیعہ سنی یہی بٹوارے کیا کم تھے کہ لوگوں نے دلی لکھنو اور آگرے کی دیواریں بھی کھڑی کرلیں۔ دنیا مجھے چھوٹی لگتی ہے بیگم..... یہ دنیا۔

غالب اچانک بیگم کے پیچھے کھڑے ہوگئے اور شعر کہا:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

بیگم نے مرزا کی طرف دیکھا مرزا نے وضاحت کی بازیچہ کھیلنے کا میدان کے بیگم چڑ گئیں۔

جی اور اطفال کے معنی بچے۔ بازیچہ اطفال یعنی چھوٹے چھوٹے بچوں کے کھیلنے کا میدان۔ اتنی اردو ہمیں بھی آتی ہے۔

مرزا مسکرائے اور ترنم میں شعر کہا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مرزا نے بیگم کے دوپٹے کے کونے میں گرہ لگادی۔

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک   اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

مرزا نے دوپٹے میں ایک اور گرہ لگائی اور پلنگ کے دوسرے پائے کے پاس آکر بیٹھ گئے۔"

درج بالا مثال ہمیں منظرنامہ نگار کی مشکلات سے آگاہ کرتی ہے۔ جب ہم ماضی کی کسی بڑی شخصیت کو ایک نئے میڈیم میں منتقل کرنا چاہتے ہیں تو سو طرح کی دشواریاں ہوتی ہیں۔ شخصیت کے بہت سے گوشے واضح نہیں ہوتے اور بہت سے گوشے اس عہد کی زبان سے ہی واضح ہوتے ہیں، جو ناظرین کے مذاق سے میل نہیں کھاتے۔ اگر صرف ناظرین کا خیال رکھا جائے تو شخصیت کے مسخ ہوجانے کا اندیشہ رہتا ہے اور اگر شخصیت

کوسامنے رکھا جائے تو عام ناظر کے پلے نہیں پڑتی، چنانچہ ایک منظرنامہ نگار اس پل صراط سے گزرتا اور ایسی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ نہ شخصیت مسخ ہو اور نہ ہی ناظرین سے رابطہ ٹوٹے۔ ہم اس میں منظرنامے کی یہ خوبی دیکھتے ہیں کہ نہ تو غالب کی عظمت سے سمجھوتا کیا گیا ہے اور نہ ہی ناظرین کو نظرانداز کیا گیا ہے لیکن اس کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے لینے میں بڑی جانکاہی کا سامنا تخلیق کار نے کیا ہوگا۔

جن لوگوں نے گلزار کا ڈراما دیکھا ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ غالب کی زندگی کے نت نئے پہلو اس ڈرامے کا حصہ ہیں۔ غالب کی شخصیت میں جو گہرائی تھی، ان کے مزاج میں جو بذلہ سنجی اور شگفتگی تھی، ان کی شاعرانہ طبیعت میں جس طرح کی ندرت اور تازہ کاری تھی، گلزار نے ان تمام پہلوؤں کو واضح کرنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ایک طرح کی سحرانگیز جاذبیت ہے جو ناظر کو باندھ لیتی ہے۔ اگر ناظر صاحب ذوق ہے اور تخیل اس کا ساتھ دیتا ہے تو وہ غالب کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ غالب کو ان لمحات میں جینے لگتا ہے۔

یہ ڈراما اور منظرنامہ صرف غالب کا ہی نہیں بلکہ گلزار کے اپنے دل و دماغ اور ان کے تخلیقی رویے کا بھی بیان ہے۔ انھوں نے غالب کو پڑھا، پرکھا، سمجھا اور پھر اپنی فنکارانہ دسترس سے انھیں ٹی وی کی چھوٹی اسکرین پر یوں پیش کیا کہ غالب کی بے ریا شخصیت کا سادہ کرشمہ ایک چلتا پھرتا جادو بن گیا۔

گلزار نے غالب کی زندگی کو محض پیش نہیں کیا، بلکہ اس کو Deconstruct اور Reconstruct کر کے ایک نئی معنویت دی۔ غالب کے روزمرہ کے مناظر، وہی معمولاتِ زندگی لیکن گلزار کے ہاتھوں میں آ کر اسکرین کی جمالیات کا روپ دھار گئے۔

اس منظرنامے کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ غالب اور گلزار کا رشتہ محض فلمساز اور منظرنگار کا رشتہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تخلیق کار کا دوسرے تخلیق کار سے رشتہ ہے جو نئے میڈیم سے آگاہ ہونے کے ساتھ پرانے میڈیم سے بھی پوری طرح شناسائی رکھتا ہے بلکہ اس کوچے کا پرانا رہ نورد ہے اس لیے وہ تخلیق کار کے سینے پر گزرنے والی تخلیقی واردات کے کرب سے بھی آگاہ ہے اور اس کی زندگی اور ذہن کے دکھ سے ہم آہنگ ہونے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔

اس منظرنامے کی خوبی یہ ہے کہ موسیقی اور رنگ کی عدم موجودگی کے باوجود یہ حرکی و سمعی ڈرامے کی کمی کو پورا کرتا ہے اور پڑھتے وقت ہر مقام پر دلچسپی باقی رہتی ہے۔ غالب کی زندگی کے معلوم گوشے بھی نئے سے لگتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:magazines@ncpul.in

تحقیق و تنقید

بصیر و نظیر

مصنف/ ناشر: تنویر اختر رومانی
صفحات: 160، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ڈسٹی بیوٹر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔6

مبصر: عشرت ظہیر
ہاؤس نمبر A-370، گلی نمبر 6A، ذاکر نگر، نئی دہلی۔ 110025

تنویر اختر رومانی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا اولین مجموعہ 'بصیر و نظیر' ان کی دوررس بصارت کی نظیر ہے۔ یعنی یہ کتاب اسمِ بامسمّیٰ ہے۔

اس مجموعۂ مضامین میں معروف و مقبول تخلیق کاروں اور ان کی تخلیقات سے متعلق مضامین بھی ہیں، اور جھارکھنڈ کے مقامی قلم کاروں اور ان کی نگارشات پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

'ڈاکٹر ممتاز احمد کی شاعرانہ بصیرت' اس مجموعۂ مضامین کا پہلا مضمون ہے۔ اس میں تنویر اختر رومانی نے ڈاکٹر ممتاز احمد کی دو طویل نظموں کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، اور ڈاکٹر ممتاز احمد کی شاعرانہ بصیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

'ڈاکٹر احمد سجاد: شخص اور ناقد' اپنے اس مضمون میں تنویر اختر رومانی نے ڈاکٹر احمد سجاد کی پذیرائی کی ہے اور ان کی 24 شائع شدہ کتابوں کا تذکرہ اور تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی تدریسی دیانت داری کے تعلق سے ان کے 19 معروف و مقبول قلم کار شاگردوں کی فہرست بھی درج کی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔

اس مضمون میں ڈاکٹر احمد سجاد کی تنقیدی کتابوں، ان کے تاثرات و مختصر تبصروں اور تحریک ادب اسلامی کے تعلق سے کارکردگی کا موثر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ایک سیمینار کے لیے لکھا گیا ڈاکٹر احمد سجاد کے مضمون 'جھارکھنڈ کے چند اہم فنکار' کے تعلق سے تنویر اختر رومانی یہ بھی کہتے ہیں:

''... اس مضمون کے مطالعے سے بڑی تشنگی کا احساس ہوتا ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ادبی سیمناروں کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔''

تنویر اختر رومانی نے اپنے مضمون 'ڈاکٹر شاہد جمیل کے افسانوں کی انفرادیت' میں ان کے افسانوی مجموعہ 'ہابیل کی ہجرت' میں شامل افسانوں پر بہترین گفتگو کی ہے۔ لیکن انھیں ڈاکٹر شاہد جمیل کے افسانوں میں کہانی پن کی کمی کا ملال شدت سے ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ بھی عرض کرتے ہیں:

''ڈاکٹر شاہد جمیل تشبیہات و تمثیلات کے بادشاہ ہیں...''

آخر میں تنویر اختر رومانی نے یہ بھی درج کیا ہے:

''... پس منظر یا ماضی کا بیان ان کے تمام افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ کوئی افسانہ Flash Back سے خالی نہیں اور بار بار پلٹ آنے کے عمل میں ان سے یہ سہو ہو جاتا ہے کہ کبھی واحد متکلم (میں) اور کبھی واحد غائب (وہ) کا صیغہ استعمال کر بیٹھتے ہیں...''

اسلم جمشید پوری کے افسانچوں کا مجموعہ 'کولاژ' سے متعلق ایک مضمون بہ عنوان 'اسلم جمشید پوری اور کولاژ' اس مجموعۂ مضامین میں شامل ہے۔

تنویر اختر رومانی، افسانچے بھی لکھتے ہیں اور افسانچوں کی ادبی حیثیت سے متعلق ان کی کتاب 'افسانچے کی ادبی حیثیت' بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس اعتبار سے وہ افسانچوں کے حامی اور اس کے فنی استحکام کے دعوے دار ہیں۔ لیکن منٹو، اور جوگندر پال، جب اس صنف کو 'معتبر اور موثر' مرتبہ سے سرفراز نہ کرا سکے تو اس کا مستقبل آزاد غزل کی طرح غیر یقینی تو ہے ہی۔

تنویر اختر رومانی نے اپنے اس مضمون میں 'کولاژ' کے پیش لفظ اور اس میں شامل افسانچوں پر مدلل گفتگو کی ہے، لیکن انھیں افسانچوں کے اس مجموعہ کے نام 'کولاژ' پر اعتراض ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''گرچہ کولاژ معنوی اعتبار سے ایک خوبصورت لفظ ہے... لیکن اردو کی کتاب کے لیے اسم معرفہ کے طور پر انگریزی لفظ نہ صرف قابل اعتراض ہے بلکہ قابل مذمت بھی۔''

'اختر آزاد کا ناول، 'لیمی نیٹیڈ گرل'۔ اپنے اس مضمون میں تنویر اختر رومانی نے ناول کی کہانی، اسلوب اور عصری زندگی کی چمک دمک اور اس روشنی میں چھپے اندھیروں کی محرومیوں پر اچھی گفتگو کی ہے۔ ناول کے اسلوب کے تعلق سے وہ کہتے ہیں:

''... آغاز تا انجام پورا ناول تشبیہی و تمثیلی، استعاراتی و علامتی، جملوں اور اقتباسات سے مملو ہے۔''

یہاں بھی وہ انگریزی الفاظ کے استعمال پر معترض ہیں:

''... پورے ناول میں بے محابہ و بے تحاشہ انگریزی الفاظ، جملے اور فقرے استعمال کیے گئے ہیں، جو کہیں کہیں گراں گزرتے ہیں...''

اس مجموعۂ مضامین کے آخر میں لسانی و تحقیقی نوعیت کے دو دلچسپ اور انوکھے مضمون شامل ہیں۔ یہ مضمون ہیں:

(I) لفظوں کی وجہ تسمیہ اور (II) لفظوں کی ساخت

تنویر اختر رومانی سلیس اور سہج زبان لکھتے ہیں، جو غلطیوں اور خامیوں سے پاک ہوتی ہے، اس کتاب میں انھوں نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

''... اگر ادب کمزور ہے تو زبان کا کچھ زیاں نہیں ہوتا، لیکن زبان میں خامی ہوئی تو ادب اور ادیب دونوں کا وقار مجروح ہوتا ہے۔''

لہٰذا لفظوں کی وجہ تسمیہ اور لفظوں کی ساخت جیسی تحریریں لکھنا ان کے لیے آسان بھی ہے اور یہ ان کی سرشت میں بھی داخل ہے۔

لفظوں کی وجہ تسمیہ اور لفظوں کی ساخت سے چند نمونے پیش ہیں۔ امید کہ متعلقہ مضامین کے یہ نمونے دلچسپی کا باعث ہوں گے:

آسماں: یہ فارسی کے دو الفاظ 'آسیہ' اور 'مان' کا مرکب ہے۔ آسیہ کا معنی ہے چکی اور مان مانند کا مخفف ہے۔ مطلب ہے چکی کی مانند، یعنی گول، چونکہ آسمان چکی کی مانند گول ہے، اس لیے اسے آسمان کہا جاتا ہے۔

سیراب: سیر + آب = پانی سے بھرا ہوا۔ پیاس لگنے پر جب ہم اپنے پیٹ کو پانی سے بھر لیتے ہیں، یعنی ہماری پیاس بجھ جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں، سیراب ہو گئے۔ مطلب پانی سے بھر گئے۔

یہ کتاب باذوق، ادب شناس، ادب نواز حضرات کے لیے باعث تسکین و فرحت ہوگی!

متاع

مصنفہ: بانو سرتاج
صفحات: 240، قیمت: 400 روپے
زیر اہتمام: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد فیضان اللہ
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

’متاع‘ بانو سرتاج کے سترہ تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ہے جس میں انھوں نے ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، اٹل بہاری واجپئی، ہری ونش رائے بچن اور دیویندر ستیارتھی جیسی نامور ہستیوں پر مختلف زاویے سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مراٹھی ادب کی نمایاں شخصیات جیسے بہینا بائی، سریش بھٹ، وجے تینڈلکر اور تکڑوجی مہاراج کے حوالے سے مراٹھی ادب کے مختلف پہلوؤں کو بڑی وسعت کے ساتھ جگہ دی ہے۔

پہلا مضمون "امامِ ہند" مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی خدمات کا بیانیہ ہے۔ اس میں نہ صرف ان کے علمی وادبی کارنامے بیان ہوئے ہیں بلکہ ان کی سیاسی، مذہبی، صحافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کو بھی تفصیلی انداز میں مختلف ادبا کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

مضمون میں ان کی نثر کو اردو ادب کا نایاب وقیمتی سرمایہ قرار دیا گیا ہے اور حسرت موہانی و دیگر معاصرین ادبا و شعرا کے حوالے سے مضمون کو علمی و تحقیقی رنگ سے بھر دیا ہے۔ اس مضمون میں مولانا آزاد کی شخصیت ہندو مسلم اتحاد کے داعی، دو قومی نظریے کے سخت مخالف اور متحدہ قومیت کے علمبردار کی شکل میں نظر آتی ہے۔

گاندھی جی پر اس کتاب میں دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون اردو شاعری میں گاندھی جی کی شخصیت اور فلسفے پر پیش کیے گئے خراج عقیدت پر مشتمل اشعار و اقوال پر مبنی ہے۔ شعرا نے انھیں سچائی، عدم تشدد اور اتحاد کی علامت بنا کر انسانیت کا رہنما قرار دیا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی کا تصور اردو شاعری میں محض سیاست دان تک محدود نہیں بلکہ ایک مرشد، مسیحا اور امن کے طلب گار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

دوسرا مضمون ’گاندھی جی کا نظریۂ تانیثیت‘ ہے۔ اس میں انھوں نے عورت کو مرد کے برابر انسان، ساتھی اور سماجی وسیاسی زندگی کا لازمی جز و تسلیم کرنے والے مصلح کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ انھوں نے جہیز، پردہ و چائلڈ میرج کو سماجی برائی تصور کر کے ایک طرف اس کی مخالفت کی، تو دوسری طرف عورت کی آزادی کو بنیادی حقوق تصور کروایا۔ اور ساتھ ہی عورتوں کے مساوات اور شمولیت پر مبنی سماج کی تشکیل کی۔

اٹل بہاری واجپئی پر لکھا گیا مضمون ’سیاست داں شاعر‘ ہے، یہ ان کی کثیر الجہات شخصیت کے تذکرے اور شاعری پر مشتمل شاندار مضمون ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ علم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف اصول پسند، ایماندار اور جمہوری فکر کے علمبردار سیاست داں تھے تو دوسری جانب حساس، فلسفی مزاج اور انسانیت نواز شاعر بھی تھے۔ ان کے کلام میں وطن پرستی، امن پسندی، بہادری اور انسانی ہمدردی جھلکتی ہے۔ اس طرح سیاست اور شاعری کا حسین امتزاج ان کی شخصیت کو منفرد بناتا ہے۔

قدیم مراٹھی شاعری کو ہندوستان کی فکری، مذہبی اور سماجی تاریخ کا اہم حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی بڑی کامیابی یہ بتائی گئی ہے کہ سنسکرت کے پیچیدہ فلسفوں کو عوامی زبان میں منتقل کر کے ایک ایسی روایت قائم کی گئی ہے جو عام انسان کی زندگی اور جذبات سے جڑی رہے۔ گیانیشور، نام دیو، ایک ناتھ، تکارام اور رام داس جیسے شعرا نے اس روایت کو عروج بخشا۔ ان کی شاعری صرف مذہبی نہیں بلکہ فکری وسماجی بیداری کا محرک بھی بنی۔ بھکتی تحریک کے اثرات، ذات پات کی مخالفت، انسانی مساوات اور صوفیانہ اثرات قدیم مراٹھی شاعری کو ہمہ گیر بناتے ہیں۔ یوں قدیم مراٹھی شاعری نے سنسکرت کی اجارہ داری اور جمود کو توڑ کر کے مراٹھی کو ادبی زبان بنایا اور انسان دوستی وسماجی انصاف کی بنیاد رکھی۔

سریش بھٹ کی شاعری اور شخصیت پر لکھا گیا مضمون بتاتا ہے کہ ذاتی دکھ نے ان کی تخلیقی صلاحیت کو جلا بخشی، اور انھوں نے اپنے ذاتی تجربے کو اشعار کے قالب میں ڈھال دیا۔ ان کو عوامی لہجے میں غزل گوئی کی وجہ سے ممتاز مقام ملا۔ عشق، بھکتی، طنز، احتجاج اور انقلاب جیسے موضوعات ان کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اردو غزل سے قربت اور غالب سے انسیت بھی ان کے یہاں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور اسی یکسانیت کی وجہ سے ان کو مراٹھی شاعری کا غالب کہا جاتا ہے، ان کے کلام میں ذات پات پر طنز اور انسانی شعور کی بیداری واضح انداز میں موجود ہے۔

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر پر تحریر کردہ مضمون ان کی جدو جہد کو خواتین کی آزادی اور استحکام کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔

امبیڈکر کی فکر کا نچوڑ یہ تھا کہ اگر چہ قانونی اصلاحات ضروری تھیں مگر سماجی ذہنیت کی تبدیلی اس سے زیادہ ناگزیر تھی اور موجودہ عہد میں بھی ہے۔

ہری ونش رائے بچن پر لکھا گیا مضمون ’مدھوشالا کا گیت کار‘ ان کی شاعری کو عوامی زبان، علامتی اسلوب اور فلسفیانہ گہرائی کے ذریعے امر بناتا ہے۔ ’مدھوشالا‘ نے انھیں عالمی سطح پر شہرت بخشی۔

دیویندر ستیارتھی پر رقم کردہ تحریر انھیں ’بنجارہ ادیب‘ اور ’لوک یاتری‘ کے طور پر پیش کرتی ہے۔ انھوں نے لاکھوں لوک گیت جمع کر کے ہندوستانی ثقافتی ورثہ کو محفوظ کیا۔ ان کی تحریروں میں حقیقت نگاری اور شاعرانہ حسن نمایاں ہے۔

تکڑوجی مہاراج کے افکار عورت کو خانہ داری سے بلند کر کے سماج اور قوم کی تشکیل میں برابری کا درجہ دینے کی تاکید کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت ماں، درگا اور طاقت کی علامت ہے۔

وجے تینڈلکر پر مضمون ان کے تھیٹر کو محض تفریح نہیں بلکہ سماجی شعور کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ انھوں نے طاقت، منافقت اور استحصال کو بے نقاب کیا ہے، اور مخالفت کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ان کی فلمی کہانیاں بھی عالمی سطح پر شہرت یافتہ ہیں۔

’مراٹھی ادب اطفال میں نفسیات‘ مضمون میں بچوں کے ادب، ان کے نفسیات اور تربیت کا حسین امتزاج ملتا ہے، جس سے ادب اطفال میں گراں قدر سرمایہ کا اضافہ ہوتا ہے۔

’غیر سنسکرت داں طبقے کی خدمات‘ میں مغربی محققین، عرب و فارسی علما اور اردو ادبا و مترجمین کی کاوشوں کا اختصار کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے، جنھوں نے سنسکرت متون کو عالمی سطح پر پہنچایا۔

’پریم چند کی بچوں کی دنیا‘ میں ان کی کہانیوں کو بچوں کی نفسیات اور اخلاقی تعلیم

کا آئینہ بتایا گیا ہے۔

امبیڈکر پر ایک دوسرا مضمون بھی ہے، جس میں وہ مفکر، قانون داں اور سماجی مصلح کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

'لوک کہانیاں: کل اور آج' مضمون میں لوک کہانی کو اخلاقی اقدار اور تہذیبی عناصر کا حصہ بتایا گیا ہے اور اس کی موجودہ دور میں معنویت پر زور دیا گیا ہے۔

یہ مضمون لوک ادب کی اہمیت، اس کے ارتقا سے باخبر کرنے کے ساتھ، لوک کہانیوں سے سماج و تہذیب پر پڑنے والے مؤثر کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ مضمون کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں لوک ادب کو عالمی تناظر میں دیکھا گیا ہے، اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوک کہانیاں انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہیں۔

مصنفہ نے قصہ گوئی کی فنکارانہ جہت، عوامی کرداروں کی نمائندگی، عورتوں کے فعال اور ذہین کردار، اور لوک کہانی کے اخلاقی پہلو کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ 'گونڈ کسان' کے حوالے سے پیش کی گئی مثال لوک کہانی کے بانٹنے اور پھیلانے کی روایت کو نہایت دلکش پیرائے میں سمجھاتی ہے۔

شاعری

رنگِ چمن زار (شعری مجموعہ)

شاعر: مرغوب اثر فاطمی

صفحات: 256، قیمت: 300

ناشر: ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ 4

مبصر: عین تابش، سہسرام کارنج، شانتی باغ، نیو کریم گنج، گیا، بہار

شاعری کی وسیع المشربی اور کثیر الجہتی اپنے آپ میں بے مثال اور لا محدود ہے۔ جیسے جیسے علم و ادب کا دائرۂ کار بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے شعر کے تخلیقی ابعاد و امکانات بڑھتے جاتے ہیں۔ ادبی و تہذیبی تحریکات و انقلابات کی تیز رفتاری کے ساتھ شاعری کا وفور شوق روایات کی برکتوں اور جدت طرازی کی نعمتوں سے لبریز ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ کہنا کہ فلاں عہد ختم ہوگیا اور فلاں کا آغاز ہوگیا بے حد مبہم اور ادھوری سچائی کی طرح ہے۔ آج بھی روایت پسند شاعری، جدت طراز شاعری اور ان دونوں کے درمیان انسلاک اور امتزاج قائم کرنے والی شاعری تینوں موجود ہیں بلکہ ایسے شعری تجربات بھی موجود ہیں جو ساری نشان زد تعریفوں سے الگ اور بے نیاز ہو کر اپنے اندر کے جذب و کیف سے معمور وجود پذیر اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں اور حسن و صداقت کی تلاش کے محور پر بے نیازانہ رقص کرتے ہیں۔

اس وقت جس کتاب کا تعارف مقصود ہے وہ دل و جاں تک پہنچنے والی فطری تخلیقی خوشبو کی طرح ہے جس میں روایت کی سحر انگیزی اور جدت پسندی کی خوش خبری ایک ساتھ قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی قوت رکھتی ہے۔

تنہائی سے تنہائی تک
جانے اب کتنی دوری ہے
کچھ سانسوں سے زیادہ بھی کیا

(تسلسل)

سوال آنکھوں میں اکثر گھورتا ہے
کہ ہم زندہ ہیں یا پھر مر چکے ہیں
فقط تدفین کی رسمیں ہیں باقی

(کیا ہم مر چکے ہیں)

خود سے ملنا ہو تو کچھ لمحے چرا کر اک دن
دور افتادہ کسی کنج شجر میں رہیے

قبولیت کو سنا ہے کہ ضد دعا سے ہے
تو کیوں نہ ایسا کریں بد دعا ہی کر ڈالیں

گئی تھی یاد ٹہلنے تو ساتھ تحفے میں
وہ میرے گاؤں کی تصویر کھینچ لائی تھی

چل کے دشمن کی چائے پی جائے
خیریت دوستوں کی لی جائے

نظم اور غزل کے نمونے ایک ایسے شاعر سے معانقہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں جس کے حسن اور صداقت کی تلاش کے جلوے اپنے مخصوص انداز میں موجود ہیں اور ایک خوبصورت اور سادہ و رنگین اسلوب اظہار اس تخصیص کی تائید کرتا ہے جس کی طرف میں نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔ جذبہ و فکر کی بے ساختگی اور درون روایت و ماورائے روایت جدت طرازی اور اسلوب کشائی مرغوب اثر فاطمی کے شعری اظہار کو اپنی شناخت اور اپنے لہجے کے ذریعہ تخلیقی ریاضت اور فنی ندرت کے عوامل تک پہنچانے کا اہتمام کرتی ہے۔

موج فریاد دل سنگ سے ٹکراتی رہی ۔۔۔ پیش میں کرتا رہا فرد شہادت کیا کیا
گلوں کے درمیاں رکھتا ہے بیکل ۔۔۔ مجھے شوق بیابانی کا سایہ
شہر آشوب میں جناب اثر ۔۔۔ مصرعۂ شاد ہو کے بیٹھے ہیں

'رنگ چمن زار' کا مطالعہ ہمیں ایک ایسے جہان شعر کے قریب کرتا ہے جہاں ایک سادہ کار اور اثر کوش اظہار سے متعارف ہوتے ہوئے ہم شعری تخلیقیت کی ہمہ گیری اور دل پذیری کے احساس سے قریب ہوتے ہیں۔

ادب اطفال

تین ستارہ منزل

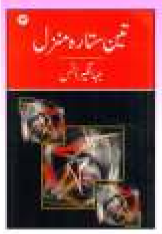

مصنف: جہانگیر انس

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، دہلی 110095

مبصر: ڈاکٹر ارشاد احمد، 1731 آمنہ منزل، اسلامیہ نگر، سیوان

جہانگیر انس ادب اطفال کے حوالے سے ملک گیر سطح پر اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئیں ان کی کہانیاں بچوں کی دنیا، امنگ اور پیام تعلیم میں تواتر سے شائع ہوتی ہیں۔ ادب اطفال کے علاوہ ان کی پہچان ایک پختہ کار انشائیہ نگار، معتبر خاکہ نگار اور معروف افسانہ نگار کی بھی ہے۔ انھوں نے شاعری بھی کی ہے لیکن ابھی تک ان کا کوئی شعری مجموعہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ پیش نظر ان کی کہانیوں کا مجموعہ 'تین ستارہ منزل' بچوں کے لیے چھٹی کتاب ہے۔ اس

کتاب میں شامل بیشتر کہانیاں قومی سطح کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

جہانگیر انس تقریباً پچاس برسوں سے بچوں کے لیے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اخلاقی تعلیم، دلکش تمثیلات اور اعلیٰ کردار سازی کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں جو بچوں کی ذہن سازی، فکری نشو ونما، اور اخلاقی اقدار کی پاسداری میں معاون رول ادا کرتے ہیں۔ چونکہ وہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اس لیے وہ بچوں کی نفسیات، ذہنی وفکری مطالبات اور ان کی تربیتی مبادیات سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں محنت، ایمانداری، ہمدردی، صبر وتحمل، انسان دوستی، خود اعتمادی اور جذبۂ قومیت کے فروغ کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی کہانیاں سبق آموز ہیں اور بچوں کو غور وفکر کرنے اور فیصلے لینے کی ترغیب دیتی ہیں۔

جہانگیر انس نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی بے اعتدالی اور بدعنوانی کا عکس دکھایا ہے اور بچوں کو ان کے مضر اثرات سے آگاہ کیا ہے۔ تین ستارہ منزل اسی نوعیت کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں آپسی اتحاد و اتفاق اور خاندانی میل جول کو اہمیت دی گئی ہے۔ کہانی کار نے بتایا ہے کہ جہاں اتحاد و اتفاق ہے وہاں سکون کے ساتھ ساتھ ترقی بھی ہے۔ اسی طرح 'دیہات اور شہر' اس کتاب کی ایک اہم کہانی ہے۔ اس کے مرکزی کردار میں دادی اماں ہیں جو خالص مشرقی روایات کی پروردہ ہیں۔ لیکن جب ان کا بیٹا شہر لے جاتا ہے تو وہ وہاں کے ماحول میں فٹ نہیں بیٹھتی ہیں اور اپنے پرانے انداز سے زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ گاؤں میں الاؤ کے گرد جمع ہو کر کہانی سننے اور سنانے کا ماحول تھا۔ دادی اماں شہر میں بھی الاؤ جلاتی ہیں اور گھر کے تمام بچوں کو بلاتی ہیں۔ لیکن یہ بات ان کے بیٹے کو ناگوار گزرتی ہے اور وہ اپنی ضعیف ماں کو سختی سے منع کرتا ہے۔ تبھی ماں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے بہو مداخلت کرتی ہے اور اپنے بچوں کو الاؤ کے پاس بھیج دیتی ہے۔ دادی اماں اس دن ظالم اور مظلوم کی کہانی سناتی ہیں جس سے بچے کافی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس طرح جہانگیر انس نے یہ پیغام دیا ہے کہ خاندان میں عمر رسیدہ لوگوں کی اہمیت کم نہیں ہے البتہ ان کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کیا جائے۔

'قیمتی وقت' میں جہانگیر انس نے ایک ماں کی جذبات بھری محبت کی کہانی پیش کی ہے۔ ارحان تنگ حالی میں پلا بڑھا سمجھدار لڑکا ہے۔ وہ اپنی ماں کی کوششوں سے اعلیٰ افسر بن جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی شادی ہوتی ہے اور پھر دو بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب ارحان کے پاس وقت کم ہے اس لیے وہ اپنی ماں کو وقت نہیں دے پاتا ہے۔ ایک دن بازار جاتے وقت ماں سے کہتا ہے ''امی! بازار سے کچھ لانا ہے تو بتا دیں''۔ ماں ایک رقعہ اس کے حوالے کرتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ''ضعیفی میں میری سب سے پسندیدہ چیز تمھارا کچھ وقت ہے جو میرے ساتھ گزرے''۔ یہ پڑھ کر اس کے خوابیدہ جذبات جاگ جاتے ہیں۔ گھر آ کر ارحان اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر رونے لگتا ہے۔ ماں اسے چپ کراتی اور سمجھاتی ہے کہ ''بڑھاپے کی تنہائی کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے''۔ جہانگیر انس لکھتے ہیں:

''ضعیف والدین کو مادی چیزوں سے زیادہ ان کی توجہ، پیار اور محبت کی ہوتی ہے۔ انھیں اولاد کے کچھ وقت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی تنہائی کے درد کا مداوا کر سکیں۔ لیکن آج کل کے بچے یہ بات نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مادی ضرورتوں کو پورا کر کے اپنے فرض کو پورا کر دیا۔'' (ص 81)

سبق آموز کہانیوں کے ساتھ ساتھ جہانگیر انس نے سائنسی موضوعات پر بھی کہانیاں تحریر کی ہیں۔ 'زمین کی سلامتی' اور 'قوس وقزح کی کہانی' اسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔ کہانی زمین کی سلامتی میں انھوں نے بچوں کو بتایا ہے کہ فضائی آلودگی اور عالمی تپش (گلوبل وارمنگ) کے کیا کیا نقصانات ہیں۔ ان کی وجہ سے انسانی صحت کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ قوس وقزح کی کہانی میں اس کی تعمیر وتشکیل اور ان کے رنگوں کا بیان دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ یہ بچوں کی ذہنیت کو دھیان میں رکھ کر لکھی گئیں معلوماتی کہانیاں ہیں۔

اس طرح جہانگیر انس کی یہ کتاب ادب اطفال میں ایک اہم اور قیمتی اضافہ ہے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ کتاب بچوں کی کردار سازی اور ذہن سازی میں معاون ثابت ہوگی۔

سفر نامہ

پکارتے ہیں راستے

مصنف: ایس ایم حسینی

صفحات: 280، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: سید محمود الرحمٰن حسینی

طباعت: نعمانی پرنٹنگ پریس، گولہ گنج لکھنؤ، یوپی

مبصر: اسامہ طیب، ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

سفر سے کسی کو مفر نہیں ہے، خواہی نہ خواہی انسان کو سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی یکسانیت سے تنگ آ کر، کبھی کسی مقصد کے حصول کے لیے اور کبھی محض تفریح طبع کی خاطر لوگ سفر کرتے ہیں۔ نئے دور میں انٹرنیٹ کے بعد لوگوں نے مختلف ممالک کو ویڈیو کے ذریعہ دیکھنا شروع کیا، دنیا بھر کے خوبصورت نظارے، مختلف ممالک کے احوال اور بھانت بھانت کے لوگوں کا تعارف لوگوں کو انگلی کے پوروں پر دستیاب ہونے لگا اور ایسا لگنے لگا کہ لوگ اب سفر کی صعوبتوں سے دامن بچا کر گھر بیٹھے ہی دنیا کا نظارہ کریں گے، لیکن اس کے برعکس آتش شوق سفر مزید بھڑک اٹھی اور لوگ اتنی بڑی تعداد میں سیر وسیاحت کو نکل کھڑے ہوئے کہ ایسا لگتا ہے شاید انسان اپنی تاریخ میں سب سے زیادہ سیر وسیاحت میں آج کے دور میں مصروف ہے۔ ایس ایم حسینی بھی اپنے شوق کی تسکین اور مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم سفر ہیں۔

ایس ایم حسینی اردو کے ابھرتے ہوئے کالم نگار، تبصرہ نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ وہ اوائل عمر سے ہی لکھ رہے ہیں اور ان کی تحریریں اہل ادب سے داد وصول چکی ہیں۔

'پکارتے ہیں راستے' ہندوستان کے مختلف صوبوں، شہروں اور تاریخی مقامات کے اسفار کی روداد پر مشتمل ہے۔ ان میں مہاراشٹرا، تلنگانہ، حیدرآباد، نینی تال، دلی اور اتر پردیش کے مختلف شہروں دیوبند، علی گڑھ، آگرہ، فیروزآباد، رامپور، نینی تال، گوپامئو وغیرہ کے اسفار کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ان مقامات سے جڑے تاریخی حقائق اور دیگر احوال کو سادگی سے بیان کر دیا گیا ہے، واقعات کو بیان کرنے میں حسینی کا قلم جھول کا شکار نہیں ہوتا، ان میں ترتیب، ربط اور تسلسل کی جھلک نمایاں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف کتاب قاری کو لمحہ لمحہ اپنے سفر کے ہر پڑاؤ سے باخبر

کر رہے ہیں اور پورا سفر ایک فلم کی طرح آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

اسی طرح مصنف جب کسی خاص جگہ کے بارے میں بتا رہے ہوتے ہیں تو وہ اس جگہ کے محل وقوع اور اس کا پورا نقشہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اس جگہ کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ جامع مسجد دہلی کے اندرونی حصہ کا نقشہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحن عبور کرنے کے بعد مسجد کے اندرونی حصہ میں جانے کے لیے چھ زینے اور پھر بڑا سا ایک گیٹ، جس کے تینوں اطراف کو سنگ مرمر سے مزین کیا گیا ہے۔ اور بڑے دروازے دونوں طرف پانچ پانچ در ہیں اور ہر در کے اوپری حصہ پر چند آیتیں لکھی ہوئی ہیں، بڑے دروازہ کے اوپر دو چھوٹے منارے ہیں، اسی طرح عقبی حصہ میں بڑے گنبد کے سامنے بھی دو چھوٹے منارے ہیں۔''

سفرنامہ نگار نے پورے سفرنامے میں خاص طور سے عمارتوں کا نقشہ بیان کرنے میں اسی طرح کی جزئیات کا خیال رکھا ہے۔

ان سفرناموں کی ایک خصوصیت یا بعض قارئین کے نزدیک شاید کمی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مصنف نے اپنے داخلی جذبات اور اندرونی کیفیات کا اظہار بہت کم کیا ہے۔ عام طور پر سفرناموں میں ایسا ہوتا ہے کہ مسلم بادشاہوں کے مقبروں اور تاریخی مقامات پر پہنچ کر سفرنامہ نگار کی جذباتی حالت میں کچھ نہ کچھ تغیر ضرور واقع ہوتا ہے اور پھر وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنے سفرنامہ میں ضرور کرتا ہے۔ 'پکارتے ہیں راستے' کے قارئین اگر اس سفرنامہ کو داخلی کیفیات کے آئینہ میں دیکھنا چاہتے ہیں تو انھیں تشنگی محسوس ہوسکتی ہے۔

بہت سارے سفرناموں کے برعکس اس سفرنامہ میں مصنف نے جن علاقوں کا سفر کیا ہے ان علاقوں کے ثقافتی اور معاشرتی حالات کو مصنف نے کم جگہ دی ہے، البتہ بعض مقامات کے تعلق سے تاریخی حوالے ضرور مل جاتے ہیں۔ شاید مصنف نے ارادتاً اپنے مشاہدے کو محدود رکھا ہو تاکہ قاری صرف مقام کی جمالیات پر توجہ دے، نہ کہ ان کے پیچیدہ سماجی ڈھانچوں پر۔

مصنف کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کئی مقامات پر سامنے آتی ہے، وہ نہ صرف شعر و ادب کی محفلیں سجاتے ہیں بلکہ موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور فن تعمیر کے حسن کو بھی بیان کرتے ہیں۔

اس سفرنامہ کا اسلوب سادگی کے ساتھ رنگینی و رعنائی بھی لیے ہوئے ہے، تشبیہات و استعارے کے استعمال سے مصنف کتاب نے بیانیہ انداز کی خشکی اور بوجھل پن کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ دلی کے بارے میں لکھا گیا پیراگراف اس کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں شہر کی تاریخی عمارات اور گلیوں کو ایک جیتی جاگتی محبوبہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے: وہ لکھتے ہیں:

''دلی گلشن ہند کی ایک نایاب کلی ہے، یا کہہ لیں کسی پرستان کی پری زاد ہے، جس کا سرخ جوڑا لال قلعہ ہے تو جامع مسجد ماتھے پر دمکتا جھومر، اس کی سیاہ دراز زلفوں کی تشبیہ قطب مینار کی لمبائی سے دیں یا مین ونقش کی تاریخی عمارتوں سے، دلی کے بازار اس کے کھلتے ہوئے چہرے پر غازہ کا کام کرتے ہیں، تو انڈیا گیٹ اس کے گلے میں پڑا قیمتی ہار ہے جس میں ابوالکلام آزاد اور غالب جیسے ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔''

مصنف نے تشبیہوں اور استعاروں کا نہایت خوبصورت استعمال کیا ہے۔ 'مشک افشاں زلف'، 'سرمایۂ ناز'، 'کسی سلگتی لکڑی کی طرح' یہ سب الفاظ محض بیان نہیں، بلکہ یہ الفاظ اس منظر کی ایک ایک جزئیات کو قاری کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح حرکت کرتے ہوئے پیش کردیتے ہیں، اسی کے ساتھ اس عبارت میں زبان کا جمالیاتی حسن بھی ہے۔

مصنف کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، انداز بیان فطری معلوم ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتاب کا اسلوب سادہ، رواں اور شگفتہ ہے، تشبیہات واستعارات اور اشعار کا استعمال اسے ادبی حسن بخشتا ہے، کتاب میں کئی جگہ مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ایس ایم حسینی کا یہ سفرنامہ اردو ادب میں سفرنامہ نگاری کی ایک سنجیدہ، پرکشش کوشش ہے۔

فکشن

صحرے کی پیاس

مصنف: ڈاکٹر شمیم صادقہ

مرتب: اسلم جاوداں

صفحات: 160، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2025

مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی، E-167/1، فورتھ فلور، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

ڈاکٹر شمیم صادقہ اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کا شمار ان خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے 1970۔1980 کی دہائی میں جدیدحسیت کے ساتھ اردو افسانے کو مضبوطی دی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جدید اسلوب اور عورت کے نفسیاتی پہلو پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ جزئیات نگاری میں ماہر ہیں اور افسانوں میں واقعات کو ترتیب سے بیان کرکے قاری کو اندرونی جذبات وحقیقت سے روشناس کراتی ہیں۔ ان کے معاصرین میں شکیلہ اختر اور نزہت نوری وغیرہ شامل ہیں، تاہم شمیم صادقہ کا اسلوب اپنے اندر نفسیاتی باریک بینی اور عصری تاثر لیے ہوئے ہے۔

ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ 1979 میں 'کرچیاں' نام سے شائع ہوچکا ہے۔ اس کے بعد دوسرا افسانہ 'ادھورے چہرے' 1980 اور تیسرا 1984 میں 'طرح دیگر' نام سے شائع ہوکر منفرد مقام قائم کرچکے ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ پھر سے اپنی افسانوی دنیا میں 'صحرے کی پیاس' لے کر گہرا استعارہ کے ساتھ حاضر ہوئی ہیں۔ یہ استعارہ صرف ریگستان کے پانی کی طلب کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ انسان کے دل، روح اور احساسات کی پیاس کو بھی بیان کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں گہرے اور تپے ہوئے احساسات، تجربات ومشاہدات کی حدت اور حقیقت بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔ 'صحرے کی پیاس' کے استعارہ کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے جیسے ریگستان بارش کی ایک بوند کو ترستا ہے، ویسے ہی انسان دل کی تسکین کے لیے محبت یا سکون کو ڈھونڈتا ہے۔ صاحب کتاب کا مزاج چونکہ شاعرانہ ہے، کلاسیکی شاعری سے ان کا گہرا لگاؤ ہے، لہٰذا 'صحرے کی پیاس' کے استعارے کو محبت، جدائی، یا روحانی تڑپ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حقیقی معنی ومطلب کے لحاظ سے یوں سمجھا جاسکتا ہے جیسے صحرے کی زمین ہمیشہ خشک رہتی ہے اور بارش یا پانی کے بغیر زندگی کا وجود مشکل ہے، ویسے ہی انسانی زندگی، سماج کی تشکیل اور سماج کے مسائل کو آشکارا کیے بغیر ایک افسانہ نگار کی تحریر ادھوری رہتی ہے۔

ڈاکٹر شمیم صادقہ کے افسانوں میں کہانی سازی سے اوپر اٹھ کر ان کا نظریہ، فلسفہ

اور حیات انسانی کے مثبت افکار نظر آتے ہیں۔ افسانہ' آؤ اب لوٹ چلیں' میں افسانہ نگار ڈاکٹر شمیم صادقہ نے 'لو ان ریلیشن شپ' والے رشتے کو ہوائی جہاز کے سفر سے جوڑ کر بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ واضح کیا ہے کہ یہ بہت ہی کمزور اور ناقص رشتہ ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''مجھے پہلی بار کا وہ ہوائی سفر یاد ہے، جب میں نے پلین کی کھڑکی سے دیکھا تو مجھے اچانک احساس ہوا کہ نیچے چلنے والی کاریں اور رکشہ کس قدر خوش اور مطمئن ہیں۔ یہ کیا کہ چند گھنٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ نہ سفر کا مزہ اور نہ کوئی خوبی، تب مجھے احساس ہوا کہ یہ لیو ان ریلیشن والا رشتہ کس قدر ناقص ہے۔''

ان کے افسانوں میں جدیدیت کی لہر واضح اور نمایاں طور پر موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں وجود کی تلاش کے عناصر موجود ہیں۔ اسلم جاودواں لکھتے ہیں کہ:

''شمیم صادقہ اپنے عہد کی واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جن کا قلم جدیدیت کے اثرات کا حامل تھا، لیکن ان کی جدیدیت پسندی میں نہ تو ابہام کا رنگ آیا اور نہ ہی ترسیل کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ بلکہ ان میں بڑی دل پذیری اور اسلوب بیان کا حسن ہے، جو دل و دماغ کو بے حد متاثر کرتا ہے۔''

ڈاکٹر شمیم صادقہ کے افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ کتاب میں شامل کئی افسانوں کے عنوان غالب کے اشعار سے ماخوذ ہیں۔ افسانہ' آہ کو چاہئے ایک عمر' اس افسانے میں وقت اور حالات کے بدلنے کی بہترین منظر کشی کی گئی ہے۔

شمیم صادقہ نے 'صحرے کی پیاس' میں شامل افسانوں کے ذریعہ سماج کو آئینہ دکھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ یقیناً وہ ایک نبض شناس افسانہ نگار ہیں، اس کا اندازہ زیر تبصرہ افسانے کی پیش کش، مواد اور تفہیم سے ہوتا ہے۔ 'صحرے کی پیاس' کے مرتب اسلم جاوداں ہیں، جنھوں نے بہت ہی حسن اسلوبی سے ترتیب دے کر کتاب کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو قابل تعریف ہے۔ وہ خود شمیم صادقہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شمیم صادقہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ فکر و نظر کی حامل، نسوانی عظمت کی علمبردار افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں ذات کی شناخت کا معاملہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

صاحب کتاب ڈاکٹر اسلم جاوداں نے 'شمیم صادقہ: ایک بازیافت' میں لکھتے ہیں:

''واقعی شمیم صادقہ صاحبہ نے طویل عرصے تک ایسی گوشہ گیری اور گمنامی اختیار کی کہ 2018 میں جب اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعہ ستر سال سے زائد عمر کے ادب نگاروں کو اعزاز دینے کا فیصلہ کیا گیا تو اس کی عمومی فہرست میں ڈاکٹر شمیم صادقہ کا نام بھی شامل کیا تھا۔ انتخابی کمیٹی میں سے بعض حضرات نے اس پر حیرت کا اظہار کیا اور دریافت کیا کہ کیا یہ ابھی حیات سے ہیں؟''۔

ترتیب

ارمغان پرویز

مرتب: انجینئر فیروز مظفر

صفحات: 160، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-25

مبصر: فراز عارف، باردانے والی گلی، مظفر نگر اکولہ، ضلع اکولہ، مہاراشٹر 444006

انجینئر فیروز مظفر کی غالباً یہ پچیسویں کتاب ہے جو انھوں نے مرتب کی ہے۔ یہ کتاب جو کہ نام سے ظاہر ہے ان کے چھوٹے بھائی پرویز مظفر (برمنگھم، یو کے) کی ادبی، سماجی اور گھریلو زندگی پر روشنی ڈالتی ہے۔ 'ارمغانِ پرویز' صوری اور معنوی اعتبار سے ایک خوبصورت کتاب ہے جسے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔

پرویز مظفر غزل اور نظم دونوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ وہ غزلوں پر والد محترم مظفر حنفی سے اصلاح لیتے تھے اور نظموں پر ساقی فاروقی سے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل میں پرویز مظفر کا کلام اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ اُن کے دو شعری مجموعے 'تھوڑی سی روشنی' اور 'اداس نظمیں' شائع ہو چکے ہیں اور ادبی دنیا میں اُن کی موجودگی کا احساس کراتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں پرویز مظفر کی کافی پزیرائی ہوئی ہے، اس لیے نہیں کہ وہ مظفر حنفی کے فرزند ہیں بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور کلام کی ندرت نے مشاہیر ادب کو مجبور کیا کہ وہ پرویز مظفر کو سراہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین اس بات کی دلیل ہیں کیونکہ یہ صرف تعریفی اور توصیفی مضامین نہیں ہیں اور نا ہی فرمائشی۔

اس کتاب میں ساحر شیوی، پروفیسر فرمان فتح پوری، مظفر حنفی، منور رانا، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق آر اور افتخار امام صدیقی جیسے مشاہیر ادب کے کل 31 مضامین شامل ہیں۔

پروفیسر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں ''ان کے اشعار کی لفظیات اور لفظوں کی بنت صاف بتاتی ہے کہ ان کا تعلق ابلاغ کی ایسی سطح سے ہے جو قاری کے ذہن کو براہ راست متوجہ کرتی ہے اور جس کے ادراک معنی میں قاری یا سامع کو غیر ضروری ذہنی ورزش کا سامنا نہیں کرنا پڑتا حالانکہ یہ اشعار بہ اعتبار معنی و موضوع بہت سادہ نہیں ہیں، ان کے الفاظ سادہ سہی لیکن پرکاری سے عاری نہیں ہیں...''

اس کتاب کو پڑھ کر ایک بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ پرویز مظفر ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ایسے بیٹے بھی ہیں کہ آج کے دور میں دنیا کا ہر باپ یہ تمنا کرے گا کہ اگر اللہ بیٹا دے تو پرویز مظفر جیسا دے۔ دنیا نے عاشقوں کو اپنے معشوق کی رحلت پر رنج و غم میں ڈوب کر برباد ہوتے ہوئے دیکھا ہے، بیٹے کو ماں کی رحلت پر خون کے آنسو روتے ہوئے دیکھا ہے لیکن باپ کی رحلت پر اس قدر خود کو تنہا محسوس کرنا اور اداسی کے گھنے اندھیرے میں خود کو قید کر لینے کی مثال کم کم ہی ملتی ہے۔ پرویز مظفر اپنے والد مظفر حنفی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ مظفر حنفی صاحب کا حال بھی کوئی جدا نہیں تھا۔ وہ اپنے مضمون 'چند سطریں پرویز کے لیے' میں لکھتے ہیں'' فروری 1993 کے وسط میں پرویز ایک دوست حنیف اور پھوپھی زاد بھائی شکیل کے ساتھ ہمارے پاس کلکتہ آیا۔ دو تین دن ماں، بہن اور ساتھیوں کے ہمراہ تفریح کی اور ایک رات کو میرے پاؤں دبانے بیٹھ گیا۔ میں نے پیر سمیٹ لیے تھے۔

''تم جانتے ہو میں نے کبھی تمھاری ماں، بہن یا بھائی کو اپنے پاؤں دبانے کی اجازت نہیں دی۔''

بولا'' پاپا اچھا لگ رہا ہے۔ چلیے پاؤں نہیں دباؤں گا لیکن پائینتی بیٹھنے دیجیے۔''

پوچھا تھا ''بہت تھکن لگ رہے ہو، کوئی خاص بات ہے؟''

اس نے میرے گھٹنوں میں اپنا سر رکھ دیا تھا۔ لندن کے ہی کئی اسپتال نے مجھے اور حنیف کو ایک سال کے لیے اپنے خرچ پر طلب کیا ہے، کچھ ضرورت مندوں کی رضا کارانہ خدمت کریں گے اور ہماری تربیت بھی ہو جائے گی۔''

''تم لوگوں نے جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟''

اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔'' آپ کی اجازت کے بغیر جانے کا

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

ایسی بہت سی باتیں اس کتاب میں ہیں جو باپ بیٹے کی محبت کی شدت کا احساس کراتی ہیں۔ مظفر حنفی کا یہ شعر۔

میری سنتے، اپنی کہتے، میرے دیدہ و دل میں رہتے
لیکن تم نے اپنا مسکن سات سمندر پار بنایا

کافی کچھ کہتا ہے۔

محترم منور رانا کی رائے میں پرویز مظفر دیارِ غیر میں ہندوستان کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ویسے تو منور رانا اپنی تحریروں کے کڑوے کسیلے پن کے لیے مشہور ہیں لیکن یہاں وہ ایک مربی اور مشفق کی حیثیت سے اپنی موجودگی درج کراتے ہیں۔

محترمہ سلطانہ مہر نے ایک دلچسپ انٹرویو کو بخوبی مضمون کی شکل میں ڈھالا ہے۔ محترم منور احمد کنڈے نے پرویز مظفر کی غزلیہ شاعری پر پُر مغز گفتگو کی ہے۔

بقول پروفیسر سحر انصاری حسیاتی سطح پر پرویز مظفر کی غزل کے یہ اشعار جاذبِ توجہ ہیں۔

صحن میں آنکھ موند کر نکلو — چاندنی بے لباس بیٹھی ہے
دل کا وہ حال جیسے سینے میں — ایک چڑیا اداس بیٹھی ہے

جہاں تک پرویز مظفر کی نظم گوئی کا سوال ہے تو اس موضوع پر ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر سید محمود کاظمی، ڈاکٹر افضال عاقل، فصیح اللہ خاں نقیب، ڈاکٹر رضیہ حامد، فخر الدین عارفی، عظیم اللہ ہاشمی، دانش کمال اثری اور انزلا فاروقی نے سحر حاصل گفتگو کی ہے۔

کتاب میں پرویز مظفر کے بہت سے خوبصورت قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

آ کر وطن سے دور ترقی کے داؤں میں — پردیس ہم نے باندھ لیے اپنے پاؤں میں
رہ کر عظیم شہروں میں پرویز آج بھی — دل کا قیام ہے اسی چھوٹے سے گاؤں میں

آخر میں انجینئر فیروز مظفر اور پرویز مظفر دونوں صاحبان کو اس خوبصورت کتاب کی اشاعت پر خلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کو عام قارئین کے ساتھ ساتھ اہلِ علم حضرات بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور خاطر خواہ پذیرائی سے نوازیں گے۔

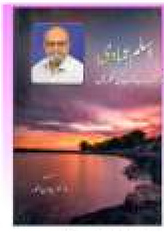

اسلم عمادی :ارباب ادب کی نظر میں

مرتب: ڈاکٹر جاوید انور (جاوید انور)

صفحات:240، قیمت:500 روپے، سنہ اشاعت:2025

مطبع: قاسمی کتب خانہ، ای 92، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی۔ 25

مبصر: ساجد عبید، بی 1، چوتھی منزل، اولڈ جسولہ ولج، نزد اپیڈو کیٹ کمپاؤنڈ، نئی دہلی۔ 25

'اسلم عمادی: ارباب ادب کی نظر میں' ڈاکٹر جاوید احمد (جاوید انور) کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں اسلم عمادی کے تعلق سے اہم سوال اٹھایا گیا ہے کہ اتنی اعلیٰ شاعری کرنے والا شاعر جس کو صنف نظم و غزل پر یکساں قدرت حاصل ہے اور ایسا ناقد جس کے تنقیدی مضامین کو دیکھتے ہوئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نظم و نثر میں اس قسم کی مجموعی صلاحیت جو اسلم عمادی کو سلیم احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے فنکاروں کی صف میں شامل کرتی ہے، اردو دنیا میں اس طرح کی پذیرائی سے محروم کیوں ہوئی جو سلیم احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کے حصے میں آئی۔ مرتب نے اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسرے کئی ادیب و شاعر جن پر کسی سبب سے اہل ادب نے ان کی وہ پذیرائی نہیں کی جن کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، ان میں ایک اسلم عمادی بھی ہیں۔ مرتب کے مطابق ان کی تحریروں کو نظر انداز نہیں کیا گیا جس کے ضامن ان پر لکھے گئے مضامین ہیں جو پوری اردو دنیا کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کو وہ مقام و مرتبہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ ڈاکٹر جاوید احمد (جاوید انور) نے اپنے ان خیالات کے مدنظر ہی اسلم عمادی پر کتاب مرتب کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے عملی جامہ پہنایا۔ انھیں امید ہے کہ یہ کتاب اسلم عمادی کے اردو ادب میں ان کے مقام کے تعین میں اہم کردار ادا کرے گی۔

تقریظ کے بعد کتاب میں پہلا مضمون مضطر مجاز کا بہ عنوان 'اسلم عمادی۔ درونی خلش کا پیکر تراش شاعر' ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اسلم عمادی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے پہلے ہی فن پارے سے تلا تلا کر ہی سہی مگر اپنی زبان میں بات کی، کسی کی آواز میں اپنی آواز ملانے کی کوشش نہیں کی۔ تعلیم و تدریس کو دیکھیے تو انجینئری کے میکانیکل شعبے کا تربیت یافتہ (بی ای میکانیکل) جس کی شاعری سے دور کی بھی رشتے داری نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ دفع الوقتی کے لیے کچھ شعر کہہ لیے اور مشاعرے پڑھ لیے کہ کچھ واہ واہ ہو جائے۔ اسلم نے شاید نصف درجن مشاعرے بھی نہیں پڑھے ہوں گے۔ جب کہ بائیس برسوں میں اس کے چار اچھے خاصے ضخیم مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نیا جزیرہ اجنبی پرندے، اگلے موسم کا انتظار اور قریہ فکر، ان مجموعوں کے ناموں ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا تخلیق کار اپنے آپ کو کسی نئے ہی جزیرے میں دیکھ رہا ہے، جہاں کے پرندے بھی اجنبی ہیں، جہاں کا موسم بھی زیادہ سازگار نہیں اور اسے اگلے سازگار موسم کے انتظار میں اپنی فکر کے چھوٹے سے قریے میں پڑاؤ ڈالے رہنا ہے۔ انجمنوں محفلوں اور مشاعروں سے دور اجنبی ماحول اور غیر ممالک میں رہتے ہوئے اسلم نے اپنی شمع سخن کی لو کو دونوں ہاتھوں سے بچائے رکھا۔

مضطر مجاز کے بعد 'اسلم عمادی: نئی راہوں کے نقیب و امین' کے عنوان سے میمونہ چوگلے کا مضمون ہے جس میں اسلم عمادی کا مختصر تعارف کراتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلم عمادی پیشے سے انجینئر ہیں لیکن شعری محاسن سے بھرپور آشنائی رکھتے ہیں۔ دلی کیفیات و آگہی کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے فن پر ان کی دسترس ہے۔ ان کے کلام میں پاکیزگی اور صالحیت و مثبت تعمیری لب و لہجہ نمایاں ہے۔ روایتوں سے استفادہ تو وہ کرتے ہیں لیکن سائنسی فہم و ادراک کے شعور نے ان کی شاعری کو جو نیا انداز عطا کیا ہے وہ ان کے پہلے مجموعہ کلام 'نیا جزیرہ' سے ان کے چوتھے مجموعہ کلام 'قریہ فکر' تک قائم و دائم ہے۔ غزل کے وسیع میدان میں اسلوبیات لفظیات اور موضوعات کی کافی اہمیت ہوتی ہے، ان کا اسلوب بیان معتدل اور نکھرا ستھرا لب و لہجہ متانت سنجیدگی اور توازن ان کے کلام کے جوہر ہیں، کلاسیکی شاعری سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن ان میں تازہ کاری پیدا کی ہے۔ اپنے عہد کی خارجی کیفیات اور مشاہدات سے گہری فکر کے اظہار نے نیا رخ اور ایک نیا زاویہ ان کی شاعری کو عطا کیا ہے۔ اس لیے کویت کے شاعروں میں ان کی ایک الگ پہچان ہے۔

میمونہ علی چوگلے کے بعد عامر قدوائی، مناظر عاشق ہرگانوی، شمس الرحمٰن فاروقی، ہمایوں اشرف، حبیب الرحمٰن، کوثر صدیقی، رضوان احمد فاروقی اور رضیہ عابد سمیت دیگر اہم قلم کاروں نے اپنے اپنے انداز میں اسلم عمادی کی خدمات کا ذکر کیا ہے جس سے نہ صرف اسلم عمادی کے تعلق سے معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تقریظ میں مرتب کا جو شکوہ ہے وہ بجا ہے۔ ہم عصر اکابرین کے خطوط و آرا، متفرق اہم آراء، خاص مصاحبے، شخصیت کی جھلک (احباب کے متفرق تاثرات) اور اسلم عمادی کی نمائندہ تحریروں سے کتاب کا حسن بڑھ گیا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اہل علم حضرات کو یہ کتاب پسند آئے گی۔ ■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

'نوجوانوں کے خوابوں کا ہندوستان قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں

نئی دھلی: نوجوانوں کے خوابوں کے ہندوستان میں بنیادی طور پر جامع ترقی وخوشحالی شامل ہے، یعنی ایسی ترقی جس میں سماج کے تمام طبقات شامل ہوں۔ ان خیالات کا اظہار نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے چیئرمین پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے نے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'نوجوانوں کے خوابوں کا ہندوستان: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں' کے عنوان سے پینل ڈسکشن میں صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کے مسابقتی دور میں نوجوانوں نے کہا کہ کسی بھی ملک کی ہمہ جہت ترقی تبھی ممکن ہے جب وہ معاشی اعتبار سے خوشحال، سماجی سطح پر جامع اور ثقافتی اعتبار سے وائبرنٹ ہو۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت پورے ملک میں کالج، یونیورسٹی اور اسکول کی سطح پر کروڑوں بچے انرولڈ ہیں، جن کی معیاری تعلیم وتربیت پر ہی ہمارے قومی مستقبل کا انحصار ہے، اس لیے ہمیں نسلِ نو کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ملک کی ترقی کے تئیں ان کے اندر غیر معمولی حساسیت وفعالیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

کو ایک دو موضوع میں مہارت کے ساتھ مختلف موضوعات کی جانکاری حاصل کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر ملند سدھاکر نے نوجوانوں کو ہمیشہ سیکھتے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ وزیر اعظم نریندر مودی جی کی قیادت میں تشکیل پانے والی نئی تعلیمی پالیسی میں وکست بھارت کے تمام ممکنہ عوامل کو ملحوظ رکھا گیا ہے جنھیں روبہ عمل لانا خاص طور پر ہمارے تعلیمی اداروں، ان کے ذمے داران اور اساتذہ وطلبہ کی ذمے داری ہے۔

اس سے قبل پروگرام کے آغاز میں شال پیش کرکے معزز مہمانوں کا استقبال کیا گیا اور استقبالیہ کلمات کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے پیش کیے۔ مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نوجوان کسی بھی ملک کی تعمیر وترقی میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور ہمارے پرائم منسٹر عزت مآب نریندر مودی نے وکست بھارت کا جو وژن دیا ہے، اس میں بھی نوجوانوں کا خاص کردار ہوگا۔ انھوں

مہمان خصوصی اور بین المذاہب ہم آہنگی فاؤنڈیشن کے سربراہ خواجہ افتخار احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ وکست بھارت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ہمارے پاس بائیس سال کا عرصہ ہے، جس میں ہمیں ہر ممکن اجتماعی، انفرادی وادارہ جاتی کوششیں کرنی ہوں گی۔ انھوں نے کہا کہ آج کا ہندوستان خوابوں سے بھرا ہوا ہے اور وہ خواب ہے ہر شعبے میں ہندوستان کو نمبر ایک بنانے کا، جس کے لیے ہمیں متحرک نوجوانوں کی خاص ضرورت ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کیجیے اور اسے کسی بھی مرحلے میں کم نہ ہونے دیجیے، ہمارا ملک مواقع سے بھرا پڑا ہے، ان سے فائدہ اٹھا کر ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کیجیے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے سابق چانسلر فیروز بخت احمد نے

اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں نئی نسل کو معلومات سے لیس کرنے کے ساتھ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئے ہنر سے آراستہ کرنے پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا، ممبئی سے وابستہ مشہور انگریزی صحافی محمد وجیہ الدین نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی نوجوانوں کو سپنے بننے کی تلقین کرتی، نئی تبدیلیوں، تکنیکی ترقیات سے ہم آہنگی سکھاتی، جدید اسکلز سیکھنے پر زور دیتی اور مستقبل کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ ڈاکٹر سید مبین زہرا (ایسوسی ایٹ پروفیسر، آتما رام سناتن دھرم کالج، دہلی یونیورسٹی) نے اپنی تقریر میں کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں نوجوانوں کے خوابوں کی تکمیل کا وافر سامان مہیا کیا گیا ہے اور انھیں موجودہ زمانے میں ضروری علوم کے حصول کی نہ صرف ترغیب دی گئی ہے بلکہ اس کے مختلف آپشنز بھی دیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی وکست بھارت کے منصوبے کے حصول کا بھی راستہ بتاتی ہے، انڈسٹری اور اکیڈمک کے بیچ کے فاصلے کو دور کرتی ہے اور تعلیمی شعبے کو درپیش چیلنجز کو بھی بخوبی دور کرتی ہے۔

اس موقعے پر معزز مہمانوں کے ہاتھوں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کو سامنے رکھتے ہوئے، نئی نسل کے لیے قومی اردو کونسل سے شائع کی گئیں چھ کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا، جن میں باتونی روما (ڈاکٹر شہناز رحمٰن)، چائے بگان کا کنول (ڈاکٹر سلمان عبدالصمد)، رومی کے سہانے دن (ڈاکٹر توصیف بریلوی)، وطن کا سچا سپاہی مظہرالحق (نہاں رباب)، گول گھر کی سیر (نثار احمد) شامل تھیں۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر فیضان الحق نے کی اور نہاں رباب کے اظہارِ تشکر کے ساتھ اس کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اہل علم و دانش اور طلبہ و طالبات کی خاصی تعداد موجود رہی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2025

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں ہندی پکھواڑا کے تحت مسابقہ مضمون نگاری

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں 'ہندی پکھواڑا' کی مناسبت سے 23 ستمبر 2025 کو ہندی زبان میں مسابقہ مضمون نگاری کا انعقاد کیا گیا، جس میں کونسل کے مختلف شعبوں سے 12 ملازمین نے حصہ لیا۔ آج اس مقابلے کے نتائج کا اعلان کیا گیا، جس میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والوں کے علاوہ دو شرکا کو تشجیعی انعامات سے بھی نوازا گیا۔ تشجیعی انعام کی شکل میں فیضان الحق اور منیت کمار کو پانچ سو روپے نقد اور توصیفی اسناد دی گئیں، جبکہ پرتیک نے پہلی، شمیم عالم نے دوسری اور دشینت پنڈت نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ تینوں کو بالترتیب تین ہزار، دو ہزار اور ایک ہزار روپے کے ساتھ توصیفی اسناد سے بھی نوازا گیا۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ زبانیں صرف اظہار کا ذریعہ نہیں ہوتیں بلکہ دلوں کو جوڑنے اور رشتوں کو مضبوط کرنے کا اہم فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندی سمیت ہندوستان کی تمام زبانیں ہماری مشترکہ تہذیب و ثقافت کی پہچان ہیں اور ان سب کا تحفظ اور فروغ ہماری ذمے داری ہے۔

اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ ہندی کے پروفیسر رحمٰن مصور نے ہندی زبان کی قانونی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دستور نے 1949 میں ہندی کو راج بھاشا کے طور پر اپنایا تھا۔ انھوں نے راج بھاشا اور راشٹر بھاشا کے فرق پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہندی کو مشکل زبان سمجھنا محض غلط فہمی ہے، اسے سیکھنا اور بولنا نہایت آسان ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبانوں کو زندہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان کے ذریعے ہم اپنی ثقافت و روایت سے جڑتے ہیں۔

تقریب میں ہندی مترجم نوشاد احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر، اکیڈمک) کے اظہارِ تشکر کے ساتھ تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی گورننگ کونسل کے رکن جناب محمد عبدالستار، ڈاکٹر سید ظفر اسلم، ڈاکٹر منور حسن کمال، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم اور کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2025

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'ویر ساورکر اور تقسیمِ ہند کا المیہ' کا اجرا

نئی دهلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام وزیر اعظم میوزیم، تین مورتی مارگ، نئی دہلی میں Veer Savarkar: The Man Who Could Have Prevented Partition کے اردو ترجمہ 'ویر ساورکر اور تقسیمِ ہند کا المیہ' کی تقریبِ اجرا و مذاکرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر صدارتی خطاب کرتے ہوئے وزیر مملکت برائے قانون و انصاف (آزادانہ چارج) و پارلیمانی امور شری ارجن رام میگھوال نے کہا کہ ویر ساورکر ایک بڑے مجاہد آزادی تھے جنھوں نے اس ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا اور طویل عرصے قید و

بند کی صعوبتیں برداشت کیں، آج ہم ایسی ہی شخصیات کی قربانیوں کی بدولت آزاد بھارت میں سانس لے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ویر ساورکر قومی ایکتا و اکھنڈتا کے تئیں نہایت حساس تھے اور اسی وجہ سے وہ تقسیمِ ہند کے شدید مخالف تھے، اگر ان کے وژن اور منصوبے پر عمل کیا جاتا تو ملک کو ٹوٹنے سے بچایا جاسکتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد ایک خاص مقصد کے تحت ویر ساورکر کو بدنام کرنے کی کوششیں کی گئیں، ان کے افکار و نظریات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا جو کہ نہایت افسوسناک تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آج پورے ملک میں ویر ساورکر جی کے افکار و نظریات کو سمجھنے کی سنجیدہ کوششیں شروع ہوئی ہیں، شری اودے ماہور کر جی اور شری چراپو پنڈت جی کی کتاب اسی سلسلے کی سنہری کڑی ہے جس کے اردو ترجمے کا آج اجرا کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں اس کتاب کی اشاعت سے ہمارے مسلم بھائیوں بہنوں اور اردو جاننے والوں تک بھی یہ کتاب پہنچے گی اور اس کے مطالعے سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ میں اس کتاب کے مترجم پروفیسر مظہر آصف جی اور ڈاکٹر مسعود عالم جی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس ترجمے کی اشاعت پر قومی اردو کونسل اور اس کے ڈائنامک ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کو خاص طور پر دلی تہنیت پیش کرتا ہوں جو پورے ملک میں اردو کے پرچار پرسار کے ساتھ نئی نسل کو جدید تکنیکی تعلیم سے بھی جوڑنے کے لیے کوشاں ہیں۔

مہمانِ اعزازی اور کتاب کے مصنف شری اودے ماہور کر جی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ویر ساورکر کے حوالے سے سچی اور غیر جانبدارانہ معلومات پیش کی گئی ہیں اور ان تمام غلط فہمیوں کو تاریخی حقائق کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مخصوص سیاسی نظریے کے تحت پھیلائی گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قومی اتحاد اور ملک کی خوشحالی و ترقی کے بارے میں ویر ساورکر کے جو نظریات تھے، ان پر عمل کر کے ہم وشوگرو بن سکتے ہیں اور ساتھ ہی داخلی و خارجی چیلنجز کا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں پختہ دلائل کی روشنی میں ساورکر کے ہندوتو کے نظریے کا جائزہ لینے کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق سے ان کی اصل فکر کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ

ساورکر قومی جدوجہد میں حصہ لینے والے تمام انقلابیوں اور مجاہدینِ آزادی کا احترام کرتے تھے اور اس ملک کی ہمہ گیر ترقی کے سفر میں مسلمانوں سمیت تمام سماجی طبقات کی شمولیت کو نہایت ضروری سمجھتے تھے۔

اس سے قبل استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ قومی اردو کونسل وزارتِ تعلیم کے تحت سرگرم قومی سطح کا ادارہ ہے، جو پورے ملک میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے مختلف اسکیمیں چلا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل مختلف ادبی، سماجی، طبی و سائنسی موضوعات پر اب تک دو ہزار سے زائد ٹائٹلس شائع کر چکی ہے جن میں بہت سی اہم کتابوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ 'ویر ساورکر اور تقسیمِ ہند کا المیہ' بھی اسی اسکیم کے تحت شائع کی گئی ہے، جو اردو لٹریچر میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یہ نہ صرف کونسل کے لیے بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے ایک اہم موقع ہے، کیوں کہ اب تک اردو زبان میں ویر ساورکر پر مستند اور غیر جانبدارانہ حقائق پر مبنی کتاب کی شدید کمی محسوس کی جا رہی تھی، جسے قومی اردو کونسل نے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو آبادی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرے گی اور آزاد ہندوستان کے غیر جانبدارانہ تاریخی بیانیے اور تحقیق و تفتیش پر مبنی جہت سے آگاہی حاصل کرے گی۔

مہمانِ اعزازی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر اور کتاب کے مترجم پروفیسر مظہر آصف نیا اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب ویر ساورکر جی کی شخصیت اور قومی ترقی و اتحاد کے ان کے وژن کا دقیق و مبسوط جائزہ پیش کرتی ہے اور اپنے مشمولات کے اعتبار سے یہ ایک جامع اور دلچسپ کتاب ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ویر ساورکر کے تعلق سے پھیلائے گئے تمام مغالطوں کا دلائل و شواہد کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے جن سے ہر ہندوستانی کو واقف ہونا چاہیے۔

کتاب کے شریک مصنف شری چراپو پنڈت اور شریک مترجم ڈاکٹر مسعود عالم نے بھی اظہارِ خیال کیا اور اس موقعے پر تمام مہمانوں کا شال، مومنٹو اور کتابیں پیش کر کے استقبال کیا گیا۔ پروگرام میں کثیر تعداد میں دانشوران، جامعات کے اساتذہ، میڈیا اہلکار، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 اکتوبر 2025

قومی اردو کونسل میں ڈاکٹر قاسم خورشید کی رحلت پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: اردو کے مشہور شاعر، ادیب و فکشن نگار ڈاکٹر قاسم خورشید کی غیر متوقع رحلت پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے

پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ قاسم خورشید صاحب کی رحلت میرا ذاتی سانحہ ہے، کیوں کہ میرے ان سے نہایت گہرے اور خالص دوستانہ روابط تھے۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً روزانہ میری ان سے بات ہوتی تھی اور وہ ذاتی امور کے علاوہ مختلف ادبی موضوعات پر بڑی دلچسپی سے تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ قاسم خورشید ایک ہمہ جہت صلاحیت کے حامل تخلیق کار تھے اور اردو و ہندی دونوں زبانوں میں انھوں نے کہانیاں لکھیں، یہی وجہ ہے کہ انھیں دونوں حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے ان کی مختلف النوع خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کونسل سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا اور یہاں سے ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں، فی الحال وہ ہمارے ماس میڈیا پینل کے ممبر بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایسے مخلص اور بافیض شخص کا یوں اچانک ہمارے بیچ سے اٹھ جانا تمام علمی و ادبی حلقوں کے لیے سخت تکلیف دہ حادثہ ہے اور ہم ان کے جملہ پسماندگان و اہلِ خانہ کو دلی تعزیت پیش کرتے ہیں۔

اس موقعے پر ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے بھی مرحوم کی ادبی خدمات اور شخصیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ڈاکٹر قاسم خورشید نہایت اچھے ادیب ہونے کے ساتھ بہت با اخلاق اور ملنسار انسان بھی تھے، ان کا یوں اچانک رخصت ہونا ہم سب کے لیے سخت المناک حادثہ ہے۔ اس موقعے پر کونسل کی گورننگ کونسل کے رکن جناب محمد عبدالستار، ڈاکٹر سید ظفر اسلم اور ڈاکٹر منور حسن کمال سمیت کونسل کا سارا اسٹاف موجود رہا اور ڈاکٹر قاسم خورشید کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2025

قومی اردو کونسل کے اشتراک سے

قومی اردو کونسل اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز غالب سمینار

نئی دہلی: ایوانِ غالب، نئی دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سمینار کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس موقعے پر علمی و ادبی شخصیات نے تحقیق کی اہمیت اور اردو تحقیق کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ تحقیق ایک نہایت مشکل اور نازک فن ہے، ہر شخص اس کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ انھوں نے کہا کہ آج کل جامعات میں ہونے والی سندی تحقیق کے معیار میں نمایاں گراوٹ آئی ہے، اس لیے تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ان کے مطابق ادب کا دائرہ وقت کے ساتھ وسیع ہوا ہے اور تحقیق کے طریقہ کار میں بھی تبدیلی آئی ہے، اس لیے ریسرچ اسکالرز کو بھی جدید تقاضوں کے مطابق خود کو بدلنا ہوگا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو اسکالر جب تک ملٹی ڈسپلنری رجحان کا حامل نہیں ہوگا تب تک وہ معیاری تحقیق نہیں کرسکے گا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق (پروفیسر ایمریٹس، دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ اردو ادب میں بہت سے ایسے اہم پہلو ہیں جن پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو تحقیق کے معیار میں جو گراوٹ آئی ہے اس کے لیے جامعات کے اساتذہ ذمے دار ہیں۔ وہ ریسرچ اسکالرز کو کوئی بھی موضوع دے دیتے ہیں کہ اس پر ریسرچ کرو، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اسکالر کو اس موضوع سے دلچسپی ہے یا نہیں، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اساتذہ طلبہ کو ایسے موضوعات فراہم کریں جن سے انھیں دلچسپی ہو اور واقعی اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت ہو، تبھی بہتر اور معیاری تحقیقات سامنے آسکیں گی۔

افتتاحی تقریر کرتے ہوئے جناب خواجہ محمد شاہد (سابق پرو وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کی ذمے داری ہے کہ وہ محنت، لگن اور جذبے کے ساتھ تحقیق کریں، تبھی تحقیق کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل تحقیق کی تعداد تو بڑھ رہی ہے لیکن سنجیدگی اور محنت کا فقدان ہے، اسی وجہ سے موجودہ تحقیقات سے لوگوں کے علم میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہی کوئی نئی چیز سامنے آرہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جامعات سے باہر بھی اردو میں اعلیٰ تحقیقی کام ہوئے ہیں، خصوصاً مالک رام اور رشید حسن خان جیسے محققین نے صرف اپنے ذوق وشوق کی بنیاد پر عمدہ تحقیق پیش کی ہے، آج کے ریسرچ اسکالرز کو ان سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ (سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ تحقیق کا میدان بے حد وسیع ہے اور موجودہ وقت میں سنجیدہ و معیاری تحقیق ناگزیر ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کے طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے فارسی زبان کے بنیادی قواعد کا علم ہونا چاہیے، تبھی وہ اشعار کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج کل کے ریسرچ اسکالرز کا لغات کی طرف رجوع کم ہوا ہے، حالانکہ لغات کی غیر معمولی اہمیت ہے، ان سے استفادے کو معمول بنایا جائے تاکہ زبان و بیان میں کسی قسم کی غلطی نہ ہو۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر ادریس احمد (ڈائریکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ) نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سمینار کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سمینار اب غالب انسٹی ٹیوٹ کی شناخت بن چکے ہیں۔

افتتاحی اجلاس کے بعد دو تکنیکی اجلاس بھی ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر فاروق بخشی (سابق صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے کی۔ ثوبیہ صدیقی (ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی) نے 'ولایت جعفری بحیثیت افسانہ نگار'، درخشاں (ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'شوکت حیات کا افسانہ 'وبا' ایک تجزیاتی مطالعہ'، نکہت زہرا (ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی) نے 'فروغ فرخزاد کے کلام میں سماجی مسائل کی صدائے بازگشت' اور عبداللہ (ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)

نے 'اتر پردیش کے اردو اداروں کی علمی و ادبی خدمات: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' کے عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت سید انوار صفی نے کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر چندر شیکھر (سابق صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ نادیہ خان (شعبہ اردو دین دیال اپادھیائے گورکھپور یونیورسٹی) نے 'مشرقی یو پی کا گمشدہ ستارہ ہندی گورکھپوری'، ذبیح اللہ آزاد (شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی) نے 'مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات اور ترجمان القرآن کا مختصر جائزہ'، محمد اسلم آزاد (شعبہ اردو و فارسی ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا) نے 'حسین الحق ایک عہد ساز افسانہ نگار' اور مہر النساء (پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ) نے 'بستی اور پنجر ہجرت، ناسٹلجیا اور تاریخی شعور کا تجزیہ' پر مقالات پیش کیے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام، سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سمینار کے دوسرے دن ملک و بیرون ملک کے طلبا نے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ دوسرے دن چار اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ بہت سے قول اس طرح مشہور ہو جاتے ہیں کہ ہم ان کی صداقت پر شبہ نہیں کرتے۔ ایسا ہی ایک قول یہ ہے کہ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی ہے۔ حالانکہ یہ قول غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تنقید ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات تمام و کمال کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ہر بات نامکمل ہے اور آئندہ نسل اس میں اضافہ کرتی ہے۔ اس جلسے میں محترمہ نورصبا، محترمہ تزکیہ عذرا، جناب عرفان عارف، جناب محفوظ عالم اور جناب فیضان احمد نے مقالات پیش کیے۔ اس جلسے کی نظامت جناب ذبیح اللہ نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خالد علوی نے کی۔ اپنی گفتگو میں انھوں نے کہا تحقیق میں حق گوئی پہلی شرط ہے۔ مثلاً اگر آپ کا مقالہ کسی شخصیت پر ہے تو یہ لازمی نہیں کہ آپ اس شخصیت میں وہ محاسن بھی پیدا کر لیں جو اس میں نہیں تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس اجلاس میں کچھ مقالے ایسے سامنے آئے جن میں تحقیق کے تقاضوں کو بخوبی برتا گیا تھا۔ اس اجلاس میں محترمہ عائشہ حسن، جناب محمد رکن الدین، جناب محمد منتظر عالم، جناب محمد ساجد اور جناب احمد رضا نائیک نے مقالات پیش کیے اور محترمہ سیمیں فلک نے نظامت کا فریضہ انجام دیا۔ پانچویں اجلاس کی صدارت پروفیسر پرویز احمد نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ میں آج بہت جذباتی ہو رہا ہوں۔ کیونکہ آج سے 22 سال پہلے میں نے یہاں پر بحیثیت ریسرچ اسکالر مقالہ پیش کیا تھا اور آج اسی سمینار کی صدارت کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ اس اجلاس میں محترمہ بی بی عائشہ صدیقہ علی محمد (ماریشس) نے شریک ہو کر مقالہ پیش کیا جبکہ محترمہ بی روزیدہ مارائی (ماریشس)، ڈاکٹر علی خاں دوشنبہ (تاجکستان)، محترمہ ماہیرہ امار وا، جناب شاہجہاں (ازبکستان) اور پیرزادہ محمد زاہد (کشمیر) نے آن لائن شریک ہو کر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب شاہنواز خان نے کی۔ اس دن کے چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری اور ڈاکٹر مہتاب جہاں نے کی۔ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا اس طرح کے سمینار تربیت گاہ ہیں لیکن طلبا کی پہلی تربیت گاہ ان کا شعبہ ہے۔ کسی سمینار میں شریک ہونے سے پہلے اپنے اساتذہ سے اصلاح ضرور لینی چاہیے۔ اگر کوئی مقالہ کسی خاص عہد کو کور کرتا ہو تو سنہ کی حد بندی میں منطقی جواز ہونا چاہیے اور جب حد قائم ہو گئی تو جو فنکار اس سے باہر ہے اس کو شامل نہیں کرنا چاہیے خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر مہتاب جہاں نے صدارتی تقریر میں کہا تحقیق ایک جاری سفر ہے محقق اپنے طور پر حقائق تلاش کرتا ہے لیکن اگلا محقق اس پر اضافہ کرتا ہے۔ اس سے پہلی تحقیق پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ ادبی تاریخ اس کو ایک تسلسل کے طور پر دیکھتی ہے۔ اس اجلاس میں محترمہ صبا نعیم، محترمہ شیریں فاطمہ، جناب محمد فرید، جناب شیخ شام عرفات، محترمہ نور افساں اور جناب اعجاز احمد نے مقالات پیش کیے اور نظامت کا فریضہ جناب محمد رضوان خاں نے انجام دیا۔

سمینار کے آخری دن چار تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابوبکر عباد نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا میں اکثر کہتا ہوں کہ ہر نئی نسل پچھلی نسل سے زیادہ ذہین ہوتی ہے۔ یہ حقائق پر سوال قائم کرتی ہے اور ان کے جواب بھی اپنے طور سے تلاش کرتی ہے۔ اس کی ایک جھلک ہمیں اس اجلاس کے مقالوں میں بھی نظر آئی۔ مجھے خوشی ہے کہ نئی نسل حقائق کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس اجلاس میں جناب نوید رضا، جناب محمد فیصل خان، جناب محمد سلطان، جناب محمد گل نواز ربانی اور جناب محمد ابصار نے مقالات پیش کیے اور جناب سیف اظہر نے نظامت کے فرائض ادا کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا سمینار میں مقالہ پیش کرنا جس طرح تربیت کا حصہ ہے اسی طرح مقالہ سننا بھی تربیت میں شامل ہے۔ سمینار میں اگر پوری تحقیق کا خلاصہ پیش کیا جائے گا تو یہ بہتر صورت نہیں ہے۔ کسی ایک گوشے کو مرکز توجہ بنا کر اس پر گفتگو کرنا یہ زیادہ مفید نتائج پیش کر سکتا ہے۔ اس اجلاس میں جناب عبدالعلیم، جناب خضر احمد، جناب صدام حسین، جناب محمد رضوان خان اور محترمہ تبسم کوثر نے مقالات پیش کیے اور محترمہ صائمہ ثمرین نے نظامت کا فریضہ ادا کیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید کلیم اصغر نے کی، صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال ریسرچ اسکالر سمینار کے ذریعے طلبا کو ایک موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ ہندستان کی بہت سی یونیورسٹیز کے اسکالرس سے ملیں اور ان کی گفتگو سے فائدہ اٹھائیں۔ اس اجلاس میں جناب حفیظ الرحمٰن، جناب محمد مدثر اور محترمہ زینب رحمٰن نے مقالات پیش کیے اور نظامت کا فریضہ محترمہ خوشبو پروین سے وابستہ رہا۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا میں نے آج کے تمام اجلاس میں شرکت کی اور کسی حد تک اطمینان ہوا کہ اردو فارسی تحقیق کا یہ کارواں کسی حد تک منزل سے لگ جائے گا۔ میں نے کئی ایسے اساتذہ کو دیکھا ہے جن کا مطالعہ تو بہت تھا لیکن انتشار کی وجہ سے وہ کوئی قابل قدر کام نہ کر سکے۔ اپنے طلبا سے گزارش ہے کہ اپنے تخصص کے لیے کوئی گوشہ ضرور منتخب کریں۔ اس اجلاس میں جناب فرحان بیگ، جناب غلام علی، محترم نکہت، محترمہ عنب شمیم، جناب امتیاز احمد نے مقالات پیش کیے اور نظامت جناب زبیر خان سعیدی نے کی۔ سمینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر نے تمام مقالہ نگار، صدور، ناظم اور شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس مرتبہ کئی مقالات بہت اچھے سامنے آئے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آئندہ بھی آپ حضرات کثیر تعداد میں سمینار میں شرکت کریں گے۔ سمینار میں ریسرچ اسکالرس کے علاوہ دہلی کے ممتاز اساتذہ اور علم دوست شخصیات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

پریس ریلیز: رابطۂ عامہ سیل 19 ستمبر 2025، اور غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 22 ستمبر 2025

اردو صحافیوں کے لیے قومی صلاحیت سازی ورکشاپ

حیدر آباد: 23 ستمبر (پریس نوٹ) اردو صحافیوں کی تربیت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پوری طرح سے سنجیدہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد شمس اقبال، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کیا۔ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں سہ روزہ 'اردو صحافیوں کے لیے قومی صلاحیت سازی ورکشاپ' کے افتتاحی اجلاس میں خطبۂ استقبالیہ دے رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو زبان کا ایک باوقار قومی ادارہ ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس ادارے کے اشتراک سے صحافیوں کے تربیتی پروگرام کو منعقد کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بدلتے ہوئے زمانے کے چیلنجز سے سامنا کرنے کی صلاحیت اردو صحافیوں میں بھی پروان چڑھانی چاہیے۔ تاکہ وہ بھی دیگر زبانوں کے صحافیوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ ترقی کر سکیں۔

کے تعاون سے آج شروع ہونے والا یہ ورکشاپ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک صحافی کو اصل اور تحقیق شدہ معلومات ہی عوام تک پہنچانی چاہیے۔ کیونکہ خبروں کی صداقت ہی صحافت کی اصل جان ہے۔

مہمانِ اعزازی نیوز ایڈیٹر سیاست عامر علی خان نے اردو یونیورسٹی کو صحافیوں کے لیے تربیتی ورکشاپ منعقد کرنے کے لیے مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافیوں کی صلاحیتوں میں اضافہ اور نکھار پیدا کرنے کے لیے اس طرح کے تربیتی ورکشاپ بڑے مدد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب یہ اردو صحافیوں کی ذمے داری ہے کہ وہ انھیں ملنے والے مواقع سے بھرپور استفادہ کریں۔ انقلاب کے ریسڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر یامین انصاری نے صحافیوں پر زور دیا کہ وہ فیک نیوز کے دور میں خبروں کی صحت کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ ایڈیٹر ان چیف بھارت نیوز

ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے اردو یونیورسٹی کے ساتھ قومی کونسل کے تعاون کو مزید مستحکم کرنے کے لیے اقدامات کا بھی اعلان کیا۔ قبل ازیں پروگرام کے آغاز میں ڈین و صدر شعبۂ ترسیل عامہ و صحافت پروفیسر محمد فریاد نے ورکشاپ کے سبھی شرکا کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ شعبۂ ترسیل عامہ و صحافت قومی کونسل کے تعاون سے ریاست تلنگانہ خاص کر شہر حیدر آباد کے اردو صحافیوں کے لیے اس ورکشاپ کا انعقاد کر رہی ہے۔ جس میں تربیت کے لیے ملک کے ممتاز ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر سید عین الحسن نے کہا کہ پیشۂ صحافت میں جس طرح سے نئے چیلنجز درآئے ہیں ان کا سامنا کرنے کے لیے اردو صحافیوں کو بھی تیار کرنا اشد ضروری ہے اور اسی ضرورت کی تکمیل کی سمت کونسل

ڈاکٹر سرفراز سیفی نے بھی اردو صحافیوں کے تربیتی ورکشاپ کی افتتاحی تقریب کو مخاطب کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کے مشترکہ تہذیب و کلچر کی زبان ہے۔ انھوں نے طلبائے صحافت پر زور دیا کہ وہ صحافت کے میدان میں ہمیشہ فعال رہیں اور اپنے آپ پر جنون طاری کریں۔ صحافیوں کے سہ روزہ تربیتی ورکشاپ کے اس اجلاس میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ترجمان رسالہ 'الکلام' کے 34 ویں شمارے کی رسم اجرا بھی انجام دی گئی۔ افسر تعلقات عامہ و ایڈیٹر ڈاکٹر محمد مصطفےٰ علی سروری نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ الکلام رسالہ میں جہاں صفحات کی تعداد اب 100 تک پہنچ گئی ہے وہیں اس میں یونیورسٹی کی خبروں کے علاوہ یونیورسٹی سے متعلق مختلف موضوعات

پر خصوصی گوشے شامل کیے گئے ہیں۔ پروگرام کے آخر میں پروفیسر احتشام احمد خان نے شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے تکنیکی سیشن میں دی ہندو کے ریسیڈنٹ ایڈیٹر روی ریڈی نے ورکشاپ کے شرکا کو دیہی علاقوں میں رپورٹنگ کے متعلق دلچسپ انداز میں رہنمائی کی۔ دوسرا سیشن بھارت نیوز کے ایڈیٹر ان چیف ڈاکٹر سرفراز سیفی کا منعقد ہوا۔ چائے کے وقفے کے بعد تیسرا سیشن ڈاکٹر محمد مصطفےٰ علی سروری نے فری لانس جرنلزم اور حصول آمدنی کے مختلف ذرائع کے موضوع پر مخاطب کیا۔ جبکہ انقلاب دہلی کے ریسیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر یامین انصاری نے عوامی نقطۂ نظر کی تشکیل میں اردو ایڈیٹرس کا رول کے موضوع پر لیکچر دیا۔

اردو صحافیوں کے لیے جاری سہ روزہ قومی ورکشاپ کے دوسرے دن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے رکن محمد عبدالستار نے کہا کہ میدان صحافت کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیےصحافیوں کو مسلسل سیکھتے رہنا چاہیے۔ ان کے علاوہ جن ماہرین نے اس ورکشاپ کو مخاطب کیا ان میں ٹائمز آف انڈیا سدھا کر ریڈی بھی شامل ہیں۔ فیکٹ چیک کے موضوع پر انھوں نے طلبائے صحافت اور کارگزار صحافیوں کو غلط اور جھوٹی خبروں کی نشاندہی کیسے کریں تفصیل سے بتایا۔ قبل ازیں دوسرے دن کے پروگرام کے آغاز میں صدر و ڈین شعبۂ ترسیل عامہ وصحافت پروفیسر محمد فریاد نے سدھا کر ریڈی کا تعارف پیش کیا اور خیر مقدمی کلمات کہے۔ اس سیشن کی نظامت ریسرچ اسکالر ذاکت علی نے انجام دی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقد ہونے والے اس سہ روزہ ورکشاپ کے دوسرے دن کے دوسرے سیشن میں ڈاکٹر فاضل حسین پرویز، ایڈیٹر گواہ نے شرکا کو مخاطب کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک صحافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نصاب کے علاوہ دیگر علوم کی معلومات حاصل کرے۔ ان کے مطابق صحافیوں کو صحافت کے علاوہ مذہبی و اخلاقی تعلیمات سے بھی واقف رہنا ضروری ہے۔ اس دوسرے سیشن کی نظامت نوشاد حسین، ریسرچ اسکالر نے انجام دی۔ دوسرے دن کا تیسرا سیشن سینئر صحافی ایم اے ماجد کے خطاب کے ساتھ منعقد ہوا۔ انھوں نے کہا کہ ایک صحافی کے لیے میڈیکل، ماحولیات اور سماجی مسائل سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ رپورٹنگ کے دوران ان موضوعات کے ساتھ انصاف کر سکے۔ ان کے مطابق خاص کر صحت عامہ جیسے موضوع پر اردو صحافی توجہ دیتے ہوئے اپنے قارئین کو باخبر رکھ سکتا ہے۔ سینئر صحافی ایم اے ماجد کے مطابق صحافیوں کی ذراسی غلطی قانونی مسائل کا سبب بن سکتی ہے۔ ایسے میں صحافیوں کی تربیت کے لیے اس طرح کے ورکشاپ بڑے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس سیشن میں نظامت کے فرائض ریسرچ اسکالر نصرت پروین نے انجام دیے۔ دوپہر کے وقفے کے بعد دوسرے دن کا پہلا سیشن معروف صحافی اسد کمال لاری نے لیا۔ ورکشاپ کے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ صحافیوں کو روزانہ کی بنیاد پر ڈائری لکھنے کا معمول اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں نئے الفاظ، نئی معلومات اور خبریں بھی درج کی جاسکتی ہیں۔ اس سیشن کی نظامت ریسرچ اسکالر شہواد نے انجام دی۔ دوپہر کے بعد میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں پروفیسر احتشام احمد خان نے ڈاٹا جرنلزم کے موضوع پر شرکا کو مخاطب کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاٹا جرنلزم کا مؤثر استعمال کرتے ہوئے خبروں کی پیش کشی کو دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ اس سیشن کی نظامت ریسرچ اسکالر شاہد پال نے انجام دی۔

وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں سہ روزہ 'اردو صحافیوں کے لیے قومی صلاحیت سازی ورکشاپ' کے اختتامی اجلاس میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کہا کہ وقت کے ساتھ زبان کا لہجہ اور انداز بدلتا رہتا ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اردو زبان کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ انھوں نے صحافیوں پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ اردو صحافت کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے مزید تقویت دیں۔

اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر ناگیدر کمار، ڈائرکٹر، ایم جی کے وی پی، وارناسی نے اردو زبان کے فروغ اور دینک جاگرن کے کردار کو نمایاں کرتے ہوئے کہا کہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو آج بھی ایک زندہ اور اثر انگیز زبان ہے۔ یامین انصاری، ریسیڈنٹ ایڈیٹر، انقلاب، نئی دہلی نے ورکشاپ کے انعقاد کو قابلِ تحسین قرار دیا جبکہ اسد کمال لاری، سابق ایڈیٹر، جن سندیش ٹائمز، وارناسی نے کہا کہ شعبہ ترسیل عامہ میں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان جو مضبوط تعلق دیکھا گیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر فریاد نے اپنے خطاب میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انہی کی سرپرستی اور رہنمائی کے باعث اس نوعیت کے پروگرام ممکن ہو سکے ہیں۔

آخری دن ڈاکٹر مصطفیٰ علی سروری نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے تمام مہمانانِ گرامی کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ اس ورکشاپ سے حاصل ہونے والا علم اور تربیت طلبہ کی صحافتی زندگی میں کارآمد ثابت ہوگا۔ بعد ازاں طاہر قریشی، اسسٹنٹ پروفیسر نے ورکشاپ کی مفصل رپورٹ پیش کی۔ ڈاکٹر دانش نے شکریہ ادا کیا۔

ورکشاپ کے پہلے سیشن میں صحافی ڈاکٹر آصف علی روبی ٹی وی نے موبائل جرنلزم پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کووڈ-19 کے دور میں موبائل صحافت کو زبردست فروغ ملا اور اس نے صحافیوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ کسی بھی مقام سے رپورٹنگ کر سکیں۔ جناب سلمان (ریسرچ اسکالر) نے ڈاکٹر آصف علی کا تعارف پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔

دوسرے سیشن میں سینئر صحافی محترمہ وسیم راشد نے اپنے خطاب میں کہا کہ اگر صحافت کو شاعری کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو یہ ایک بڑی انقلابی قوت بن سکتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ چاہے آپ پرنٹ میڈیا سے وابستہ ہوں یا الیکٹرانک میڈیا سے، زبان پر مضبوط گرفت لازمی ہے۔ سعدیہ نجار (ریسرچ اسکالر) نے ڈاکٹر وسیم راشد کا تعارف کرایا اور اس سیشن کی نظامت کی۔ تیسرے سیشن میں پروفیسر فریاد نے شرکا سے فیڈ بیک حاصل کیا تاکہ آئندہ اس نوعیت کے پروگراموں کو مزید مؤثر بنایا جاسکے۔ بعد ازاں انھوں نے مہمانِ مکرم جناب ناگندر کمار سنگھ کا تعارف کرایا۔ جناب ناگندر نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو اور ہندی کا رشتہ چولی دامن کا ہے اور دونوں زبانوں کو ساتھ لے کر چلنا ہی ان کی اصل طاقت ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ علی سروری، پبلک ریلیشنز آفیسر انچارج، حیدرآباد

'سوانح عمری حاجی سمیع اللہ خان بہادر سی ایم جی' کا اجرا و مذاکرہ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے اشتراک سے کونسل سے شائع شدہ کتاب 'سوانح عمری حاجی سمیع اللہ خان بہادر سی ایم جی' کے اجرا و مذاکرے کی تقریب کانفرنس ہال، آئی آئی سی سی میں منعقد ہوئی۔

اس پروگرام میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر جناب سلمان خورشید نے کہا کہ حاجی محمد سمیع اللہ خان بہادر کی سوانح عمری کا مطالعہ اُس دور کے حالات، ماحول اور تہذیب و تمدن کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس طرح کی نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت ناگزیر ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے استفادہ کرسکیں اور ہندوستان کی اس زمانے کی صورتِ حال سے واقف ہوسکیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ امر خوش

آئند ہے کہ حاجی محمد سمیع اللہ خان ایک عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر قانون بھی تھے۔ آج کے زمانے میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے جو مختلف علوم پر دسترس رکھتے ہوں۔

اس سے قبل استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ حاجی سمیع اللہ خان بہادر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ماہر قانون ہونے کے ساتھ مختلف علوم و فنون میں بھی درک رکھتے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سمیع اللہ خان سرسید اور علی گڑھ تحریک کے اہم معاونین میں تھے، بلکہ اے ایم یو تحریک کے لیے ان کی شخصیت بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شخصیت قومی ہمدردی و فکر مندی کے حوالے سے بھی اہمیت کی حامل تھی، ضرورت ہے کہ نئی نسل ایسی شخصیات کی زندگیوں کو مشعلِ راہ بنائے تبھی وہ قوم و ملک کی تعمیر میں مطلوبہ کردار ادا کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ جدید موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے ساتھ کلاسیکی کتابوں کی اشاعت بھی کونسل کے اشاعتی مینڈیٹ میں شامل ہے جس کے تحت یہ بے مثال سوانح عمری شائع کی گئی ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

مہمانِ خصوصی جناب نجیب جنگ (سابق لیفٹیننٹ گورنر دہلی) نے اپنے خطاب میں حاجی محمد سمیع اللہ خان کے خاندانی پس منظر اور علمی کمالات پر روشنی ڈالی۔

انھوں نے کہا کہ مولانا کی سوانح عمری بے حد اہم ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہونا چاہیے تاکہ غیر اردو داں طبقہ بھی ان کی شخصیت اور اس دور کے ہندوستان سے بخوبی واقف ہوسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ علی گڑھ کا علمی و تہذیبی کنٹری بیوشن پوری دنیا میں معروف ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام میں سرسید کے ساتھ مولانا سمیع اللہ خان کا بھی نمایاں کردار رہا ہے، اس لیے ان کا نام اور کام ہمیشہ باقی رہے گا۔

کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی (شعبہ ماس کمیونی کیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کہا کہ مولوی سمیع اللہ کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ اس زمانے کے حالات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب نہایت اہم ہے اور اس کے مطالعے سے کئی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ معروف دانشور ایڈووکیٹ خلیل الرحمٰن نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا سمیع اللہ خان کی شخصیت پر دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔ وہ نہایت فصیح اور ٹکسالی عربی بولتے تھے اور بحیثیت جج ان کے فیصلے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس عظیم اور مقتدر شخصیت کی سوانح عمری کا مطالعہ ہم سب کو ضرور کرنا چاہیے تاکہ ہم ان کی علمی و شخصی عظمت سے روشناس ہوسکیں۔ کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد (سابق پرو وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے کہا کہ اس کتاب کی اہمیت دوہری ہے۔ ایک تو یہ کہ جس شخصیت پر کتاب لکھی گئی ہے وہ خود بے حد اہم اور معروف ہے اور دوسرے یہ کہ اس کتاب کے مصنف بھی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کتاب کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں مولانا کی حیات و شخصیت بیان کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں ان کی تقاریر شامل ہیں۔ ان کے مطابق اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے اُس زمانے کی دہلی اور اس کی تہذیب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس موقعے پر بڑی تعداد میں اہلِ علم اور دانشوران موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 اکتوبر 2025

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

ڈیجیٹل عہد میں تخلیقی شعبوں کی ترقی اور نوجوان ادیبوں کے درمیان مکالمہ

نئی دھلی: نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) اور

روزنامہ'انقلاب' دہلی،26 ستمبر 2025

وزارت خارجہ کے اشتراک سے 25 تا 26 ستمبر دارالحکومت میں شنگھائی تعاون تنظیم (ایس سی او) کے نوجوان ادیبوں کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس دو روزہ اجلاس کا موضوع 'ڈیجیٹل عہد میں تخلیقی شعبوں کی ترقی اور نوجوان ادیبوں کے درمیان مکالمہ' تھا۔ اجلاس میں رکن ممالک کے 40 سال سے کم عمر کے نوجوان ادیبوں، محققین اور دانشوروں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں ادبیات، فنون، موسیقی، اشاعت، سنیما، ریڈیو ٹی وی سمیت مختلف تخلیقی شعبوں پر ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے اثرات پر گفتگو کی گئی۔

افتتاحی اجلاس میں وزیر مملکت برائے امور خارجہ کیرتی وردھن سنگھ نے کہا کہ ایس سی او تعاون کی علامت ہے اور ثقافت و ڈیجیٹل جمہوریت کے امتزاج سے نوجوان تخلیقی شعبے کو نئی سمت دی جاسکتی ہے۔ ایس سی او سکریٹریٹ کی مشیر منارہ رکھانووا نے کہا کہ ہندوستان نوجوان ادیبوں و فنکاروں کو جس طرح پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ اس موقعے پر وزارت خارجہ کے ایڈیشنل سکریٹری آلوک امیتابھ ڈمری، این بی ٹی کے چیئرمین ملند سدھاکر مراٹھے، ڈائریکٹر یوراج ملک اور دیگر معزز شخصیات موجود تھیں۔ مقررین نے زور دیا کہ نئی ٹیکنالوجی تخلیقیت کے لیے معاون ہے، مگر اصل روح انسانی فکر و تخیل ہی رہنی چاہیے۔ کانفرنس کو رکن ممالک کے نوجوان دانشوروں کے مابین ادبی و ثقافتی رشتے مضبوط کرنے اور تخلیقی معیشت کے مستقبل پر بامعنی مکالمے کا ایک اہم پلیٹ فارم قرار دیا گیا۔

مصنوعی ذہانت اور ترجمہ

نئی دھلی: 'عالمی ترجمہ دن' کے موقعے پر ساہتیہ اکادمی نے 'مصنوعی ذہانت اور ترجمہ' کے موضوع پر

'ادبی منظر' کا پروگرام منعقد کیا۔ پروگرام کی صدارت سینئر مترجم سبھاش نیرو نے کی، جب کہ بھاؤنا سکسینہ، نشاط زیدی اور یوگیش اوستھی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ راجدھانی میں موجود راج بھاشا محکمہ، وزارت داخلہ سے بھاؤنا سکسینہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم مکمل طور پر مشینی ترجمے پر انحصار نہیں کر سکتے، ہر ترجمہ کو انسانی لمس سے بہتر بنایا جاسکتا ہے اور مشینیں بھی ہماری رہنمائی سے بہتر ہوسکتی ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شامل ہونے والی مشہور مترجمہ نشاط زیدی نے کہا کہ ہر ترجمہ صرف موجودہ وقت کی ترجمانی کرتا ہے، اس میں ماضی یا مستقبل کی موجودگی شامل نہیں ہوتی، اس لیے ترجمے میں زبان کے مختلف رنگ سامنے آتے ہیں۔ گجراتی مترجم یوگیش اوستھی نے کہا کہ سرکاری کوششوں کے ذریعے اے آئی کے ذریعے ترجمے کی بہتری کے اقدامات کیے جارہے ہیں اور مستقبل میں مشینی ترجمے کی ضرورت مزید بڑھے گی۔ پروگرام کے صدر سبھاش نیرو نے کہا کہ ہم نے اب تک کسی ایپ کا ادبی ترجمے کے لیے استعمال نہیں کیا اور ترجمے کے دوران ہونے والے تجربات کو شیئر کرتے ہوئے بتایا کہ انسانی مترجم ہی درستگی اور باریکی کو محسوس کرسکتا ہے اور اسی کو فروغ دینا ہوگا۔ پروگرام کے اختتام پر حاضرین کے متعدد سوالات کے جوابات دیتے ہوئے مقررین نے کہا کہ مستقبل میں مشینی ترجمے کی ضرورت بڑھتی جائے گی، لیکن اس کو انسانی کوششوں کے ذریعے ہی بہتر اور قابل اعتماد بنایا جاسکتا ہے۔ پروگرام کی میزبانی ساہتیہ اکادمی کے زیر انتظام، معاون سکریٹری دیویندر کمار دیوش نے کی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی،2اکتوبر 2025

غالب اکیڈمی میں نثری نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ماہانہ نثری نشست کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت معروف نقاد و ادیب ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ جو شخص ادب کے مطالعے میں ڈوب جاتا ہے، وہ دنیا کو بھول جاتا ہے کیونکہ وہ

ادب کا شیدائی بن جاتا ہے۔ مشہور افسانہ نگار خورشید حیات نے اپنی کہانی 'جمیلہ' سنائی۔ انھوں نے اپنی کہانی کے ذریعے پرانے اور نئے محاوروں کا حسین امتزاج پیش کیا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ چشمہ فاروقی نے اپنی کہانی 'ہدایت' میں خاندانی حالات کو موضوع بنایا۔ ڈاکٹر شاہد حبیب نے شمالی بہار کے صوفیا کی تاریخ پر مشتمل کتاب 'نسیم شمال' پر تبصرہ پیش کیا اور تصوف سے متعلق اہم نکات کے ساتھ کتاب کے مشمولات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد رضوان نے ہندوستانی فلموں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ 'امراؤ جان' اور 'پاکیزہ' کے ذکر کے بغیر فلموں پر کوئی گفتگو مکمل نہیں ہوسکتی۔ 'دیوداس' میں ہندوستانیت جھلکتی ہے۔ سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، حسرت جے پوری، کیفی اعظمی اور دیگر شعرا نے فلمی دنیا کو لازوال نغمے دیے، جب کہ ساحر لدھیانوی کے نغمے آج بھی مقبولیت کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر ثروت عثمانی نے 'اندھیرا' کے عنوان سے کہانی پیش کی، ڈاکٹر عقیل احمد نے جی ڈی چندن پر مقالہ پڑھا، جب کہ پروین ویاس نے ایک ہندی کہانی سنائی۔ اس نشست میں اظہر زئی، انور خان غوری، بشری کانت کوہلی، کمال الدین، سرفراز احمد فراز، خضر الاسلام، عبادا اور دیگر معزز شخصیات شریک ہوئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 ستمبر 2025

بزم صحافت

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'بزم صحافت' کے عنوان سے خصوصی پروگرام منعقد ہوا جس میں ملک

کے پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ یہ پروگرام بھارت ایکسپریس کی جانب سے منعقد کیا گیا، جس میں ممتاز لیڈران، دانشوروں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت سپریم کورٹ کے سینئر وکیل زیڈ کے فیضان نے کی، جب کہ بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ جگدمبیکا پال، پروفیسر شاہد اختر (قائم مقام چیئرمین، این سی ایم ای آئی)، جامعہ ہمدرد کے رجسٹرار کرنل طاہر مصطفیٰ، صحافی شاہد صدیقی، معصوم مرادآبادی اور دیگر ممتاز شخصیات نے خطاب کیا۔ مقررین نے کہا کہ مولوی محمد باقر کی قربانی آزادیٔ صحافت اور قومی یکجہتی کی لازوال مثال ہے۔ اس موقعے پر 'نیوز مین آف انڈیا' کے نام سے مشہور شفیق الحسن کو ان کی بے لوث خدمات پر خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب میں دہلی کے مختلف اخبارات و میڈیا اداروں کے ایڈیٹروں اور صحافیوں کو بھی مومنٹو اور شال پیش کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ پروگرام بھارت ایکسپریس کے ایڈیٹر ان چیف اپیندر رائے کی سرپرستی میں منعقد ہوا، جس کے کنوینر ڈاکٹر خالد رضا خان اور معاون کنوینر ڈاکٹر نثار احمد خان تھے۔

روزنامہ 'دہلی نامہ'، 18 ستمبر 2025

یک روزہ ریسرچ اسکالرس سمینار

نئی دہلی: غالب اکیڈمی کی جانب سے یک روزہ ریسرچ اسکالرس سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی

یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کے 9 ریسرچ اسکالرز نے حصہ لیا۔ روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے محمد اسد نے 'شمیم حنفی بحیثیت ڈرامہ نگار'، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی لکھنؤ کی فوزیہ سلطانہ نے 'اردو ناولوں میں تیسری جنس کے کرداروں کی عکاسی'، دہلی یونیورسٹی کے محمد سعود رضا نے 'حفیظ عظیم آبادی کی اردو شاعری: ایک مطالعہ'، بریلی یونیورسٹی کی ندا انجم نے 'پریم چند کا راہ رو: مدن گوپال'، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طریق العابدین نے 'وحید اختر کے مرثیہ 'چادر تطہیر' کا تنقیدی مطالعہ'، بریلی یونیورسٹی کے محمد نورعین خان نے 'آزادی کے بعد اہم حادثات و سانحات اور اردو افسانہ'، دہلی یونیورسٹی کی خوشبو پروین نے 'صنف رباعی اور رباعی گو شاعرات'، بریلی کے احتشام الحق نے 'مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ' پر مقالات پیش کیے۔ دہلی یونیورسٹی کے محمد اشرف یاسین نے ادب اطفال اور نیشنل بک ٹرسٹ کی مطبوعات کا جائزہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شاہد حبیب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ریسرچ اسکالرز کو تخلیقی اخلاقیات کو بروئے کار لانا چاہیے۔ دوسرے مہمان ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاب نے اپنی تقریر میں کہا کہ جو نہیں لکھا گیا اس پر لکھا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر شاداب تبسم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مقالہ کو مدلل ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر واحد نظیر نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق وتنقید وتشریح کی بنیاد متن ہے۔ تحقیق میں علم اور تخلیقی شعور کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ رواں سال میں کئی ریسرچ اسکالرس سمینار کا انعقاد ہوا اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ عزہ معین نے نظامت کی اور محمد فرحان نے مقالہ نگاروں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 ستمبر 2025

غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمید کے 117 ویں یوم پیدائش پر جلسے کا انعقاد

نئی دہلی: غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمید کے 117 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر غالب اکیڈمی میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت غالب اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر غزالہ جاوید (اسسٹنٹ ڈائریکٹر (یونانی) اینڈ ٹیکنیکل ہیڈ سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، منسٹری آف آیوش، حکومت ہند نے اپنا خطبہ پیش کرتے

ہوئے کہا کہ حکیم صاحب نے نفرت کے دور میں محبت کا پیغام دیا، تعلیم کو اپنی زندگی کا مشن بنایا اور یونانی میں جدید تعلیم کو شامل کیا۔ 'سرسید ثانی حکیم عبدالحمید' کے عنوان سے پروفیسر انور پاشا کا مضمون ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید اور حکیم عبدالحمید کی فکر میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ دونوں کا مشن اپنی ذات اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہوکر خود کو قوم کے لیے وقف کرنے سے عبارت ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر سلیم قدوائی نے کہا کہ میرے نانا عبدالماجد دریابادی کا حکیم صاحب سے گہرا تعلق تھا وہ دہلی آتے تھے تو حکیم صاحب کے یہاں قیام کرتے تھے۔ اس

موقعے پر ڈاکٹر عقیل احمد نے 'حکیم عبدالحمید کے علمی و ادبی منصوبے' کے عنوان سے ایک مضمون پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ حکیم صاحب نے بہت سارے ادارے قائم کیے اور بہت سے ان کے منصوبے تھے جو ابھی تک پورے نہیں ہوئے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جی آر کنول نے صدارتی تقریر میں کہا کہ حکیم صاحب مصمم ارادہ رکھتے تھے۔ وہ اچھے نباض تھے۔ نئی نئی دوائیں ایجاد کرتے تھے۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے، وہ عید اور ہولی ملن دونوں مناتے تھے۔ اس موقعے پر ہندی اور اردو کے ادیب و مصنف اور طلبہ و اساتذہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 ستمبر 2025

اترپردیش

اردو اور روزگار

امروهه: اترپردیش اردو اکادمی اور شمع ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام امروہہ کے وائی ایم ایس پی جی کالج میں 'اردو اور روزگار' پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ وائی ایم ایس پی جی کالج کی صدر زرینہ خاتون نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سمینار کی صدارت پروفیسر جہانگیر احمد خان نے کی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اے کے سنگھ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اردو زبان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے کونے کونے میں بولی جاتی ہے اور اردو روزگار کے بے شمار مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ ٹیچنگ، انجینئرنگ، ہیلتھ، ایڈمنسٹریشن، جرنلزم جیسے شعبوں میں کیریئر بنایا جاسکتا ہے۔ صدر پروفیسر جہانگیر احمد خان نے کہا کہ اردو میں روزگار کے بہت مواقع ہیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ جذبہ اور علم کی ہے، جسے طلبا میں ابھارنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر زین العابدین، ڈاکٹر زیبا ناز، ڈاکٹر ناہید پروین، ڈاکٹر محمد موسیٰ، محمد احمد دانش اور سوہن سنگھ نے اردو اور روزگار پر بچوں کی رہنمائی کی۔ آخر میں شمع ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کی منیجر شمع اختر نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت مبین احمد نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 ستمبر 2025

اردو زبان اور جدید ٹیکنالوجی

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اردو زبان اور جدید ٹیکنالوجی کے موضوع پر اٹل ہال میں ایک شاندار سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اپنے استقبالیہ خطاب میں پروفیسر فخر عالم صدر شعبہ اردو نے مہمانانِ گرامی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ موضوع عصر حاضر کی سب سے بڑی ضرورت اور وقت کا تقاضا ہے۔ انھوں نے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد اساتذہ، طلبہ اور محققین کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کرنا ہے جہاں وہ اردو اور ٹیکنالوجی کے باہمی تعلق پر کھل کر بحث کرسکیں اور زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نئی راہیں تلاش کرسکیں۔ اس سمینار کی صدارت یونیورسٹی کے معزز وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ شعبہ اردو ایک ایسے موضوع پر سمینار منعقد کررہا ہے جس کی معاصر عہد میں بڑی اہمیت ہے کیونکہ اب کوئی بھی زبان بغیر ٹیکنالوجی کے آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔ مہمانانِ خصوصی پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان میں سائنسی مضامین کے تراجم اور نصابی کتابوں کی تیاری نہ صرف خوش آئند عمل ہے بلکہ نئی نسل کو عالمی سطح کی سائنسی ترقی سے ہم آہنگ کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ان کے مطابق زبانیں اسی وقت زندہ اور فعال رہتی ہیں جب وہ بدلتے ہوئے حالات کو قبول کرتی ہیں اور اپنے اندر جدت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو میں ای بکس، آن لائن لغات، ڈیجیٹل لائبریریوں اور تعلیمی مواد کی تیاری پر کام تیز کیا جانا چاہیے تاکہ یہ زبان تعلیمی اور تحقیقی میدان میں مزید فعال کردار ادا کرسکے۔ اس سمینار میں علیشہ رضوی اور دیگر ریسرچ اسکالرز نے اپنے مقالے پیش کیے اور حسن اکبر ریسرچ اسکالر نے غزل خوانی کی۔ اس سمینار کے انعقاد میں کنوینر ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر نے اہم کردار ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ظفر النقی اور شکریے کے کلمات ڈاکٹر محمد اکمل نے ادا کیے۔ اس سمینار کے آخری مرحلے میں کنوینر ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر نے تمام شرکا اور ان طلبہ کا جنھوں نے اس سمینار کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 ستمبر 2025

جاں نثار اختر کے ادبی کارہائے نمایاں

لکھنؤ: مسلم انٹلکچولس سوسائٹی کے زیراہتمام اترپردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے 'جاں نثار اختر کے ادبی کارہائے نمایاں' کے موضوع پر سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ادبی اور سماجی شخصیات نے جاں نثار اختر کی ادبی خدمات

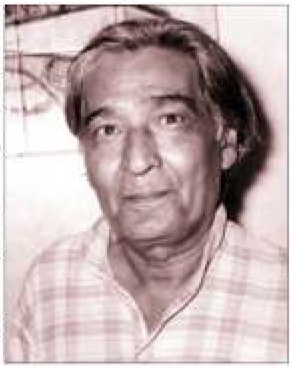

کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ یوپی پریس کلب، حضرت گنج لکھنؤ میں منعقد اس سمینار میں اترپردیش کے سابق کارگزار وزیراعلیٰ ڈاکٹر عمار رضوی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اردو ادب میں جاں نثار اختر کی خدمات گراں قدر اور نمایاں ہیں۔ سمینار میں اپنے افتتاحی کلمات میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے چیئرمین سید اطہر نبی ایڈوکیٹ نے کہا کہ جاں نثار اختر ایک بے مثال شاعر، وفادار دوست، دردمند انسان اور مشہور نغمہ نگار تھے۔ سمینار میں جسٹس بی ڈی نقوی نے جاں نثار اختر کی ادبی اور شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لائبریری انچارج ڈاکٹر مسیح الدین خان نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ

جاں نثار اختر نے اپنی شخصیت کی امتیازی صفات اور شاعری کی انفرادی خصوصیات سے اپنی ایک علیحدہ پہچان بنائی اور اردو شاعری میں ایک خاص مقام حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نئی نسل پر بھی اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ سیمینار میں 'عشق، درد اور سماجی شعور کا ترجمان شاعر: جاں نثار اختر' کے عنوان سے شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر صائمہ انصاری نے مقالہ پیش کیا۔ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر عمار انیس نگرامی نے اس موقعے پر سیمینار کے کامیاب انعقاد کے لیے اتر پردیش اردو اکادمی، بھاشا وبھاگ اتر پردیش کے پرنسپل سکریٹری آلوک کمار اور اتر پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری شوکت علی کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا۔ آخر میں ڈاکٹر محمد ادریس نے تمام مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 ستمبر 2025

جگر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سمپوزیم

مراد آباد: یوم جگر کے موقعے پر مرکز اردو ادب وتحقیق مراد آباد اور جگر فاؤنڈیشن مراد آباد کے زیر اہتمام جگر کے یوم وفات کے موقعے پر ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا

گیا۔ گفتگو کا آغاز مراد آباد کے بزرگ شاعر انور کیفی نے کیا، بعدہ ہندو کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اکرم پرویز نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر گوکل داس گرلس کالج کی سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر فہمیدہ خان کے مصنفہ مونوگراف 'جگر مرادآبادی' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ہندو کالج کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عارف حسن خاں نے جگر کی شاعری کی فنی خصوصیات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جگر کو اپنی زندگی میں ہی جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں بعض ایسی گونا گوں خصوصیات موجود ہیں، جو انھیں غزل کے صف اول کے شعرا میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ انھوں نے جگر کے مجموعے 'آتش گل' کا عروضی ولسانی تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جگر کی مقبولیت ان کے پڑھنے کے انداز اور ترنم کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کی غزلوں کے لسانی مطالعہ سے تھی۔ اہلیانِ مرادآباد کے لیے باعث فخر ہے کہ ایسا شاعر انھیں میسر ہوا جس نے تمام دنیا میں مرادآباد کو ادبی شناخت عطا کی۔ مہمانِ ذی وقار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو اور 'تہذیب الاخلاق' کے سابق مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے جگر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حسرت، فانی، اصغر، لالہ جگت موہن لال رواں، سیماب اکبرآبادی وغیرہ شاعروں کے درمیان جگر کی انفرادیت کو بڑے خوب انداز میں بیان کیا۔ انھوں نے مونوگراف پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فہمیدہ خان نے جگر کی جو من موہنی شبیہ ابھاری ہے، وہ اس بات کی غماز ہے کہ جگر نے اساتذہ کی فکری نہج اور شعری حسن کو اپنے کلام میں اس فنکارانہ ڈھنگ سے ڈھال دیا ہے کہ وہ جدت وندرت کی علامت بن گیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 ستمبر 2025

جموں و کشمیر

'اقبال کا تصورالٰہ'

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر

یونیورسٹی میں آج ایک توسیعی لیکچر بعنوان 'اقبال کا تصورالٰہ' منعقد ہوا۔ اس موقعے پر ممتاز ادیب اور ماہر اقبالیات پروفیسر مفتی مدثر، شعبۂ انگریزی، کشمیر یونیورسٹی نے خطاب کیا۔ اپنے لیکچر میں انھوں نے اقبال کے تصورالٰہ کا گہرا تجزیہ پیش کیا اور واضح کیا کہ اقبال کے نزدیک خدا کا تصور محض ایک مابعد الطبیعی خیال نہیں بلکہ انسانی تخلیقیت، خودی کی بیداری اور حرکت وعمل کے لیے ایک متحرک سرچشمہ ہے۔ انھوں نے اس بات زور دیا کہ اقبال کا تصورالٰہ انسان کو اپنی روحانی صلاحیتوں کو پہچاننے اور الوہی شعور کی روشنی میں دنیا کے ساتھ فعال انداز میں جڑنے کی دعوت دی ہے۔ اس لیکچر میں اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور مقرر کے علمی تجزیے اور اس کی عصری معنویت کو بے حد سراہا۔ لیکچر کی صدارت شاہ ہمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے سابق سربراہ پروفیسر عبدالرشید بٹ نے کی اور اس موقعے پر ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری بطور مہمان خصوصی شریک مجلس رہے۔ شروع میں شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر الطاف انجم نے کہا کہ اس طرح کی علمی مصروفیات فکر اقبال کے بارے میں ہماری سمجھ کو گہرا کرنے اور فکری تحقیقات کے جذبے کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عابد گلزار نے فارسی شاعری کے حوالے سے اقبال کے تصور یزداں پر اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ سیشن کی نظامت ڈاکٹر فیاض احمد وانی نے انجام دی جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد خان نے مقرر کا مختصر تعارف پیش کیا۔ پروگرام کے اختتام پر ادارے کے فیکلٹی ممبر ڈاکٹر وسیم اقبال نحوی نے تحریک شکرانہ پیش کیا اور تقریب کو ایک بامعنی علمی مباحثہ بنانے پر مقررین اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر الطاف انجم، ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، سینٹر فار ڈسٹینس اینڈ آن لائن ایجوکیشن، کشمیر یونیورسٹی، 15 ستمبر 2025

مہاراشٹر

مولانا آزاد کالج میں یک روزہ قومی ریسرچ اسکالر سمینار

اورنگ آباد: شہر کے معروف علمی ادارے مولانا آزاد کالج کے ریسرچ سینٹر شعبہ اردو کی جانب سے

'اردو تحقیق کے جدید موضوعات' کے عنوان سے یک روزہ ریسرچ اسکالرز قومی سمینار کا انعقاد 4 اکتوبر 2025 کو عمل میں آیا۔ جس کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مظہر احمد فاروقی نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر مخدوم فاروقی (پرنسپل ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار وویمن) موجود تھے۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف ممبئی) نے پیش کیا۔ افتتاحی کلمات ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی

(صدر شعبہ اردو) نے ادا کیے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی نے اظہار خیال کیا اور اس سمینار کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور ریسرچ سینٹر شعبہ اردو کے اس اقدام کی ستائش کی۔ صدارتی خطاب میں پرنسپل ڈاکٹر مظہر احمد فاروقی نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز مواد کو کاپی نہ کریں بلکہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں اسے انگیز کر کے اپنے الفاظ میں تحریر کریں اس لیے کہ اردو میں متبادل الفاظ کی کمی نہیں ہے۔ نظامت کے فرائض ریسرچ اسکالر شیخ سکندر نے انجام دیے۔ ڈاکٹر فیاض احمد فاروقی کے اظہار تشکر پر افتتاحی تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ اجلاس اول کی صدارت ڈاکٹر افروزہ خاتون (صدر شعبہ اردو چشتیہ کالج) نے کی۔ مہمانان اعزازی کے طور پر پروفیسر عالیہ کوثر صدر (شعبہ اردو راشٹر ماتا اندرا گاندھی کالج جالنہ) اور ڈاکٹر انصاری مسعود ندوی (صدر شعبہ اردو مسیو دری کالج جالنہ) موجود تھے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض محترمہ نغمہ فردوس نے ادا کیے۔ شیخ راجو شیخ چاند، کوثر فاطمہ، ڈاکٹر عائشہ عبدالعزیز، سید فوزیہ، ڈاکٹر سید وحید الدین غلام حسین نے مقالے پیش کیے، مہر انجم نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔ اجلاس دوم کی صدارت پروفیسر غوث احمد (شولاپور) نے فرمائی۔ اس اجلاس میں عبدالرازق عبدالرزاق، شبانہ بوہرہ، اسماء ثمرین، نغمہ فردوس، نازیہ بیگم، محمد عارف نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ذوہیب یار خان نے کی۔ سیدہ ہما فرحین نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔ اجلاس سوم کی صدارت ڈاکٹر فیاض احمد فاروقی نے کی۔ اس اجلاس میں مہر انجم، شیخ سکندر، شیخ عبدالعظیم، سیدہ ہما فرین، شیخ عمار شیخ علیم الدین، زوہیب یار خان اور شیخ اظہر نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض اسماء ثمرین نے انجام دیے۔ شکریہ کے کلمات صدیقی کوثر جہاں نے ادا کیے۔ اس کے بعد ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی نے فرمائی۔ مشاعرے میں مختلف شعرا نے اپنا کلام سنا کر خوب داد حاصل کی۔ نظامت کے فرائض عزیز محبت نے ادا کیے۔ مبشر انصار کے کلمات تشکر پر مشاعرے کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج آف آرٹس سائنس اینڈ کامرس، ڈاکٹر رفیق زکریہ کیمپس، اورنگ آباد، 5 اکتوبر 2025

بزم خواتین

اورنگ آباد: اردو ادب کی دنیا میں اورنگ آباد ہمیشہ سے تخلیقی فکر اور علمی سرگرمیوں کے لیے زرخیز رہا ہے۔ یہاں کے ادبی حلقے نہ صرف روایت کو زندہ رکھتے ہیں بلکہ نئی جہتوں کی تلاش میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک خوبصورت کاوش وارثانِ حرف وقلم کے تحت قائم 'بزمِ خواتین' کی جانب سے 31 اگست 2025 کو کی گئی، جب عارف کالونی کے پر فضا مقام بلوم ولا میں نسائی محفلِ افسانہ کا کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ اس محفل افسانہ کی صدارت سابق معلمہ محترمہ رفیعہ بلقیس نے فرمائی جب کہ بطور مہمانانِ خصوصی سابق معلمات محترمہ سراج صدیقی، محترمہ سراج متین، نجمہ محی الدین اور محترمہ ماجدہ شریک رہیں۔ پروگرام کا آغاز بزمِ خواتین کی صدر ڈاکٹر رضوانہ شمیم نے استقبالیہ کلمات اور مہمانانِ کا تعارف پیش کیا۔

بعد ازاں بزم کی نائب صدر خواجہ کوثر حیات نے بزم کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے خواتین کو مہیا کیے جانے والے اس پلیٹ فارم کی افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے واضح کیا کہ ''محفلِ افسانہ خواتین کے ادبی سفر کے لیے ایک تخلیقی سنگِ میل ہے جو انھیں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور آنے والی نسلوں کے لیے فکر کا چراغ روشن کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔''

اس محفل میں شہر کی افسانہ نگار خواتین نے اپنی خوبصورت تخلیقات پیش کیں۔ افسانہ گوئی کا آغاز محترمہ خان آفرین فاطمہ نے 'ماضی کے جھروکے' کے افسانہ سے ہوا۔ فریسہ جبین صاحبہ نے افسانہ 'ماسک'، ڈاکٹر فردوس فاطمہ صاحبہ نے افسانہ 'فرسودہ خیال'، ڈاکٹر شہناز زرین صاحبہ نے 'قربانی'، ڈاکٹر رضوانہ شمیم صاحبہ نے افسانہ 'خواب' پیش کیا۔ ان افسانوں میں عورت کی ذات اس کی جدوجہد، قربانی اور سماجی کردار کو مختلف رنگوں میں پیش کیا گیا، جس نے سامعین کو نہ صرف محظوظ کیا بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کیا۔

افسانوں کے خوبصورت سلسلے کے بعد مہمان خصوصی محترمہ سراج صدیقی صاحبہ نے خطاب کرتے ہوئے اردو زبان کے کم ہوتے رجحان پر تشویش ظاہر کی اور بزم خواتین کی خدمات کو خوش آئند بتاتے ہوئے بزم کی کوششیں جاری رکھنے نیز مزید ملازمت پیشہ وگھریلو خواتین کو جوڑنے کی خواہش ظاہر کی۔

صدارتی خطبے میں محترمہ رفیعہ بلقیس صاحبہ نے افسانہ نگار خواتین کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ''خواتین کسی بھی معاشرے کی تعمیر کی اہم کڑی ہیں اور ان کے بغیر ترقی وخوشحالی کا خواب ادھورا رہتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین اپنی خداداد صلاحیتوں کو صرف گھریلو دائرے تک محدود نہ رکھیں بلکہ ادب، تعلیم، فنون اور سماجی خدمات جیسے میدانوں میں بھی بروئے کار لائیں۔ بزمِ خواتین کا یہ پلیٹ فارم نہ صرف خواتین کو اپنی آواز بلند کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہے بلکہ ان کے تخلیقی شعور کو بھی نکھار رہا ہے۔''

پریس ریلیز: خواجہ کوثر، اورنگ آباد، 11 ستمبر 2025

اعزاز و اکرام

ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ

میرٹھ: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور اردو قبیلہ بھیونڈی کی جانب سے منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ فنکشن ہم سب کے لیے قابل فخر پروگرام رہا۔ ان خیالات کا اظہار مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ اور اردو قبیلہ بھیونڈی کے مشترکہ اہتمام میں اردو بسیرا ہال، رئیس ہائی اسکول کیمپس میں منعقد گیارہواں ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں شبلی اور سرسید کے نقش قدم پر چل کر اردو کے فروغ کے لیے کام کرنا ہوگا۔

اس موقعے پر اردو فکشن کے لیے معروف ادیب

اشتیاق سعید ممبئی اور فکشن تنقید کے لیے معروف ناقد رفیق جعفر پونہ کو گیارہویں ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ 2025 سے سرفراز کیا گیا۔ ڈاکٹر ونود کمار ترپاٹھی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اردو زبان کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا اور اس کے تلفظ اور اس کی بقا کے لیے بھی سوچنا ہوگا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ڈاکٹر منظر کاظمی میرے استاد تھے۔ ہم ہر سال یہ ایوارڈ دیتے ہیں۔ پچھلے برس ڈاکٹر پرویز شہریار اور ہمایوں اشرف کو دے چکے ہیں اور اس بار رفیق جعفر اور اشتیاق سعید کو دیے جا رہے ہیں۔ انقلاب ممبئی کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے کہا کہ ہمیشہ لوگ اردو کے گیت گاتے ہیں لیکن اردو کی خدمت سے دور رہتے ہیں۔ ہم سب کو اردو کی بقا اور فروغ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ شکیل رشید نے کہا کہ اردو کسی ایک انسان کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے ہم سب کو اردو سے محبت کا حق ادا کرنا ہوگا تبھی ہم اردو والے کہلائیں گے۔ فیاض احمد فیضی، محمد رفیع انصاری نے بھی منظر کاظمی ایوارڈ کے متعلق اہم گفتگو کی۔

منظر کاظمی ایوارڈ یافتہ رفیق جعفر نے کہا کہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ مجھے شعبۂ اردو اور اردو قبیلہ نے اس ایوارڈ کے لائق سمجھا۔ اشتیاق سعید نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں کبھی کوئی ایوارڈ لینے کے لیے کام نہیں کرتا۔ تقریباً 15 سال سے میں اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں شعبۂ اردو اور اردو قبیلہ دونوں کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اختر کاظمی کی اہلیہ شمع اختر کاظمی کی دو کتابوں کا اجرا بھی مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 ستمبر 2025

قمر رئیس ایوارڈ

نئی دہلی: راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے دیا جانے والا 'قمر رئیس ایوارڈ' معروف فکشن نگار اور نقاد، شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر صغیر افراہیم کو پیش کیا جائے گا۔ راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر فاروق بخشی نے بتایا کہ راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے دیا جانے والا ساتواں 'قمر رئیس ایوارڈ' ہے، جو پچیس ہزار روپے، ایک شال اور ایک یادگار نشان پر مشتمل ہوتا ہے۔ پروفیسر فاروق بخشی نے بتایا کہ یہ ایوارڈ جو قمر رئیس ادبی ایوارڈ کے نام سے اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے ایسے ادبا اور شعرا کو پیش کیا جاتا ہے، جو زبان و ادب کے میدان میں اپنی ترقی پسندانہ فکر اور سائنسی نقطۂ نظر کی بدولت اپنی شناخت رکھتے ہوں۔ اب یہ ساتواں باوقار ایوارڈ بالغ نظر فکشن نگار اور عہد حاضر کے نامور نقاد پروفیسر صغیر افراہیم کو ایک تقریب میں 28 اکتوبر 2025 کو غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں پیش کیا جائے گا۔ پروفیسر فاروق بخشی نے مزید بتایا کہ اسی موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے تعاون سے راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار قمر رئیس شخصیت اور فکر و فن، کا افتتاح بھی عمل میں آئے گا۔ اس سمینار کا کلیدی خطبہ ترقی پسند نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی پیش کریں گے۔ ملک اور دہلی کی دانش گاہوں کے دانشوران اور سمینار میں قمر رئیس شخصیت اور فکر و فن' کے حوالے سے اپنے مقالات پیش کریں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 ستمبر 2025

رسم اجرا

'دستک' کا خصوصی نمبر 'تنقید: مبادیات، اصول اور نظریات'

وارانسی: 20 ستمبر 2025 کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ششماہی ریسرچ جرنل 'دستک' کے خصوصی نمبر 'تنقید: مبادیات، اصول اور نظریات' کی رسم اجرا اور مذاکرے کا اہتمام کیا گیا؛ جس کی صدارت شعبہ کے سربراہ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر رفعت جمال، پروفیسر شاہینہ رضوی، ڈاکٹر مشرف علی، ڈاکٹر احسان حسن، ڈاکٹر قاسم انصاری اور ڈاکٹر افضل مصباحی نے رسالہ کے تازہ شمارے کے مشمولات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ ہر تحریر تنقید کا حکم نہیں رکھتی اور ہر لکھاری کو نقاد قرار نہیں دیا جا سکتا ہے؛ تاہم اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے قلم پکڑ لی، وہ منفرد، معتبر اور قومی و بین الاقوامی سابقے کے ساتھ ادیب یا نقاد کی صف میں شامل ہوگیا۔ اس کی بنیادی وجہ خود ساختہ تخلیق کاروں کی سستی شہرت اور ناموری کی بھوک ہے۔ اس قبیل کے تخلیق کار اپنا خود نقاد گڑھ لیتے ہیں۔ یہ صورتحال بے حد افسوسناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دستک اپنے معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا ہے۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ جامعاتی سطح پر تنقید و تحقیق سے وابستہ ریسرچ اسکالرز، طلبہ و طالبات اور اساتذہ اس خصوصی نمبر سے مستفید ہو سکیں اور رسالوں کی بھیڑ میں دستک اپنی انفرادیت قائم کر سکے۔

پروفیسر رفعت جمال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سرقہ کی جو روش عام ہوتی جا رہی ہے وہ بے حد شرمناک ہے۔ تنقیدی و تحقیقی مقالہ لکھنے والوں کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جب بھی کسی کو کوٹ کریں تو حوالہ ضرور دیں۔ پروفیسر شاہینہ رضوی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دستک کا یہ خصوصی شمارہ طلبہ، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے بہت مفید ہے۔ شعبہ کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے کہا کہ دستک کا یہ خصوصی شمارہ تنقید کے اصول و نظریات کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ریسرچ اسکالرز اگر اس شمارے کا اچھے انداز سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے اندر تنقیدی شعور یقینی طور پر پروان چڑھے گا۔ ڈاکٹر محمد قاسم انصاری، ڈاکٹر احسان حسن اور ڈاکٹر افضل مصباحی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر شعبہ کے تمام ریسرچ اسکالرز اور دیگر شعبوں کے طلبہ اور طالبات نے بھی شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر عبدالسمیع نے کی۔

پریس ریلیز، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، وارانسی، 20 ستمبر 2025

مشاعرہ اور کلیاتِ شائق مظفر پوری کا اجرا

بھیونڈی: بھیونڈی کے قدیم علمی ادبی ادارہ بزم مساوات کے زیر اہتمام بیرون شہر سے تشریف لائے

مہمانوں کے اعزاز میں 24 ستمبر کو ایک شایان شان اعزازی محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا، ساتھ ہی بہار سے تعلق رکھنے والے بزرگ شاعر شائق مظفر پوری کی کلیات کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

جناب محمد فاضل انصاری کی سرپرستی اور جناب شجاع الدین انصاری کی صدارت میں منعقدہ اس محفل مشاعرہ کا دورانیہ 5 گھنٹوں پر مشتمل تھا، مشاعرے میں جناب رونق افروز، شکیل احمد شکیل، عین الدین عازم، تجمل حسین زاہد، حسیب جیراجپوری، شہزاد حسین شہزاد، بلال رونق، صادق جونپوری، شرجیل انصاری، اکبر علی دانش اور صاحب اعزاز رفیق جعفر اور ڈاکٹر افسر کاظمی جیسے مستند شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔ مشاعرہ کی نظامت شکیل احمد شکیل بحسن وخوبی انجام دی۔

مشاعرے کے بعد ڈاکٹر افسر کاظمی کی مرتب کردہ کتاب 'کلیات شائق مظفر پوری' کا اجرا نظیر ہائی اسکول کے روح رواں جناب محفوظ انصاری کے ہاتھوں عمل میں آیا، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ سے تشریف لائے مہمان خاص پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کلیات شائق مظفر پوری کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ ڈاکٹر افسر کاظمی کا تاریخی کارنامہ ہے کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق شہر آہن جمشید پور میں شعرا حضرات کی کثیر تعداد موجود ہے، لیکن آج تک کسی بھی شاعر کی کلیات شائع نہیں ہوئی۔

پریس ریلیز، رحمت علی قاسمی، بھیونڈی، 24 ستمبر 2025

کائنات سخن

نئی دھلی: تسمیہ آڈیٹوریم اوکھلا اور شکھر آرگنائزیشن فار سوشل ڈیولپمنٹ، دہلی کے زیر اہتمام کائنات سخن (کلیات اظہر عنایتی) کتاب کی تقریب رسم اجرا اور ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر

شعیب رضا وارثی (سابق ڈپٹی ڈائریکٹر این آئی او ایس، دہلی) نے کی۔ صدارت تسمیہ فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے کی اور بطور مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول نے شرکت کی۔ صاحب کتاب اظہر عنایتی کے علاوہ ڈاکٹر ساجد بھی مہمان ذی وقار کے بطور اس پروگرام میں موجود تھے۔ کتاب کے مرتب پروفیسر شہزاد انجم بھی مہمان اعزازی کی حیثیت سے موجود رہے۔ کائنات سخن کی رسم اجرا کے بعد اظہر عنایتی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر شفیع ایوب نے کلام اظہر عنایتی کے 5 اہم نکات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور انھیں ایک عہد ساز شاعر قرار دیا۔ پروفیسر کوثر مظہری صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اظہر عنایتی کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غزل کے رنگ میں انقلاب کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے، یہ اظہر عنایتی کے کلام سے سیکھنے کی چیز ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ اظہر عنایتی کی کلیات کو کہیں سے پڑھیے، آپ کو کوئی بھی شعر ایسا نہیں ملے گا، جس کے بارے میں کہہ سکیں کہ بات نہیں بنی۔ دونوں مصرعے اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ آپ ایک لفظ بھی اس میں سے نہیں نکال سکتے۔ کائنات سخن کے مرتب پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ میں اظہر عنایتی کے کلام کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی سے بے حد متاثر ہوں۔ وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے پاسدار شخص ہیں۔ پروفیسر شہپر رسول نے صاحب کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اظہر عنایتی اس عہد کے نہایت معتبر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ رسم اجرا کے آخر میں صاحب کتاب اظہر عنایتی نے ڈاکٹر سید محمد فاروق اور جلسہ کے تمام ذمہ داران کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مشاعرے کا دور شروع کیا جس میں دبئی سے تشریف لائے شاعر آصف سروش، ڈاکٹر جاوید نسیمی (رامپور)، ڈاکٹر شعیب رضا وارثی دہلی، ناصر عزیز ایڈووکیٹ، ڈاکٹر شفیع ایوب، سید شکیل غوث (رامپور)، ڈاکٹر شعائراللہ خاں (رامپور)، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر عدنان ضیائی، وسیم راشد ڈاکٹر الف ناظم اور اظہر عنایتی نے اپنے کلام پیش کیے۔ آخر میں تسمیہ فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے صاحب کتاب اور مرتب کتاب کو مبارکباد پیش کی، نیز سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 ستمبر 2025

وفیات

قاسم خورشید

پٹنہ: معروف افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور شاعر قاسم خورشید کا 30 ستمبر 2025 کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ ہیں۔ ان کی نماز جنازہ 1 اکتوبر 2025 کو دس بجے درگاہ شاہ ارزانی

میں ادا کی گئی، جب کہ شاہ گنج قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ قاسم خورشید کی عمر تقریباً 68 برس تھی۔ قاسم خورشید کی ولادت 2 جولائی 1957 کو جہان آباد کے مردم خیز قصبہ کاکو میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کرنے کے بعد اورینٹل کالج سے آئی اے، پٹنہ کالج سے بی اے جب کہ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ایس سی ای آر ٹی، بہار میں اہم عہدے پر فائز رہے۔ ان کا پہلا افسانہ 1977 میں رسالہ 'زبان وادب' میں 'روک دو' شائع ہوا۔ پوسٹر، کینوس پر چہرے اور ریت پر ٹھہری ہوئی شام، ان کے تین افسانوی مجموعے ہیں۔ ڈرامے کا ایک مجموعہ 'تماشہ' تنقیدی مضمون کا مجموعہ 'متن اور مکالمہ' اور تحقیقی مقالہ 'ادبی منظرنامے پر گئودان' ان کی دیگر مطبوعات ہیں۔

’دل کی کتاب‘ کے عنوان سے انھوں نے اردو میں اپنا شعری مجموعہ بھی شائع کیا۔ بچوں سے متعلق کہانیوں کے مختصر مجموعے بھی شائع ہوئے۔

روزنامہ’انقلاب‘ دہلی، یکم اکتوبر 2025

جیلانی خان علیگ

پٹنہ: روزنامہ (لکھنؤ) کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جیلانی خان علیگ کا 5 ستمبر کی صبح ایک نجی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 51 برس کے تھے۔ وہ گزشتہ دو برسوں

سے گردے کے عارضہ میں مبتلا تھے اور ڈائلیسس پر تھے۔ ذیابیطس سمیت مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کے باوجود جیلانی خان علیگ کا حوصلہ بلند تھا اور پابندی سے اپنے کام انجام دے رہے تھے۔ ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ، ایک بیٹا اور ایک بیٹی کے علاوہ تین بھائی اور ایک بہن ہیں۔ مرحوم جیلانی خان کی نماز جنازہ ان کے آبائی گاؤں اورنگ آباد ضلع کے بن تارا میں ادا کی گئی۔ جیلانی خان کی پیدائش 4 مئی 1974 کو ہوئی تھی۔ انھوں نے اے ایم یو سے معاشیات میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد ماس کمیونی کیشن میں ایم اے کیا اور انگریزی صحافت سے ابتدا کرتے ہوئے پندرہ روزہ ملی گزٹ سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد 2003 میں ’راشٹریہ سہارا‘ کی ہفتہ وار’عالمی سہارا‘ کی اشاعت سے وابستہ ہوگئے۔ جب روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ کی اشاعت حیدرآباد سے شروع ہوئی تو انھیں اس کا انچارج بنا کر بھیجا گیا۔ راشٹریہ سہارا سے علیحدگی کے بعد ایک انگریزی ویب سائٹ کے لیے کام کرنے لگے مگر جیسے ہی 2016 میں انھیں موقع ملا تو لکھنؤ کی انقلاب کی اشاعت میں انھوں نے 23 جولائی کو بطور بیورو چیف شمولیت اختیار کرلی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد انھیں لکھنؤ انقلاب کی تمام اشاعتوں کا ریزیڈنٹ ایڈیٹر بنادیا گیا۔

اہل خانہ کے مطابق وہ 29 اگست کو پٹنہ پہنچے تھے۔ یہاں طبیعت پھر بگڑ گئی جس کے بعد انھیں ایک نجی ہسپتال میں داخل کرایا گیا مگر وہ 5 ستمبر کو انتقال کرگئے۔

روزنامہ’انقلاب‘ دہلی، 6 ستمبر 2025

سنکرشن ٹھاکر

نئی دهلی: مشہور صحافی اور’دی ٹیلی گراف‘ کے

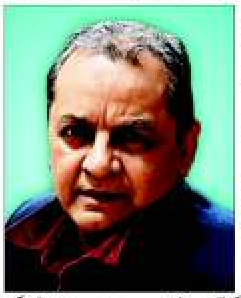

ایڈیٹر سنکرشن ٹھاکر کا 63 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بہار کے وزیراعلیٰ نتیش کمار اور راشٹریہ جنتا دل کے صدر لالو پرساد یادو پر لکھی گئی کتاب ’دی برادرز بہاری‘ کے مصنف آنجہانی ٹھاکر اپنی گہری سیاسی بصیرت اور فکرانگیز تحریروں کے لیے جانے جاتے تھے۔ انھوں نے’دی ٹیلی گراف‘ میں قومی امور کے مدیر کے طور پر کام کیا اور 2023 میں ادارے کے مدیر مقرر کیے گئے۔ انھیں گڑگاؤں کے ایک ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں حال ہی میں ان کی سرجری ہوئی تھی۔ ’دی ٹیلی گراف‘ میں اپنی خدمات کے علاوہ آنجہانی ٹھاکر میڈیا کانفرنسوں اور پرائم ٹائم ٹیلی ویژن شوز میں بھی باقاعدہ پینلسٹ کے طور پر شامل ہوتے تھے۔ اپنی کتاب’دی برادرز بہاری‘ میں انھوں نے نتیش کمار اور لالو پرساد یادو کی زندگی کے توسط سے بہار کی سیاسی حرکیات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ ’بندھو بہاری‘ کے نام سے بھی خاصا مقبول رہا۔ سنکرشن ٹھاکر کی پیدائش 1962 میں پٹنہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے سینٹ زیویر پٹنہ اور سینٹ زیویر دہلی سے بتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندو کالج، دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے 1984 میں ’سنڈے میگزین‘ سے اپنے صحافتی کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ ’انڈین ایکسپریس‘ اور’دی ٹیلی گراف‘ سے بطور ایسوی ایٹ ایڈیٹر وابستہ تھے۔ 2009 میں ٹیلی گراف میں واپسی سے قبل انھوں نے ’تہلکہ ٹائمز‘ میں ایگزیکٹو ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دی تھیں۔

روزنامہ’انقلاب‘ دہلی، 9 ستمبر 2025

شہناز کنول

دیوبند: ممبئی سے شائع ہونے والے اہم اور منفرد اردو جریدے ’گگن‘ کے مدیر شمس کنول کی بیوہ 78 سالہ

شہناز کنول علی گڑھ میں انتقال کرگئیں۔ آل انڈیا ایجوکیشنل موومنٹ کے سکریٹری ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ شہناز کنول مرحومہ قاسمی خانوادہ سے تعلق رکھنے والی مشہور ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ دینی امور اور مذہبی روایات کی پابند نیک نفس خاتون تھیں، گذشتہ دس دنوں سے وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں داخل تھیں جہاں انھیں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔ مرحومہ سے نسبت رکھنے والی سلمیٰ عابد اور ان کے شوہر عابد علی نے ان کی بھرپور نگہداشت کی لیکن وقت موعود آنے کے باعث 14 اکتوبر شام پانچ بجے مرحومہ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ ان کی نماز جنازہ دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی نے ادا کرائی۔ مرحومہ کی نماز جنازہ میں یونیورسٹی سے وابستہ بہت سے افراد نے شرکت کی۔ واضح ہو کہ شہناز کنول خود ایک اچھی اور مشرقی روایات کے افکار کی حامل ادیبہ تھیں، ممبئی کے دور گزشتہ کے صحافتی حلقے کی ایک ممتاز شخصیت مولانا حامد الانصاری غازی (مدیر مدینہ، روزنامہ جمہوریت، ممبئی) اور ہاجرہ نازلی جیسی مشہور فکشن نگار کی دختر نیک اختر شہناز کنول کے چار ناول شائع ہوچکے ہیں، جب کہ ان کی کوئی تیس سے زائد کہانیاں مختلف رسائل و جرائد میں طبع ہوچکی ہیں، محترمہ شہناز کنول کی دو کتابیں سفری روداد پر مشتمل ہیں جن میں سے ایک کا نام ’پیاروں کا پردیس‘ ہے۔ ان کی پیدائش 9 جنوری 1947 کو دیوبند میں ہوئی تھی۔

روزنامہ’ہمارا سماج‘ دہلی، 16 اکتوبر 2025

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ

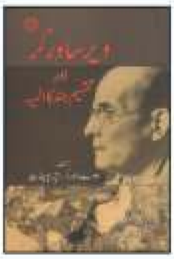

تالیف: اودے ماہورکر، چرایو پنڈت
مترجم: پروفیسر مظہر آصف، ڈاکٹر مسعود عالم
پہلا ایڈیشن: 2025
صفحات: 385+xxxviii
قیمت: 240 روپے

ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی

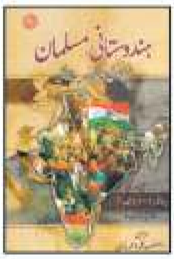

مرتبین: پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر
ڈاکٹر کیشو پٹیل
مترجمین: ڈاکٹر نصیب علی، محمد عارف
پہلا ایڈیشن: 2025
صفحات: 211+xl، قیمت: 150 روپے

کلیاتِ سعادت حسن منٹو (جلد دوم)

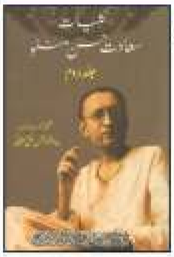

تحقیق، تدوین و ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی
تیسرا ایڈیشن: 2025
صفحات: 576+23
قیمت: 305 روپے

ٹیگور بتیسی (ٹیگور کے بتیس افسانوں کا انتخاب)

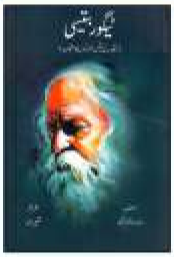

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: شبیر احمد
پہلا ایڈیشن: 2025
صفحات: 510+65
قیمت: 300 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظر نامہ

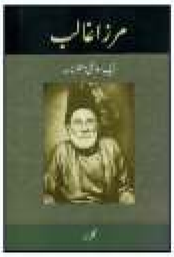

مصنف: گلزار
دوسرا ایڈیشن: 2025
صفحات: 247+23
قیمت: 160 روپے

نقوشِ کلام (سوانح حیات ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام)

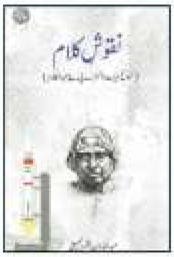

مصنف: عبداللہ ابن القمر الحسینی
پہلا ایڈیشن: 2025
صفحات: 460+20
قیمت: 255 روپے

درد: علامت اور علاج

مصنف: ابو سعدی خالد جاوید
تیسرا ایڈیشن: 2025
صفحات: 200
قیمت: 130 روپے

انسانی دماغ: کمپیوٹر اور تعلیم

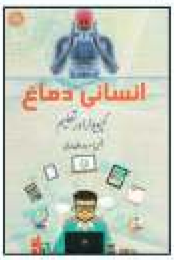

مولف: انس مسرور انصاری
پہلا ایڈیشن: 2025
صفحات: 100
قیمت: 35 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, नवम्बर–2025,वर्ष:27, अंक:11
URDU DUNIYA Monthly, November-2025, Vol.27, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6